تصویرِ ملّت

مولانا وحید الدین خاں

Tasweer-e-Millat
By Maulana Wahiduddin Khan

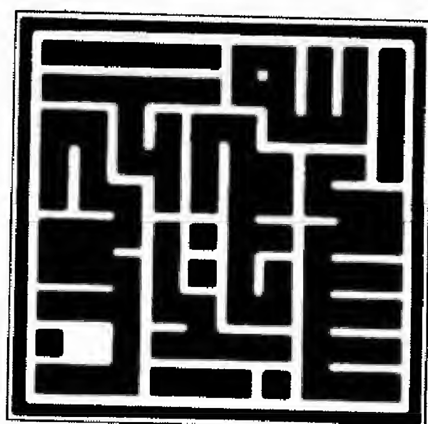
First published 1997

Al-Risala Books
The Islamic Centre
1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi 110 013
Tel. 4611128, 4611131
Fax 91-11-4697333

Distributed in U.K. by
IPCI: Islamic Vision
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 7117, Fax: 0121-773 7771

Distributed in U.S.A. by
Maktaba Al-Risala
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn, New York NY 11230
Tel. 718-2583435

Printed by Nice Printing Press, Delhi



باب دوم :

باب اول :

باب سوم :

کرنے کا کام

مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کے لیے اس وقت جو کام کرنا ہے، اس کو تین عنوانات کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے ——— تزکیہ افراد، احیاء دعوت، اور تعمیر ملت ۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ طول امد کے بعد قساوت پیدا ہو جاتی ہے (الحدید ۱۶) یعنی بعد کی نسلوں میں اسلام زندہ شعور کی سطح پر باقی نہیں رہتا بلکہ بے حسی کی سطح پر پہونچ کر ٹھہر جاتا ہے جس کا دوسرا نام جمود ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ ایمان و اسلام کو دوبارہ ان کے زندہ شعور کا حصہ بنایا جائے۔ ایمان کی بجھی ہوئی راکھ کو دوبارہ بھڑکتا ہوا شعلہ بنا دیا جائے۔ اسی کو تزکیہ کہا گیا ہے ۔

دوسری چیز دعوت ہے جو قرآن کے مطابق (الحج ۷۸) امت مسلمہ کا نصب العین ہے۔ اور جس کے اوپر اس کے عزت و غلبہ کا انحصار ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اس فریضہ کو فراموش کر چکے ہیں۔ آج کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں میں دعوت کا شعور پیدا کیا جائے اور ان کے درمیان دعوت الی اللہ کے کام کو زندہ کیا جائے۔ اس کے بغیر وہ خدا کی مدد کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

تیسری چیز تعمیر ملت ہے جس کو قرآن میں قیام (النساء ۵) اور قوت (الانفال ۶۰) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی مادی اسباب کی فراہمی۔ دنیوی اعتبار سے مسلمانوں کا اس قابل ہونا کہ وہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں خود کفیل اور باعزت زندگی گزار سکیں۔

بدقسمتی سے ہمارے لیڈروں نے مذکورہ تینوں کاموں میں سے کوئی ایک کام بھی نہیں کیا۔ موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین نے بظاہر بہت سی تحریکیں چلائی ہیں اور چلا رہے ہیں۔ مگر یہ تمام تحریکیں قیادت کی تعمیر کرنے والی ہیں نہ کہ ملت کی تعمیر کرنے والی۔ الرسالہ کا مشن اسی خلا کو پُر کرنے کے لیے جاری کیا گیا ہے۔ جن لوگوں کا دل یہ گواہی دے کہ الرسالہ کا مشن ہی موجودہ زمانہ میں صحیح مشن ہے، ان پر فرض کے درجہ میں ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ الرسالہ کو پھیلائیں۔ ایجنسی یا دوسرے طریقوں سے وہ اس کے پیغام کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی کوشش کریں۔

تعمیر کا طریقہ

سینے کی سوئی جو بازار میں بکتی ہے، وہ اچانک نہیں بن جاتی۔ بلکہ بہت سے مرحلوں سے گزر کر تیار ہوتی ہے۔ سوئی کے کارخانہ میں لوہے کے ایک ٹکڑے کو تقریباً ۲۰ مرحلوں سے گزرنا ہوتا ہے، تب وہ سوئی بن کر تیار ہوتی ہے جس کو ایک آدمی سلائی کے کام میں استعمال کرسکے۔ سوئی بنانے والا ابتدائی لوہے کا تار، کچے لوہے سے اسٹیل کا تار بننے تک جن مراحل سے گزرتا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔

یہ ایک سادہ چیز کی مثال ہے۔ اسی پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ دوسری مصنوعات اور پیچیدہ مشینوں کی تیاری میں کتنا زیادہ وقت لگتا ہوگا۔

مادہ کو مطلوبہ قالب میں ڈھالنے سے بہت زیادہ مشکل یہ کام ہے کہ انسان یا کسی انسانی گروہ کو مطلوبہ قالب میں ڈھالا جائے۔ مادہ اپنا ذاتی ارادہ نہیں رکھتا، مگر انسان کے اندر اپنا ذاتی ارادہ موجود ہے۔ اس لیے انسانی زندگی میں اصلاح کا کام بے حد مشکل ہوجاتا ہے۔

مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان لیڈر اس حقیقت سے بالکل ناواقف ہیں۔ وہ اس طرح کام کرتے ہیں گویا ملت کی تعمیر کے معاملہ میں کوئی نتیجہ حاصل کرنے کے لیے کسی لمبے عمل کی ضرورت نہیں۔ یہاں محض نعروں اور تقریروں سے وہ شاندار نتائج حاصل ہوسکتے ہیں جو دوسرے معاملات میں صرف منصوبہ بند عمل ہی کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں۔

پچھلے سو برس کے اندر بے شمار سوئی کے کارخانے بنائے گیے، اور وہ کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ مگر اسی مدت میں رہنماؤں کی دھواں دھار کوششوں کے باوجود ملت کی تعمیر ممکن نہ ہوسکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سوئی کا کارخانہ بنانے کے لیے قدرت کے قانون کی پوری رعایت کی جاتی ہے۔ مگر ملت کا کارخانہ بنانے کے لیے قدرت کے قوانین کی رعایت نہیں کی جاسکی۔ ملت کے معاملہ میں شاید لوگوں کا خیال ہے کہ محض نعرہ اور تقریر کا کرشمہ دکھانے سے نتیجہ برآمد ہوجائے گا۔

ملت کی تعمیر کا کام جلسوں اور مظاہروں سے شروع نہیں کیا جاسکتا۔ ملت کی تعمیر کا کام اصلاً افراد کی تعمیر کا کام ہے۔ اور افراد کی تعمیر کا کام خاموش محنت کے بغیر انجام پانا ممکن نہیں۔ یہی عقل اور تاریخ کا فیصلہ ہے۔

ہزار میل کا سفر

چینی زبان میں ایک مثل ہے کہ "ہزار میل کا سفر ایک قدم سے شروع ہوتا ہے"۔ یعنی کسی شخص کو ہزار میل دور جانا ہو تب بھی پہلے قدم ہی سے اس کے سفر کا آغاز ہوگا۔ ایک ایک قدم چل کر ہی وہ اپنی منزل پر پہونچے گا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ پاؤں اٹھاتے ہی وہ پہلا قدم اپنی آخری منزل پر رکھ دے۔

یہ زندگی کی ایک عام حقیقت ہے۔ اس کا تعلق فرد سے بھی ہے اور قوم سے بھی۔ ایک فرد کا سفر بھی اسی اصول پر عمل کرکے کامیاب ہوتا ہے اور ایک قوم کا سفر بھی۔

اگر آپ ایک لاکھ روپیہ کمانا چاہتے ہیں تب بھی ابتداءً آپ کو ایک ایک روپیہ کی کمائی پر قناعت کرتے ہوئے ایک لاکھ کی کمائی تک پہونچنا ہوگا۔ اگر آپ ماسٹر ڈگری لینا چاہتے ہیں تو ابتدائی درجات میں محنت کرکے ماسٹر ڈگری کے قابل بننا ہوگا۔ اگر آپ مصنف بننا چاہتے ہیں تو مطالعہ اور تحقیق کے لمبے مرحلہ سے گزرنے کے بعد مصنف کے مقام کو پانا ہوگا۔ اگر آپ اپنے لیے ایک اونچا مکان دیکھنا چاہتے ہیں تو بنیاد اور دیوار کی تعمیر کرنے کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ آپ اپنے لیے ایک اونچا مکان کھڑا کر سکیں۔

ٹھیک یہی معاملہ قومی تعمیر کا بھی ہے۔ قومی تعمیر "تاریخ ساز" تقریروں سے نہیں ہوتی، بلکہ تاریخ ساز عمل سے ہوتی ہے۔ ملّت کا مستحکم قلعہ مستحکم پتھروں سے بنتا ہے نہ کہ لفظی خطابت اور شاعرانہ خیال آرائی کا کمال دکھانے سے۔

موجودہ زمانہ میں جو مسلم رہنما اٹھے، ہر ایک نے کسی نہ کسی "مجاہدانہ اقدام" سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ حالانکہ صحیح طریقہ یہ تھا کہ وہ شعور کی اصلاح اور ذہن کی بیداری سے اپنے کام کا آغاز کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ پُرشور ہنگاموں کے باوجود اب تک کوئی نتیجہ خیز کام نہ ہو سکا۔ تعمیرِ ملّت کا کام فکری تعمیر اور ذہنی اصلاح سے شروع ہوتا ہے، اس کو عملی اقدام (بالفاظ دیگر، چھلانگ) سے شروع نہیں کیا جا سکتا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ ان کے رہنماؤں کی یہی مجرمانہ غفلت ہے۔

سمتِ سفر

ایک عربی پرچہ (صوت الامۃ، فروری ۱۹۹۱) میں ایک مضمون پڑھا۔ اس کا عنوان جذباتی طور پر یہ تھا: افیقوا من النوم ایھا المسلمون (اے مسلمانو، نیند سے جاگو) اس کو پڑھ کر مجھے ایک عربی شاعر کی نظم یاد آگئی۔ اس نے طنزیہ انداز میں عربوں کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی نظم کا ایک شعر یہ تھا کہ اے عربو، تم سو جاؤ اور بیدار نہ ہو۔ کیوں کہ سونے والے لوگ ہی کامیاب ہوتے ہیں:

نَامُوا وَلَا تَسْتَيقِظُوا لَا فَازَ اِلَّا النُّوَّمُ

عربوں سے (یا مسلمانوں سے) یہ شکایت میرے نزدیک خلافِ واقعہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں عرب اور دوسرے مسلمان خوب جاگے۔ انھوں نے بڑی بڑی سرگرمیاں دکھائیں۔ البتہ ان سرگرمیوں کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔ نتیجہ کے فقدان کو لوگ عمل کے فقدان پر محمول کرکے ان سے شکایت کر رہے ہیں۔

مثال کے طور پر فلسطین کے مسئلہ کو لیجئے جس کے نام پر خلیج کی جنگ لڑی گئی۔ شیخ حسن البنا نے ۱۹۴۸ میں اس کے لیے بڑے پیمانہ پر جہاد کیا۔ الاخوان المسلمون اپنی تاسیس کے وقت سے لے کر اب تک نہایت بلند بانگ طور پر فلسطین کے مسئلہ پر سرگرم رہے ہیں۔ خود فلسطینی لوگ فلسطین کے اندر اور اس کے باہر پرشور طور پر جاگے ہوئے ہیں۔ اور اسی طرح ساری دنیا کے مسلمان بھی۔ جمال عبدالناصر نے اسی سوال پر ۱۹۶۷ میں اسرائیل اور فرانس اور برطانیہ سے جنگ کی۔ خلیج کی جنگ ۱۹۹۱ بھی فلسطین کے نام پر تھی۔ حتی کہ بہت سے مسلمانوں نے صدام حسین کے روپ میں صلاح الدین ایوبی کو دوبارہ پیدا کرلیا۔ مگر ساری کوششوں کے باوجود نتیجہ بالکل الٹا نکل رہا ہے۔ اس مدت میں اسرائیل کا رقبہ کئی گنا بڑھ گیا اور اس کی طاقت میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔ اور فلسطینیوں کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا جارہا ہے۔

ایسی حالت میں اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ لوگ سو رہے ہیں، انھیں جگایا جائے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ لوگ بے فائدہ سمتوں میں دوڑ رہے ہیں، اور ضرورت ہے کہ ان کو غلط سمت سے موڑ کر صحیح سمت میں سرگرم سفر کیا جائے۔ مسئلہ غلط رُخ پر عمل کرنا ہے نہ کہ سرے سے عمل نہ کرنا۔

عمل کی صحیح سمت وہ ہے جو نتیجہ خیز ہو، جو عمل نتیجہ خیز نہ ہو وہ صحیح عمل بھی نہیں۔ اس دنیا میں نتیجہ صحیح سمت میں عمل کرنے سے ملتا ہے نہ کہ مجرد عمل کرنے سے۔

الٹا سفر

کسان نے ایک دانہ زمین میں ڈالا۔ وہ دانہ مٹی میں مل گیا۔ چند روز بعد ایک سرسبز پودا زمین سے نکلا۔ اس نے خاموش زبان میں اعلان کیا کہ دانہ کا خاتمہ اس کے لیے ایک نئی زندگی کا آغاز تھا۔ اس کا زمین کے نیچے جانا دوبارہ نئی شان کے ساتھ زمین پر نمایاں ہونے کی طرف پہلا قدم تھا۔ یہ خدا کا قانون ہے اور کائنات میں ہر طرف خاموش زبان میں اس قانون الٰہی کا اعلان کیا جارہا ہے۔

کھیت سے فصل لینے کے لیے پہلے اپنے دانہ کو زمین میں دفن کرنا پڑتا ہے۔ دکان سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے پہلے اپنے سرمایہ کو دکان میں لگا دینا پڑتا ہے۔ ایک رہائشی مکان کا مالک بننے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ پہلے اپنی اینٹوں کو بنیاد میں دفن کر دیا جائے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان جس طرح عمل کر رہے ہیں، اس کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ وہ خدا کے اس قانون پر راضی نہیں۔ مسلمان اس قانون الٰہی کو الٹی طرف سے چلانا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کھوئے بغیر پائیں اور دیئے بغیر حاصل کریں۔ مگر مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ ایسا کبھی ہونے والا نہیں۔ مسلمان اپنی اس الٹی جدوجہد میں ایک صدی ضائع کر چکے ہیں۔ اگر وہ مزید ایک ہزار سال تک اپنی یہ الٹی کوشش جاری رکھیں تب بھی انھیں کچھ ملنے والا نہیں۔ جتنے محروم وہ آج ہیں، اتنے ہی محروم وہ ایک ہزار سال بعد بھی رہیں گے۔

یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل المیہ ہے۔ ایک لفظ میں، وہ پانے سے آغاز کرنا چاہتے ہیں، جب کہ اس دنیا میں زندگی کا راز یہ ہے کہ کھونے سے آغاز کیا جائے۔ مسلمانوں کے موجودہ شور وغل کا مطلب صرف یہ ہے کہ انھوں نے اب تک آغاز بھی نہیں کیا۔ اور جو لوگ آغاز نہ کریں، وہ اختتام پر کس طرح پہونچ سکتے ہیں۔

کسی شخص کو پورب کی طرف جانا ہو اور وہ پچھم کی طرف جانے والی ٹرین پر بیٹھ جائے تو اس کو گارڈ اور ڈرائیور کی شکایت نہیں کرنا چاہیے اگر اگلے اسٹیشن پر پہونچ کر اسے معلوم ہو کہ وہ اپنی منزل سے جتنا دور پہلے تھا، اب وہ اس سے بھی زیادہ دور ہو چکا ہے۔ اس کی نارسائی اس کی اپنی بدتدبیری کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی اور کی سازش کا نتیجہ۔

عبرت ناک

عالمی ادارہ صحت کی طرف سے ایک ماہنامہ نکلتا ہے جس کا نام و پتہ یہ ہے:

World Health, WHO, Av. Appia, 1211 Geneva 27, Switzerland

اس ماہنامہ (ورلڈ ہیلتھ) کے شمارہ اکتوبر ۱۹۸۳ میں ایک رپورٹ ان الفاظ میں درج ہے:

Eight years ago, 197 people became ill on a long-distance flight. Ham omelettes had been contaminated by a cook with an infected sore on his hand, and poor temperature control in the kitchen and on board the plane had allowed the organism (Staphylococus aureus) to grow in the food and produce a toxin. The infection sent 144 of the victims to hospital, though all eventually recovered. Nontheless the airline catering manager took the balme for the incident and committed suicide.

آٹھ سال پہلے کا واقعہ ہے، ۱۹۷ مسافر ایک ہوائی جہاز کے لمبے سفر میں بیمار پڑ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو سفر کے دوران جو آملیٹ کھانے کے لئے دیا گیا وہ باورچی کے ہاتھ میں ایک زخم کی وجہ سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جہاز میں جب اس کو رکھا گیا تو ٹمپریچر کنٹرول کا اچھا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے اس آملیٹ میں بیکٹیریا آ گئے اور وہ زہریلا بن گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاز کے ۱۴۴ مسافروں کو اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ یہ تمام مریض اگرچہ بعد کو اچھے ہو گئے۔ مگر مذکورہ ایرلائن کے غذائی منیجر نے خودکشی کرلی (صفحہ ۷)

منیجر کی غلطی یہ تھی کہ اس نے اپنے مسافروں کو ناقص خوراک فراہم کی جس کی وجہ سے اس کو کھانے والے بیمار پڑ گئے۔ کمپنی کے منیجر کو اس غلطی کا اتنا زیادہ احساس ہوا کہ اس نے اپنے آپ کو ہلاک کرلیا۔ یہی غلطی اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین نے کی ہے۔ انھوں نے اپنے پیروؤں کو غلط رہنمائی دی۔ انھوں نے بے شمار مسلمانوں کو ایسی سمتوں میں دوڑا دیا جس کا مسافر کسی منزل تک پہنچنے والا نہ تھا۔ مگر غلطی واضح ہونے کے بعد بھی ان میں سے کوئی نہ تھا جو "خودکشی" کرلے۔ جو قیادت کے میدان سے واپسی پر راضی ہو جائے۔

ہمارے قائدین کی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ اپنی جھوٹی اچھل کود کو اسلامی پروگرام کہہ سکتے ہیں۔ وہ اپنے بے فائدہ اقدام کو جہاد کا نام دے سکتے ہیں۔ ان کی غیر دانش مندانہ پالیسی سے لوگ برباد ہوں تو اس کو وہ قربانی کا شاندار عنوان دے سکتے ہیں۔ بے معنی ٹکراؤ کی سیاست اختیار کرنے سے لوگ مارے جائیں تو اس کے لئے انھیں شہادت کا خوش نما ٹائٹل مل جاتا ہے ــــــ وہ لوگ جو اس قابل بھی نہیں کہ کسی ہوائی کمپنی میں خوراک کے منیجر بن سکیں وہ قوم کے پیچیدہ تر معاملات کے ذمہ دار بنے ہوئے ہیں۔

حقیقی عمل

میکسم گورکی (Maksim Gorky) ایک روسی ادیب ہے۔ وہ ۱۸۶۸ میں پیدا ہوا، اور ۱۹۳۶ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے ایک جگہ بتایا ہے کہ محنت ہی کلچر کی بنیاد ہے۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتا ہے کہ ــــــ اگر ہر آدمی اپنی تھوڑی سی زمین میں پوری محنت کرے تو ہماری دنیا کتنی حسین ہو جائے۔

یہ بات صد فی صد درست ہے۔ ہر آدمی کے قریب اپنے عمل کا ایک ممکن دائرہ ہوتا ہے۔ اس کے اختیار میں ہوتا ہے کہ یہاں وہ اپنی پوری محنت صرف کرے اور اس کو آخری نتیجہ تک پہنچائے۔ اگر ہر آدمی اپنے اس ممکن دائرہ میں محنت کرنے لگے تو بیک وقت ساری دنیا میں بہت سے نتیجہ خیز عمل شروع ہو جائیں گے۔ اور جب یہ تمام عمل اپنے انجام کو پہنچیں گے تو تعمیر و ترقی کی ایک پوری دنیا ہر طرف کھڑی ہوئی نظر آئے گی۔

مگر انسان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی "تھوڑی زمین" پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ دوسروں کی "بڑی زمین" کو اپنا نشانہ بناتا ہے۔ وہ خود اپنی عملی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے بجائے یہ کرتا ہے کہ دوسروں کے خلاف جھنڈا لے کر کھڑا ہوتا ہے کہ وہ اپنی عملی ذمہ داریوں کو ادا کریں۔

اس قسم کا عمل انسانیت کو بربادیوں کے سوا کہیں اور پہنچانے والا نہیں۔ جس سماج میں لوگ ایسا کریں وہاں لوگوں کے الفاظ سے تو ساری فضا گونج رہی ہوگی۔ مگر عمل کا سارا میدان صحرا کی طرح بے فصل پڑا رہے گا۔

ایک ایک کے مجموعہ ہی کا نام بڑی گنتی ہے۔ اجزا رکے جمع ہونے سے ہی ایک کل بنتا ہے۔ اس لیے اشخاص کا انفرادی طور پر عمل کرنا، نتیجہ کے اعتبار سے، سب کا عمل کرنا ہے۔ انفرادی سرگرمی، اپنے انجام کے لحاظ سے اجتماعی سرگرمی ہے۔

جزر پر عمل کی بات کرنا پروگرام ہے، کُل پر عمل کی بات کرنا صرف نعرہ ہے۔ کیوں کہ جزر اپنے قبضہ میں ہوتا ہے۔ جزر پر محنت کرنا ہر شخص کے لیے ہمیشہ ممکن ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کُل وہ چیز ہے جو کسی آدمی کے قبضہ میں نہیں۔ کل پر محنت کرنا عملی طور پر ممکن نہیں۔ پروگرام وہ ہے جو ممکن ہو۔ جو ممکن نہیں وہ پروگرام بھی نہیں۔

عمل کے نام پر بے عملی

کسی مفکر کا قول ہے کہ اپنا سفر اتنے پیچھے سے شروع کرو کہ ہر قدم اٹھانا آگے بڑھنا ہو۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے اس قول کو اس طرح بدل دیا ہے —— اپنے سفر کو اتنا آگے سے شروع کرو کہ ہر قدم اٹھانا پیچھے ہٹنا ہو۔

موجودہ زمانہ میں جو بڑے بڑے مسلم رہنما اٹھے ان کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اتنے زیادہ لوگوں نے ان کا ساتھ دیا جتنا زیادہ ساتھ دینے والے تاریخ کے کسی دور میں کسی رہنما کو نہیں ملے، حتیٰ کہ پیغمبروں میں سے کسی پیغمبر کو بھی نہیں۔ مگر ان کی بڑی بڑی تحریکیں عملی نتیجہ کے اعتبار سے قوم کو کچھ نہ دے سکیں۔ بلکہ اکثر اوقات قوم کی بربادی میں اضافہ کا باعث ہوئیں۔

اس صورت حال کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ استعداد سے زیادہ بڑا اقدام کرنا، پیچھے سے چلنے کے بجائے آگے سے چلنے کی کوشش کرنا۔ اگر آپ آغاز سے سفر شروع کریں تو کسی نہ کسی دن آپ اختتام پر پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ اختتام سے اپنا سفر شروع کرنا چاہیں تو آپ کبھی منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔

ہمارے رہنما ایسے عظیم الشان اجتماعات کرنے میں مشغول ہیں جہاں سے لوگ صرف بددلی لے کر لوٹیں وہ ایسے اقدامات کر رہے ہیں جس کا آخری نتیجہ صرف پسپائی کی صورت میں نکلتا ہو۔ وہ ایسی اسلامی حکومتیں قائم کرتے ہیں جس کو دیکھ کر لوگ کہیں کہ اس سے زیادہ اچھی تو غیر اسلامی حکومت تھی۔ وہ ایسی اتحادی تنظیمیں بناتے ہیں جس کے بطن سے صرف اختلاف و انتشار برآمد ہو۔ وہ ایسی تاریخ ساز کانفرنسیں کرتے ہیں جو صرف تاریخ میں ایک الم ناک باب کا اضافہ کرنے کا باعث ہوں۔ وہ ایسی شان دار قیادتیں کھڑی کرتے ہیں جو صرف ایک بے شان و شوکت قوم کے کھنڈر پر وجود میں آئی ہو۔

یہ ایک بہت بڑی برائی ہے جو ہماری جدید تاریخ میں داخل ہو گئی ہے۔ ہر آدمی ایسا کام کرنا چاہتا ہے جو شان دار الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہو۔ جو اخباروں کے پہلے صفحہ کی خبر بن سکتا ہو، جس کے نتیجہ میں وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نظروں میں آجائے۔ جو اس کو ایسے مقام پر پہنچا دے جہاں لغت کے تمام بڑے بڑے الفاظ اس کی عظمت کو بیان کرنے کے لئے ناکافی معلوم ہونے لگیں۔

یہ سب عمل کے نام پر بے عملی ہے، اور بے عملی سے کبھی کوئی حقیقی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ عملی نتیجہ کسی واقعی عمل سے برآمد ہوتا ہے نہ کہ عمل کے نام پر بے معنی اچھل کود سے۔

دریا کے بغیر پُل

سابق روسی وزیر اعظم نکیتا خروشچیف نے کہا تھا : سیاست داں ہر جگہ ایک ہی قسم کے ہیں۔ وہ ایک پُل بنانے کا وعدہ کرتے ہیں، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ وہاں سرے سے کوئی دریا موجود نہ ہو۔

Politicians are the same all over. They promise to build a bridge even where there is no river.

دنیا دار لیڈروں کی یہ سیاست خود مسلم لیڈروں میں بھی پوری طرح آ گئی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دنیا دار لیڈر اپنے عوام کی پسندیدہ زبان بولتے ہیں اور مسلم لیڈر مسلمانوں کی نفسیات کے اعتبار سے اپنے لیے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں۔ ایک دنیا دار لیڈر اگر کہے گا کہ "جنتا راج لاؤ" تو مسلم لیڈر کا نعرہ ہوگا "قرآنی حکومت قائم کرو"۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں کیوں کہ دونوں جگہ صرف نعرے ہیں۔ جنتا راج ہو یا قرآنی راج، دونوں ہی کے لیے سب سے پہلے ضروری ہے کہ سماج میں اس کے موافق زمین تیار کی جائے۔ مگر دونوں ہی زمین تیار کیے بغیر لاؤڈ اسپیکر پر الفاظ کا طوفان برپا کر رہے ہیں۔ "پُل" کی باتیں ہو رہی ہیں جب کہ "دریا" کا ابھی کوئی وجود ہی نہیں۔

مسلم ملکوں میں عوام کی اخلاقی حالت یہ ہے کہ پاکستان اور ایران میں شہوانی فلموں پر پابندی لگائی گئی تو لوگوں نے کیسٹ کے ذریعہ وی سی آر پر فلموں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اور رہنماؤں کا حال یہ ہے کہ اپنے ملک کے "ظالموں" کو مٹانے کے لیے تمام مسلم لیڈر ایک محاذ پر متحد ہو جاتے ہیں۔ مگر ظالم کے ہٹنے کے بعد ہی ان کا "بے نظیر اتحاد" ٹوٹ جاتا ہے اور وہ اقتدار کے لیے خود آپس میں لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ جس معاشرہ میں عوام و خواص کا یہ حال ہو وہاں جلسے اور جلوس کی سیاست سے اسلامی نظام کس طرح قائم ہو جائے گا۔

کام کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پہلے بنیاد تعمیر کی جائے۔ قوم کو باشعور بنایا جائے۔ اس کے اندر کردار پیدا کیا جائے۔ اس کے مختلف طبقوں کو متحد کیا جائے۔ وہ ذرائع فراہم کیے جائیں جو موجودہ زمانہ میں کوئی موثر کام کرنے کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ مگر ہمارے لیڈر اس قسم کا بنیادی کام نہیں کرتے۔ وہ اوّل دن سے بڑے بڑے اقدام کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ یہ صرف لیڈری کی تعمیر ہے نہ کہ ملّت کی تعمیر۔

پٹرول کے بغیر

ہمارے پڑوس میں ایک صاحب نے نیا اسکوٹر خریدا۔ یہ "بجاج سپر" تھا جو بہت اچھا اسکوٹر سمجھا جاتا ہے۔ دس سال تک لائن میں رہنے کے بعد یہ قیمتی اسکوٹر انھیں ملا تھا۔

۳۰ اپریل ۱۹۸۳ کی صبح کا واقعہ ہے۔ میں نے دیکھا کہ مذکورہ پڑوسی اپنے اسکوٹر کے پاس کھڑے ہوئے ہیں اور بار بار پاؤں مار کر اس کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر وہ اسٹارٹ نہیں ہو رہا ہے۔ اسی حال میں کافی دیر ہو گئی۔ یہ بات مجھ کو بڑے اچنبھے کی معلوم ہوئی کہ ایک نیا اور عمدہ اسکوٹر اسٹارٹ نہ ہو۔

اتنے میں ان کا ایک دوست وہاں آگیا۔ وہ اس طرح کے معاملات سے کافی واقفیت رکھتا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ اسکوٹر اسٹارٹ نہیں ہو رہا ہے تو اس نے آگے بڑھ کر اس کا پٹرول چیک کیا۔ اس نے کہا: "گاڑی میں پٹرول تو ہے نہیں، پھر وہ اسٹارٹ کیسے ہو۔" اس کے بعد وہ دونوں رزرو پٹرول استعمال کر کے اسکوٹر کو پٹرول پمپ تک لے گئے۔ پٹرول بھرنے کے بعد مذکورہ اسکوٹر سڑک پر اسی طرح دوڑنے لگا جس طرح ایک اچھے اسکوٹر کو دوڑنا چاہیے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا معاملہ بھی وہی ہوا ہے جو مذکورہ اسکوٹر کے ساتھ پیش آیا۔ موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلم رہنما ہیں جو ملت کے احیاء کے لیے اٹھے۔ کسی نے تبلیغی ادارہ قائم کیا، کسی نے حزب اللہ بنائی۔ کسی نے مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کا نعرہ دیا، کسی نے ملی تعمیر کا منصوبہ بنایا۔ مگر مسلم قوم ان آوازوں پر متحرک نہیں ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے تعمیری نقشہ کو چھوڑ دیا اور جذباتی سیاست کی رو میں داخل ہو گئے۔

مسلم رہنماؤں کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے "پٹرول" کے بغیر "گاڑی" کو چلانا چاہا۔ انھوں نے تعمیر شعور کا کام کیے بغیر عملی اقدام سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی ٹھوس تعمیر کا کوئی کام نہ کر سکے۔ اگر وہ ایسا کرتے کہ پہلے خاموش فکری جدوجہد کے ذریعہ لوگوں کا ذہن بناتے، اس کے بعد عملی اقدام کرتے تو یقیناً انھیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوتی۔ ملت کی گاڑی بھی اسی طرح چل پڑتی جس طرح مذکورہ شخص کی گاڑی پٹرول بھرنے کے بعد چل پڑی۔

اپنی طرف مارچ

۱۹۴۵ سے پہلے جاپانی ایک لڑاکا قوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں انھوں نے وحشیانہ بہادری کی حد تک اپنے جنگی جنون کا ثبوت دیا۔ مگر ۶ اگست ۱۹۴۵ کو جب ایٹم بم نے ان کے دو صنعتی شہروں کو تباہ و برباد کر دیا تو اس کے بعد جاپان میں ایک نیا ذہن ابھرا جس کو انھوں نے عمل معکوس (Reverse course) کا نام دیا۔ یعنی جنگ کے طریقہ کو چھوڑ کر امن کے طریقہ سے اپنی زندگی کی تعمیر کرنا۔ عمل معکوس کی یہ تدبیر نہایت کامیاب رہی۔ جاپان جنگ کے ذریعہ جو کچھ حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اس کو اس نے امن کے ذریعہ زیادہ شاندار طور پر حاصل کر لیا۔

یہ عمل معکوس (ریورس کورس) اپنی تدبیری نوعیت کے اعتبار سے عین وہی چیز ہے جو اسلام کی تاریخ میں " صلح حدیبیہ " کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ حکمت مومن کا گم شدہ مال ہے۔ جہاں وہ اس کو پائے تو وہی سب سے زیادہ اس کا حقدار ہے (الحکمة ضالة المومن فاین وجدها فهو احق بها) اس اعتبار سے یہ جاپانی حکمت عین اسلامی حکمت ہے۔ اور اہل اسلام سب سے زیادہ یہ حق رکھتے ہیں کہ وہ اس کو اپنی تعمیر نو کے لیے استعمال کریں۔

مسلمان سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے دوسروں کی طرف مارچ کا تجربہ کر رہے ہیں ——— مرہٹوں اور سکھوں کی طرف مارچ، انگریزوں کی طرف مارچ، ہندوؤں کی طرف مارچ، حکمرانوں کی طرف مارچ، نئی دہلی اور اجودھیا کی طرف مارچ۔ دوسروں کی طرف مارچ کی اس سیاست میں مسلمانوں نے کھویا تو بہت ہے، مگر پایا کچھ نہیں ہے۔ اب میں مسلمانوں کے سامنے یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ وہ " ریورس کورس " کے اصول پر عمل کریں۔ وہ دوسروں کی طرف مارچ کے طریقہ کو چھوڑ دیں اور اپنی طرف مارچ کے طریقہ کو اختیار کر لیں۔ دوسروں کی طرف مارچ میں انھوں نے اگر دو سو سال ضائع کیے ہیں، تو اپنی طرف مارچ میں صرف دو سال لگا دیں، اور اس کے بعد دیکھیں کہ کون سا طریقہ زیادہ مفید ہے۔ دوسروں کی طرف مارچ کا یا اپنی طرف مارچ کا۔

دوسروں کی طرف مارچ میں مسلمانوں کا قافلہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا۔ مگر اپنی طرف مارچ میں ہر قدم اگلا قدم ہے، اس میں ناکامی کا کوئی سوال نہیں۔

بدتر از گناہ

ٹائمس آف انڈیا (۱۵ ستمبر ۱۹۸۷) میں راقم الحروف کا ایک مضمون چھپا تھا۔ ایک بزرگ نے اس کو غلط شکل میں پیش کر کے مجھ کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔ ان صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے انھیں تنبیہ کی۔ میں نے کہا کہ اگر بات کو غلط شکل میں پیش کر کے مطعون کرنا درست ہو تو اس طرح آپ کسی بھی شخص کو مطعون کر سکتے ہیں، خواہ وہ کتنا ہی زیادہ صحیح کیوں نہ ہو۔

میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے ۱۳۲۲ھ میں ایک فتویٰ مرتب کیا۔ اس میں چار دیوبندی علماء (مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا خلیل احمد سہارن پوری، مولانا اشرف علی تھانوی) کو کافر قرار دیا گیا تھا۔ تکفیر کا یہ فتویٰ بظاہر اتنا قطعی تھا کہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی جب حجاز گیے اور مکہ اور مدینہ کے عرب علماء کو اسے دکھایا تو حرمین کے علماء نے بھی اس کو صحیح سمجھ کر اس کی تصدیق کر دی۔ اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے ہندستان واپس آکر اس کو "حسام الحرمین" کے نام سے شائع کر دیا۔ مگر تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ فتویٰ صحیح نہ تھا۔ کیونکہ اس میں مذکورہ علماء دیوبند کی عبارتوں کو غلط شکل میں پیش کیا گیا تھا۔

میری یہ بات سن کر مذکورہ بزرگ نے کہا کہ میں نے وہ بات اپنی طرف سے نہیں کہی تھی۔ فلاں صاحب نے آپ کے خلاف ایک مراسلہ چھپوایا تھا، اسی کو میں نے دہرا دیا۔ میں نے کہا کہ آپ کی اس توجیہ سے آپ کا جرم کم نہیں ہوتا۔ کیوں کہ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ جو بات سنے اس کو بیان کرنے لگے (کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع) اگر آپ خود سے ایسی بات کہیں تو آپ مسخ حقیقت (Distortion of facts) کے مجرم ہیں اور اگر آپ اخباری خط کو پڑھ کر بلا تحقیق اس کو دہرائیں تو حدیث کے مطابق کذب بیانی کے مجرم۔ غلطی کو چھپانے کے لیے جھوٹی توجیہ کا سہارا لینا عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہے۔

تضاد

یہ اکسپریس ٹرین کا فرسٹ کلاس تھا۔ ایک مرد عورت اپنے بچہ کے ساتھ کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے وہاں پہلے سے ایک آدمی تھا جو سگریٹ پی رہا تھا۔ مرد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انگریزی میں کہا :

I think smoking is not allowed inside the compartment

(میرا خیال ہے کہ کمپارٹمنٹ کے اندر سگریٹ پینے کی اجازت نہیں) اس کے بعد میاں بیوی دونوں ایک طرف بیٹھ گئے اور پھر نہایت اطمینان کے ساتھ بچہ سے مل کر زور زور سے باتیں کرنے اور قہقہہ لگانے میں مشغول ہو گئے۔ ان کے نزدیک کمپارٹمنٹ کے اندر "دھواں" کرنا ناجائز تھا مگر اسی کمپارٹمنٹ کے اندر "شور" کرنا ان کے نزدیک عین درست تھا۔

یہی آج کل تمام انسانوں کا حال ہے۔ ایک آدمی اتفاق سے جس چیز کا عادی نہیں ہے یا جو چیز اتفاق سے اس کی عادت میں شامل نہیں ہوئی ہے اس کا برا ہونا اس کو معلوم ہے۔ وہ کسی شخص کو اس میں مشغول دیکھتا ہے تو بہت زور و شور کے ساتھ اس کے غلط ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ مگر اسی درجہ کی دوسری برائی جس میں وہ آدمی خود مبتلا ہے وہ اس کو نظر نہیں آتی، حتیٰ کہ اس کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ غلط ہے۔ وہ دوسرے کی برائی کا خوب ذکر کرتا ہے مگر وہ اپنی برائی کے بارہ میں خاموش رہتا ہے۔

برائی کی ایک قسم اور ہے جو اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ اور وہ ہے ——— خودرا فضیحت دیگراں را نصیحت۔ یعنی دوسروں کو برا کہنا اور خود اُسی برائی میں مبتلا ہونا۔ ایک آدمی دوسرے کو دورُخا (Double standard) ہونے کا الزام دے گا حالاں کہ وہ خود دورُخا ہوگا۔ ایک آدمی دوسرے کی اقربا نوازی کے خلاف جھنڈا اٹھائے گا حالاں کہ اپنے دائرہ میں وہ خود اقربا نوازی کر رہا ہوگا۔ ایک آدمی دوسرے کو اتحاد دشمن بتائے گا حالاں کہ وہ خود اتحاد دشمنی کے عمل میں مبتلا ہوگا۔ ایک آدمی دوسرے کی مصلحت پرستی کا انکشاف کرے گا حالاں کہ وہ اپنے مفاد کے معاملہ میں خود بھی مصلحت پرست بنا ہوا ہوگا۔

لوگ تضاد میں جی رہے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ یہ خدا کی دنیا ہے۔ اور خدا کی بے تضاد دنیا میں تضاد کا رویہ اتنا بڑا جرم ہے جس کی کوئی معافی نہیں۔

زوال کی علامت

پاکستان کے بزرگ صحافی "م ش" اپنی یادداشتیں شائع کر رہے ہیں۔ اس کی ایک قسط نوائے وقت (۳۱ جنوری ۱۹۹۲) میں چھپی ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں :

"میرا تجربہ یہ ہے کہ ہندو اپنے لوگوں کو خواہ وہ مٹی کے بت ہی کیوں نہ ہوں اپنا دیوتا بنا لیتے ہیں۔ ہندو اخبارات (قبل از تقسیم زمانہ میں) کسی کو مہاتما، کسی کو بھارت پرش، کسی کو دیوتا سروپ کے القاب سے یاد کیا کرتے تھے۔ لیکن مسلم اخبارات ان سے اختلاف رائے رکھنے والے کو ٹوڈی یا جھولی چک کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ پنڈت مالویہ کانگرس کے مخالف تھے۔ لیکن کسی ہندو اخبار نے انھیں غدار نہیں کہا تھا۔ بلکہ انھیں پوجیہ پاد کے خطاب سے یاد کیا جاتا تھا۔ ہمارے مذہبی طبقوں میں جس طرح تکفیر کا رواج ہے اسی طرح سیاسی دنیا میں اختلاف رائے کو غداری سے محمول کیا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے مقابلہ مسلمانوں میں انفرادی حیثیت میں بے حد قد آور شخصیات تھیں لیکن مسلمان حریفوں نے ہمیشہ ان کا چراغ بجھانے کی کوششیں روا رکھیں۔ سر سید احمد خاں پر کفر کے فتوے لگے۔ سر میاں محمد شفیع کو ہمیشہ ٹوڈی کہا گیا۔ اقبال کے متعلق کہا گیا کہ : سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال۔

قائد اعظم کو کافر اعظم کہہ کر یاد کیا گیا۔ عبد الغفار خاں کو عبد الکفار خاں کے نام سے یاد کیا گیا۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی کو گالیوں سے نوازا گیا۔ (صفحہ ۸)

یہی انداز آج بھی جاری ہے۔ موجودہ دور پریس کی پوری تاریخ بتاتی ہے کہ مسلم علما اور دانشور حقیقی تنقید سے واقف ہی نہیں۔ وہ تنقید کے نام سے صرف تنقیص کو جانتے ہیں۔ مسٹر اور مولوی، مقدس اور غیر مقدس، بے ریش اور باریش، اصاغر اور اکابر سب کا یہ حال ہے کہ جہاں کسی سے اختلاف ہوا فوراً اس کے خلاف وہ سب دشنام کی زبان بولنے لگیں گے۔ مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے طبقہ پر یہ انداز اتنا زیادہ چھا چکا ہے کہ اب ان کی بظاہر علمی تنقید بھی حقیقتہً سب دشتم ہی کی ایک بدلی ہوئی صورت ہوتی ہے۔

کسی قوم میں یہ مزاج اس کے زوال یافتہ ہونے کی آخری علامت ہے۔ زوال یافتہ قوم کی خاص پہچان یہ ہے کہ اس کے پاس اظہار خیال کی صرف دو زبان رہ جاتی ہے۔ یا قصیدہ خوانی یا الزام تراشی۔

منفی عمل

ایک مغربی مصنف نے کہا کہ ہر بار جب میں حقیقت کے لیے اپنا دروازہ بند کرتا ہوں تو وہ کھڑکی کے راستے سے میرے گھر کے اندر داخل ہوجاتی ہے:

Every time I close the door on reality,
it comes in through the window.
— Ashleigh Brilliant

یہ بہت بامعنی قول ہے۔ حقیقت کی مثال سیلاب کی سی ہوتی ہے۔ اگر کوئی بند ٹوٹ جائے اور سیلاب کا دھارا آپ کے گھر کی طرف رخ کرے تو آپ اپنا دروازہ بند کرکے اس سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اگر آپ نے سامنے کا دروازہ بند کیا تو وہ پیچھے کے دروازہ سے آپ کے گھر کے اندر داخل ہوجائے گا، حتی کہ اگر آپ اپنے تمام دروازے اور تمام کھڑکیاں بند کرلیں تو وہ دیوار کو توڑ کر آپ کے گھر میں گھس پڑے گا۔ اس قسم کی کوئی تدبیر سیلاب کو روکنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان مکمل طور پر اس کے مصداق ثابت ہوئے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں حقائق کا ایک نیا طوفان اٹھا۔ اس نے مسلمانوں کے ملی وجود کو ہر طرف سے چیلنج کرنا شروع کیا۔ مگر مسلمانوں نے اپنے "دروازوں" اور "کھڑکیوں" کو بند کرکے سمجھا کہ وہ طوفان کی زد سے محفوظ ہوگیے ہیں۔ انھوں نے غیر جانب دارانہ طور پر مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ یہ سوچ کر مطمئن ہوگیے کہ "ہم نے" تو بحر ظلمات میں اپنے گھوڑے دوڑا دیئے ہیں اور آندھیوں سے کہہ دیا ہے کہ تم اپنا راستہ دوسری طرف تلاش کرلو۔ پھر یہ طوفان ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ مگر یہ خوش فہمیاں ہمارے کچھ کام نہ آئیں۔ سیلاب اس طرح ہمارے ٹھکانوں میں گھسا کہ وہ آخری متاع تک بہالے گیا۔

مسلمانوں کے لیے تعمیر نو کا آغاز یہ ہے کہ وہ کھلے دل سے اپنے پچھڑے پن کا اعتراف کریں، جب تک وہ اس کا اعتراف نہ کریں وہ اپنی منزل کی طرف کوئی حقیقی سفر شروع نہیں کرسکتے۔

تنظیم کے بغیر

سینٹ برنارڈ صلیبی دور کا مسیحی پادری ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنھوں نے صلیبی جنگوں کے زمانہ میں یورپ کی مسیحی سلطنتوں کو مقدس جہاد کے لیے ابھارا۔ مگر دو سو سال کی لمبی کوشش کے باوجود مسیحی اقوام کو مسلمانوں کے مقابلہ میں مکمل شکست ہوئی۔

برٹرینڈ رسل نے اس سلسلہ میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگرچہ سینٹ برنارڈ نے صلیبی جنگ کی تبلیغ کی۔ مگر بظاہر وہ اس حقیقت کو نہیں جانتا تھا کہ جنگ لازمی طور پر تنظیم چاہتی ہے۔ جنگ صرف مذہبی جوش کے تحت نہیں لڑی جا سکتی :

> Although he preached the Crusade, he did not seem to understand that a war requires organisation, and cannot be conducted by religious enthusiasm alone.
>
> *A History of Western Philosophy,* p. 431

یہ بات جو برٹرینڈ رسل نے صلیبی دور کے مسیحیوں کے بارہ میں لکھی ہے۔ یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے بارہ میں بھی عین درست ہے۔ یہاں مسلمانوں کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ الفاظ صادق آرہے ہیں کہ تم پچھلی امتوں کے اسوہ پر چلوگے۔ حتی کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گھسے ہیں تو تم بھی اس کے اندر جا گھسوگے۔

مسیحی اقوام نے قدیم زمانہ میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کی۔ یہ جنگ محض مذہبی جوش کے تحت تھی۔ اس میں تنظیم شامل نہ تھی۔ چنانچہ انھیں کامل شکست ہوئی۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اپنی غالب اقوام کے خلاف بے شمار جنگیں کیں۔ مگر یہ تمام جنگیں تنظیم کی ضروری شرط سے خالی تھیں۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا کہ مسلمانوں کو ہر محاذ پر شکست ہوئی۔ کیسی عجیب مشابہت ہے قدیم اہل کتاب میں اور جدید اہل کتاب میں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو اس کے پاس صرف جھوٹا جوش باقی رہتا ہے۔ وہ ہوش اس سے رخصت ہو جاتا ہے جو آدمی کے اندر سنجیدگی، حقیقت پسندی اور ذمہ داری کا احساس پیدا کرتا ہے۔ ایسی حالت میں اس سے وہی کردار ظاہر ہوتا ہے جس کا نمونہ صلیبی جنگوں کے زمانہ میں مسیحی اقوام نے پیش کیا اور موجودہ زمانہ میں جس کا مظاہرہ مسلمان ساری دنیا میں کر رہے ہیں۔

جھوٹا فخر

جس قوم کا ایک شاندار ماضی ہو اس کا بگاڑ ہمیشہ صرف ایک ہوتا ہے۔ یہ کہ اس کے اندر وہ نفسیات پیدا ہو جاتی ہے جس کو پدرم سلطان بود کہا جاتا ہے۔ آج مسلمانوں کا معاملہ یہی ہے۔ مسلمان جب دین کو کھو دیں تو اس کے بعد ان کے پاس صرف تاریخ باقی رہ جاتی ہے۔ ذاتی طور پر اسلام سے خالی ہونے کے بعد وہ یہ کرتے ہیں کہ گزرے ہوئے بڑے لوگوں کا نام لے کر فخر کرتے ہیں کہ ہم فلاں اور فلاں شخصیتوں سے نسبت رکھتے ہیں۔ ہم ایسے اور ایسے لوگوں کے وارث ہیں۔ یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ خود پیغمبر تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ ان چیزوں کو بھی اپنے فخر کے خانہ میں لکھ لیتے ہیں جن کا تعلق خالصتہً نبوت سے ہے۔ مثال کے طور پر معراج کے واقعہ کے بارہ میں مسلم شاعروں کے یہ اشعار پڑھئے:

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے — کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے — یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی — ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

ان اشعار میں بلند پروازی کا جو مضمون ہے وہ معراج کے واقعہ سے بطور تلمیح پیدا کیا گیا ہے۔ یہ توسیع درست نہیں کیوں کہ معراج کے واقعہ کا تعلق پیغمبر سے ہے نہ کہ عام مسلمانوں سے۔ مگر مسلمانوں کی فخر پسندی ان کو یہاں تک لے گئی کہ جو چیز استثنائی طور پر صرف پیغمبر کو دی گئی تھی اس کو "ہمارے پیغمبر" کی منطق سے انھوں نے اپنے خانہ میں ڈال لیا۔ حتی کہ اس معاملہ میں اپنے آپ کو پیغمبر سے بھی آگے بڑھا دیا۔ معراج کا واقعہ پیغمبر کے لئے عبدیت کا ایک تجربہ تھا۔ مگر مسلمانوں کے لئے وہ گردوں کو زد میں لینا، خدا پر کمند ڈالنا، ستاروں کو گرد راہ بنانا بن گیا۔ اسی کا نام جھوٹا فخر ہے اور جھوٹا فخر حقائق کی اس دنیا میں سب سے بڑی ہلاکت ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا اصل مرض یہی جھوٹا فخر ہے۔ جھوٹے فخر کی یہ نفسیات کبھی خاندان کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے۔ کبھی قوم اور مذہب کی بنیاد پر اور کبھی پیغمبر کا امتی ہونے کی بنیاد پر۔ مگر فخر کی تمام قسمیں سراسر باطل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی صرف وہ ہے جو وہ خود ہے نہ کہ وہ جو اس کے باپ دادا کبھی تھے۔

شاعرانہ خیال آرائی

رائے قائم کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ہے فرضی تخیل کی بنیاد پر رائے قائم کرنا۔ دوسرا ہے، حقائق کی بنیاد پر رائے قائم کرنا۔ شاعر فرضی تخیل کی بنیاد پر اپنی رائے بناتا ہے۔ حکیم یا مفکر وہ ہے جو حقیقتِ واقعی کی بنیاد پر اپنی رائے بنائے۔

شیخ سعدی شیرازی (۱۲۹۲ - ۱۲۱۳ء) ایک شاعر تھے۔ وہ اپنے ایک قطعہ میں کہتے ہیں کہ نوح پیغمبر کا بیٹا بردں کی صحبت میں بیٹھا تو پیغمبر کے خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ بگڑ گیا اور اصحاب کہف کا کتا چند دن نیکوں کی صحبت میں رہا تو وہ انسان ہوگیا :

پسر نوح با بداں بنشست خاندانِ نبوتش گم شد
سگِ اصحابِ کہف روزے چند پئے نیکاں گرفت مردم شد

ان اشعار کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں جو بات کہی گئی ہے، وہ فرضی تخیل کی بنیاد پر کہی گئی ہے نہ کہ حقائق کی بنیاد پر۔ حضرت نوح کے لڑکے کے بگڑنے کا سبب بروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بتایا گیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس سے زیادہ اُس کا اٹھنا بیٹھنا خود اپنے باپ حضرت نوح کے ساتھ تھا۔ پھر کیسے ایک کا اثر ہوا۔ اور دوسرے کا اثر نہیں ہوا۔ اسی طرح اصحاب کہف کے کتے کی وفاداری کو صحبت کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ حالاں کہ کتے کے بارہ میں عام تجربہ ہے کہ وہ اپنی فطرت کی بنا پر اپنے مالک کا وفادار ہوتا ہے نہ کہ صحبت پکڑنے کی بنا پر۔

بدقسمتی سے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں میں جو رہنما اٹھے وہ اسی قدیم دورِ شاعری سے متاثر تھے۔ چنانچہ انھوں نے نثر میں اسی قسم کی شاعری شروع کردی۔ انھوں نے فرضی تخیل کی بنیاد پر ایک رائے قائم کی۔ اور اس کو نظریہ کے انداز میں پیش کرنا شروع کر دیا۔ حالاں کہ نظریہ وہ ہے جو حقائق کے گہرے تجزیہ کی بنیاد پر وضع کیا گیا ہو نہ کہ شاعرانہ خیال آرائی کی بنیاد پر۔

یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر موجودہ زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے درمیان بڑی بڑی تحریکیں اٹھیں، مگر عملاً وہ اتنی بے نتیجہ ثابت ہوئیں جیسے کہ ان کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔ مثلاً جمال الدین افغانی کی اتحاد اسلامی، محمد علی کی خلافت تحریک، ابوالاعلیٰ مودودی کی حکومتِ الٰہیہ، وغیرہ۔

شاعری

مولانا بدرالدین چاچی ایک فارسی شاعر گزرے ہیں۔ ان کے قصائد کا مجموعہ چھپ چکا ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو:

آنچہ بر من رفت گر بر اشتراں رفتے ز غم　　　　می ز دندے کافراں بر جنت الماوی علم

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ کافر جنت میں داخل نہ ہوں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں نہ چلا جائے (الاعراف ۴۰) مذکورہ شعر اسی آیت کے اوپر لکھا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جو بے پناہ صدمات اور غم مجھے اٹھانے پڑے ہیں وہ صدمات اور غم اگر اونٹوں کو پیش آتے تو اونٹ جیسا بڑا جانور گھل گھل کر اتنا دبلا ہو جاتا کہ وہ سوئی کے ناکے میں داخل ہو کر اس سے نکل جاتا۔

پھر جب یہ واقعہ ہوتا کہ اونٹ سوئی کے ناکے کے اندر چلا جائے تو وہ رکاوٹ باقی نہ رہتی جو آیت میں مذکور ہے۔ اس کے بعد تو کافر بھی جنت میں پہنچ کر اپنا جھنڈا گاڑ دیتے۔ اونٹ کے سوئی کے ناکے سے پار ہونے کے بعد یہ تعلیق خود بخود اٹھ جاتی اور محال ممکن ہو جاتا۔

فارسی شاعری اور اس کے اثر سے اردو شاعری زیادہ تر اسی قسم کے مضامین سے بھری ہوئی ہے۔ دور از کار مبالغوں اور فرضی تک بندیوں کا دوسرا نام فارسی اور اردو شاعری ہے۔ اسی شاعری کے بطن سے وہ نثر نکلی جس کو خطیبانہ نثر کہا جا سکتا ہے۔

بعد کے دور میں اسی قسم کے شاعر اور ادیب وخطیب قوم کے لیڈر بن گئے۔ انھوں نے پوری قوم کے مزاج کو ویسا ہی بنا دیا جس کا ایک نمونہ اوپر کے شعر میں نظر آتا ہے۔

اب لوگ لفظی تک بندیوں سے معنوی نتائج کی امید کرنے لگے۔ تشبیہ اور ترکیب سے ثابت ہو جانے کو یہ اہمیت دینے لگے گویا کہ فی الواقع بھی وہ بات ثابت ہو گئی ہے۔ جوشِ کلام کو جوشِ عمل کا ہم معنی سمجھ لیا گیا۔ الفاظ کے زور پر حقائق کے قلعے فتح ہونے لگے۔ ردیف وقافیہ کے زور پر اونٹ کو سوئی کے ناکہ سے پار کر دیا گیا۔ مگر جب ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ ابھی تک وہ سوئی کے ناکہ کے باہر کھڑا ہوا ہے۔

بے خبری

اقبال کا ایک مشہور فارسی شعر ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ عیسیٰ کا دین آدمی کو غار میں اور پہاڑی ویرانوں میں لے جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارا دین اسلام ہم کو جنگ وشکوہ کا سبق دیتا ہے :

مصلحت در دینِ عیسیٰ غار وکوہ

مصلحت در دینِ ما جنگ وشکوہ

اقبال کا یہ شعر بتاتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ سے، کم ازکم شعوری طور پر، بالکل بے خبر تھے۔ اقبال ۱۸۷۷ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۸ میں ان کی وفات ہوئی۔ یہ پورا زمانہ وہ ہے جب کہ "عیسیٰ" کو ماننے والی قوموں نے صدیوں کی ترقیاتی کوششوں کے بعد اپنے آپ کو اتنا اونچا اٹھایا کہ وہ تقریباً پوری دنیا پر براہِ راست یا بالواسطہ طور پر غالب آگئیں۔ بالفاظِ دیگر، انھوں نے دینِ اسلام کے پیروؤں کو "غار وکوہ" میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اور خود "جنگ وشکوہ" کے ہر میدان میں مکمل برتری حاصل کر لی۔

اس واضح واقعہ کے باوجود اقبال اپنا مذکورہ بالا شعر کہتے ہیں جو اصل صورت حال کے بالکل برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ شعر ماضی سے بھی بے خبری کا ثبوت ہے اور حال سے بے خبری کا بھی۔

مسیحی لوگ ابتدائی زمانہ میں اپنے مخالفین کی داروگیر سے بھاگ کر غاروں اور پہاڑوں میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ اس کے بعد وہ دور آیا جب کہ وہ دنیا کی سب سے زیادہ غالب قوم بن گئے۔ یہی واقعہ خود مسلمانوں کے ساتھ بھی پیش آیا۔ مکہ کے ابتدائی دور میں مسلمان اپنے دین کو لے کر پہاڑی گھاٹیوں میں چلے گئے، اور ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس کے بعد حالات بدلے اور مسلمان عالمی سطح پر غالب اور فاتح بن گئے۔

اقبال اور ان کے جیسے دوسرے لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے صرف دورِ ثانی کو جانتے ہیں اور مسیحیوں کے صرف دورِ اوّل کو۔ ایسے بے خبر لوگ اگر اپنی قوم کو وقت کے مطابق صحیح رہنمائی نہ دے سکیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

اس قسم کی رہنمائی صرف جھوٹا فخر دے سکتی ہے، مگر جھوٹا فخر کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں، نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔

پیرو یا پرستار

لکھنؤ کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بات چیت کے دوران میں نے اقبال پر تنقید کی۔ میں نے کہا کہ اقبال کا شعر ہے : لڑا دے ممولے کو شہباز سے ۔ یعنی تم کمزور ہو تب بھی طاقت ور سے لڑ جاؤ۔ میں نے کہا کہ یہ محض شاعرانہ خیال آرائی ہے۔ اس کا تعلق نہ عقل سے ہے اور نہ اسلام سے۔

مذکورہ مسلمان غصہ ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ اقبال پر تنقید کرتے ہیں۔ اقبال تو بہ تھے، اقبال تو وہ تھے۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ اقبال کے پرستار ہیں مگر آپ لوگ اقبال کے پیرو نہیں۔ اگر واقعۃً آپ اقبال کے پیرو ہیں تو ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب آپ کے پڑوس میں بابری مسجد کو توڑ کر اس کی جگہ مندر بنایا گیا تو اقبال کے مداحوں کو لے کر آپ کیوں نہیں اجودھیا میں گھس پڑے۔ آپ لوگ اگرچہ "ممولا" تھے اور کارسیوک آپ کے مقابلہ میں "شہباز" تھے۔ مگر آپ کے اقبال تو یہی کہتے ہیں کہ تم خواہ ممولا ہو، تب بھی تم شہباز سے لڑ جاؤ۔ آپ لوگ اجودھیا میں داخل ہو کر کارسیوکوں سے ٹکرا جاتے۔ اگر وہ لوگ آپ کو مار ڈالتے تب بھی آپ کامیاب تھے۔ کیوں کہ آپ کے محبوب اقبال نے کہا ہے :

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن   نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ جو لوگ "اکابر" کی تنقید پر غصہ ہوتے ہیں، ان کے غصہ کی حقیقت کیا ہے۔ یہ لوگ سب کے سب اپنے اکابر کے پرستار ہیں، وہ اپنے اکابر کے پیرو نہیں۔ ان میں سے کوئی نہیں جو واقعۃً اکابر کے کہے پر چل رہا ہو۔ البتہ اگر کوئی شخص ان کے مفروضہ اکابر پر کوئی نقد کر دے تو وہ بھڑک اٹھیں گے۔ ان کا یہ رویہ پرستاری کی بنا پر ہے، وہ پیروی کی بنا پر نہیں۔ اسلام میں "اکابر" کی کوئی کیٹگری نہیں۔ تاہم اگر کوئی شخص کچھ افراد کو اکابر کا درجہ دے تب بھی، اسلام کے مطابق، ان کی صرف پیروی جائز ہوگی، ان کی پرستاری کے لیے اسلام میں کوئی جواز نہیں۔ لوگ اکابر کے پرستار ہیں، اسی لیے وہ اکابر کی تنقید پر غصہ ہوتے ہیں۔ اگر وہ اکابر کے پیرو ہوتے تو ہرگز ایسا نہ ہوتا کہ وہ اکابر کی تنقید پر بھڑک اٹھیں۔

تاریخ یا عقیدہ

علامہ اقبال نے کہا ہے کہ جس طرح ایک شخص کی زندگی میں حافظہ کی زبردست اہمیت ہوتی ہے، حافظہ اگر گم ہوجائے یا بالکل ختم ہوجائے تو اس کی زندگی اس کے لیے بے معنی ہوجائے گی۔ اسی طرح ایک قوم یا ایک ملّت کی زندگی میں تاریخ کی زبردست اہمیت ہے۔ کیوں کہ اگر اس کی تاریخ گم ہوجائے یا گُمنامی کی موٹی تہوں کے نیچے دفن ہوجائے تو اس قوم کی زندگی بھی بے معنی اور لغو ہو کر رہ جاتی ہے:

Just as in the life of an individual, memory has great significance, in that if it fades or is lost altogether, then his life becomes meaningless for him. In similar way in the life of a community or a nation, history assumes great importance, because if its history is lost or is buried under thick layers of obscurity, then its life too becomes meaningless and absurd.

یہ نظریہ سے زیادہ شاعری ہے۔ کیوں کہ قومیں عقیدہ پر زندہ ہوتی ہیں نہ کہ تاریخ پر۔ مسلمانوں کا پہلا گروہ (صحابہ و تابعین) بلاشبہ زندہ ترین گروہ تھا۔ جس نے مسلمہ طور پر عظیم الشان کارنامے انجام دیئے۔ مگر ان کی کوئی تاریخ نہیں تھی۔ ان لوگوں نے خود اپنے عمل سے یقیناً ایک عظیم ترین تاریخ بنائی۔ مگر خود وہ کسی تاریخ کے وارث نہ تھے۔ اس کے برعکس انھوں نے اپنی تاریخ سے کٹ کر از سر نو ایک بالکل جدید زندگی شروع کی تھی۔

دوسری مثال موجودہ مسلمانوں کی ہے۔ موجودہ زمانہ کے تمام مصلحین (بشمول علامہ اقبال) نے یہ کیا کہ مسلمانوں کو ان کی تاریخ یاد دلائی۔ تاریخ کے موضوع پر، براہ راست یا بالواسطہ انداز میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ ہمارے تمام شاعر اور خطیب اور انشا پرداز تاریخ کی زبان میں بیداری کا صور پھونکتے رہے۔ مگر قوم کے اندر ایک فی صد بھی کوئی حقیقی بیداری پیدا نہیں ہوئی۔ مسلمان سو سال پہلے جتنے پست حال تھے، آج بھی اتنا ہی یا اس سے زیادہ پست حال ہیں ——— حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کے افراد اپنے اندرونی انقلاب سے ابھرتے ہیں نہ کہ واقعاتِ گزشتہ کی یاددہانی سے۔

سب سے بڑا فتنہ

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ منبر پر کھڑے ہوئے اور لوگوں کے سامنے تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ اس امت کے لیے میں سب سے زیادہ جس سے ڈرتا ہوں وہ منافق عالم ہے۔ لوگوں نے اس کی بابت مزید پوچھا تو حضرت عمر نے جواب دیا کہ عالم اللسان، جاہل القلب (حیاۃ الصحابہ، الجزء الثالث ، صفحہ ۲۶۶)

ایک شخص اندھا ہے۔ اس کے پاس ہاتھ ہے جس سے وہ پکڑے، مگر اس کے پاس آنکھ نہیں جس سے وہ دیکھے۔ ایسے آدمی کے ہاتھ میں ایک ہیرا دیدیا جائے تو کیا ہوگا۔ وہ ہیرے کو ٹٹول کر ہیرے کی سختی کو جان لے گا۔ مگر وہ ہیرے کی چمک کو نہ جان سکے گا۔ کیوں کہ ہیرے کی چمک اور اس کی خوبصورتی کو جاننے کے لیے آنکھ کی ضرورت ہے، اور آنکھ اس کے پاس موجود ہی نہیں۔

یہی معاملہ کسی آدمی کا اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس کے پاس بصارت ہو مگر اس کے پاس بصیرت نہ ہو۔ اس کے پاس ذہنی علم ہو مگر اس کے پاس قلبی معرفت نہ ہو۔ یہی وہ انسان ہے جس کی بابت حضرت عمر نے فرمایا کہ وہ زبان کا عالم مگر قلب کا جاہل ہوگا۔

ایسا آدمی قرآن وحدیث کو پڑھے گا مگر وہ کہیں کی بات کہیں جوڑ دے گا۔ کیوں کہ اس کے پاس صرف الفاظ کا ذخیرہ ہے، وہ معانی کی گہرائیوں سے واقف نہیں۔ وہ اسلام کے نام پر تحریک چلائے گا مگر وہ بے لگام گھوڑے کی طرح کسی بھی سمت میں دوڑنا شروع کر دے گا۔ کیوں کہ اس کو راستوں کی پہچان حاصل نہیں۔

ایسا شخص بے اعترافی کا کمال دکھائے گا مگر وہ اعتراف کا ثبوت نہ دے سکے گا، کیوں کہ وہ اعتراف کی لذت سے آشنا نہیں۔ وہ بے صبری کا مظاہرہ کرے گا مگر وہ صبر کی روش اختیار نہ کر سکے گا، کیوں کہ وہ صبر کی اہمیت کو نہیں جانتا۔ وہ اپنی ذات سے تعلق رکھنے والے مسائل کو فوراً سمجھ لے گا مگر ملت سے تعلق رکھنے والے مسائل کو سمجھنے سے قاصر رہے گا، کیوں کہ اس کے سینہ میں اپنی ذات کا درد تو ہے مگر اس کے سینہ میں ملت کا درد نہیں ــــــ جو لوگ الفاظ کے عالم اور معانی کے جاہل ہوں وہ بلاشبہ سب سے بڑا فتنہ ہیں، امتِ مسلمہ کے لیے بھی اور وسیع تر معنی میں ساری انسانیت کیلئے بھی۔

صرف الفاظ

امریکہ میں اگلی میعاد کے لئے صدر کے انتخاب کی مہم چل رہی تھی۔ ڈیموکریٹک پارٹی نے ایک خاتون فیرارو (Geraldine Ferraro) کو صدارت کے لئے اپنا نمائندہ بنایا۔ ٹائم میگزین نے مذکورہ خاتون کی زبردست حمایت کی۔ ٹائم (۲۳ جولائی ۱۹۸۴) میں مذکورہ خاتون کی حمایت میں ایک مفصل مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا:

A Break with Tradition

ٹائم کی اس اشاعت میں کئی تصویریں تھیں۔ ایک تصویر میں کچھ امریکی خواتین ایک بورڈ سر پہ اٹھائے ہوئے کھڑی تھیں۔ بورڈ پر لکھا ہوا تھا کہ بہتر کل کے لئے فرارو کو ووٹ دو:

Ferraro, For A Better Tommorrow

اسی طرح نیو سنڈے ٹائمس (کوالالمپور) کی اشاعت ۲۹ جولائی ۱۹۸۴ میں ایک قصہ پڑھا کہ امریکہ کے میگزین پینٹ ہاؤس (Pent House) نے ایک سنسنی خیز واقعہ کیا۔ اس نے پہلی نیگرو مس امریکہ وینیسا ولیمس (Vanessa Williams) کو راضی کر کے اس کی بہت سی ننگی تصویریں لیں اور ان تصویروں کو چھاپ کر کروڑوں روپئے کمائے۔ مذکورہ امریکی اخبار نے ان تصاویر کے اوپر جو عنوان قائم کیا وہ یہ تھا کہ وینیسا بغیر لباس:

Vanessa The Undressa

فرارو کے حامیوں نے اپنے سیاسی مدعا کو نہایت موزوں الفاظ میں ڈھال لیا۔ اسی طرح وینیا کی ننگی تصویروں کی تجارت کرنے والوں کو بھی اپنے موافق الفاظ مل گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ الفاظ اس دنیا میں سب سے بڑا فتنہ ہیں۔ الفاظ میں اتنی گنجائش ہے کہ جو شخص بھی چاہے اپنے خیالات کے لئے دلفریب الفاظ پالیتا ہے۔

ہر آدمی اپنی بات کو خوب صورت الفاظ میں ڈھال کر سمجھتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔ حالاں کہ کسی بات کا خوب صورت الفاظ میں ڈھل جانا اس بات کا کافی ثبوت نہیں کہ وہ فی الواقع بھی حقیقت ہے۔ آخر کار کامیابی صرف اس شخص کو ملے گی جس کے پاس حقیقت ہو نہ کہ اس شخص کو جس کے پاس صرف الفاظ ہوں۔ مگر حقیقت اس کے پاس موجود نہ ہو۔

بے قیمت الفاظ

الرسالہ کا پہلا شمارہ اکتوبر ۱۹۷۶ میں نکلا۔ اس سے پہلے ہمارے بہت سے دوست ہم سے کہتے تھے کہ آپ اپنا علیٰحدہ پرچہ نکالئے، ہم اس میں آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔ پیسہ دیں گے۔ خریدار بنوائیں گے۔ اشتہار دلائیں گے۔ انتظامی خدمات انجام دیں گے۔ مگر عملاً جو صورت پیش آئی وہ صرف دو تھی:

۱۔ بیشتر لوگ وہ تھے جنھوں نے سرے سے کسی قسم کا کوئی تعاون نہیں دیا۔ الرسالہ نکلنے سے پہلے وہ بڑے بڑے الفاظ بولے تھے، انھوں نے ہم سے خوبصورت وعدے کئے تھے۔ مگر جب عمل کرنے کا وقت آیا تو انھوں نے اپنے الفاظ پر عمل نہیں کیا۔ وہ صرف بولنے والے ثابت ہوئے، وہ کرنے والے ثابت نہ ہو سکے۔

۲۔ دوسرے لوگ، نسبتاً کم، وہ تھے جنھوں نے الرسالہ کے ساتھ کچھ تعاون کیا۔ مگر ان کا تعاون بہت جلد ختم ہو گیا۔ ان کا حال یہ ہوا کہ ذرا سی کوئی بات ان کے مزاج کے خلاف ہوئی یا کسی نے ہمارے خلاف کوئی شوشہ ان کے کان میں ڈال دیا تو وہ بدک کر الگ ہو گئے۔ اس کے بعد کوئی بھی دلیل انھیں مطمئن کرنے والی ثابت نہ ہو سکی۔

الرسالہ کا یہ چھ سالہ تجربہ موجودہ سماج کا آئینہ ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ ہر آدمی خوبصورت الفاظ کا ایک کارخانہ بنا ہوا ہے۔ ہر آدمی شان دار باتیں کرتا ہے، بڑے بڑے وعدے کر لیتا ہے۔ مگر جب عمل کا وقت آتا ہے تو اپنے وعدوں اور اپنے الفاظ کو وہ اس طرح بھول جاتا ہے جیسے اس نے کچھ کہا ہی نہ تھا۔ اگر اس کو اس کی وعدہ خلافی یاد دلائیے، اس کے قول و عمل کے فرق کو اس پر واضح کیجئے تو اب اس کے پاس نئے الفاظ کا وسیع تر ذخیرہ موجود ہو گا جو اس کی اپنی ذات کو بالکل صحیح ثابت کر رہے ہوں اور آپ کو بالکل غلط۔

اس قسم کے الفاظ کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ ایسے بولے ہوئے الفاظ جن پر عمل کے وقت عمل نہ کیا جائے گویا بے کار چیک (Dud Cheque) ہیں جو صرف کاغذ پر لکھ کر دے دئے جائیں مگر آدمی کے کھاتہ میں ان کی ادائگی کے لئے ضروری رقم موجود نہ ہو۔ یہاں ہم موطا امام مالک کی ایک روایت نقل کرتے ہیں۔

امام مالک نے کہا، مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ قاسم بن محمد کہتے تھے کہ میں نے ایسے لوگ (اصحاب رسول) دیکھے ہیں جو قول پر خوش نہیں ہوتے تھے۔ امام مالک نے کہا، اس سے ان کی مراد عمل تھی۔ آدمی کا صرف عمل دیکھا جائے گا، اس کا قول نہیں دیکھا جائے گا (انما ینظر الی عملہ ولا ینظر الی قولہ)

لفظی موشگافی

ہندستان کی آزادی سے پہلے کا واقعہ ہے۔ ایک ہندستانی عدالت میں قتل کا ایک مقدمہ آیا۔ قاتل کی طرف سے مسٹر محمد علی جناح وکیل تھے۔ قتل بہت زیادہ واضح تھا۔ تمام کارروائی اس طرح چل رہی تھی گویا قاتل کو سزا ہو کر رہے گی۔ مگر مسٹر جناح نہایت مطمئن تھے۔ وہ عدالت کی کارروائیوں میں بظاہر دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ قاتل اور اس کے ساتھیوں کو مسٹر جناح کے اوپر شبہ ہوا کہ وہ کسی وجہ سے کیس کی طرف سے غافل ہو گئے ہیں۔ اور قاتل کو سزا دلوا کر رہیں گے۔ مگر مسٹر جناح ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ اطمینان رکھو، کچھ نہیں ہوگا۔

دن گزرتے رہے یہاں تک کہ قاتل کے لئے پھانسی کی سزا کا فیصلہ ہو گیا۔ مگر مسٹر جناح اب بھی مطمئن تھے۔ اس کے بعد اعلان ہوا کہ فلاں تاریخ کو اتنے بجے قاتل کو پھانسی دی جائے گی۔ مسٹر جناح بدستور مطمئن رہے یہاں تک کہ پھانسی کا وقت آ گیا۔

مسٹر جناح اپنے پورے وکیلانہ لباس کے ساتھ پھانسی گھر پہنچے اور نہایت خاموشی کے ساتھ پوری کارروائی دیکھتے رہے۔ جب آخری لمحہ آیا اور ہینگ مین نے رسی کا حلقہ قاتل کی گردن میں ڈالا تو مسٹر جناح فوراً بولے کہ بس۔ اس کے آگے اگر کچھ اور کیا تو تم سب لوگوں کو پھانسی پر چڑھا دوں گا۔

اب سارے لوگ حیران ہو گئے۔ مسٹر جناح نے کہا کہ جج نے اپنے فیصلہ میں جو الفاظ لکھے ہیں وہ یہ ہیں کہ اس کی گردن میں پھانسی دی جائے (He shall be hanged by the neck) اور ملزم کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کے بعد ان الفاظ کی تعمیل ہو گئی، اب اس کے آگے آپ کچھ اور نہیں کر سکتے۔ اس وقت تک پھانسی کے ہندستانی قانون میں اتنے ہی الفاظ تھے۔ اس واقعہ کے بعد نیا قانون پاس کیا گیا جس میں یہ الفاظ لکھے گئے کہ ملزم کی گردن میں پھانسی دی جائے گی تاوقتیکہ وہ مر جائے:

He shall be hanged by the neck till he is dead

اس قسم کی لفظی موشگافیاں دنیا میں اکثر لوگوں کے لئے بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ آدمی عدالت کی پکڑ سے بچ جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ وہ اپنی گرتی ہوئی قیادت کو دوبارہ سنبھالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو کبھی غلط ثابت ہونے نہیں دیتا۔ اس کے ذریعہ وہ بڑے بڑے فائدے حاصل کرتا ہے مگر یہ سب کچھ موجودہ دنیا کی حد تک ہے۔ آخرت میں اس قسم کی موشگافی کسی کے کچھ کام نہ آئے گی۔ کیوں کہ آخرت میں تمام فیصلے حقیقت کی بنیاد پر ہوں گے نہ کہ لفظی کرتب کی بنیاد پر۔

دوسروں کے ذمہ

اپریل ۱۹۸۶ کا واقعہ ہے۔ عرب دنیا کے ایک معروف ادیب (ڈاکٹر عبدالحلیم عویس) ہمارے مرکز میں آئے اور چند دن ہمارے ساتھ قیام کیا۔ ۱۰ اپریل کو وہ اپنا کوٹ ایک ہینگر پر لٹکا رہے تھے۔ اس وقت وہ مسکرائے اور ایک لطیفہ بیان کیا۔ انھوں نے ایک عرب شخصیت کا نام لیتے ہوئے کہا کہ ان کا قول ہے :

نحنُ نُعَلِّق علی شمّاعة (علّاقة) الاستعمار کُلَّ اَخطائِنا

یعنی ہم اپنی تمام غلطیوں کو استعمار کے ہینگر پر لٹکا دیتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں پر یہ صحیح ترین تبصرہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر جو لکھنے اور بولنے والے پیدا ہوئے ان کو پڑھیے اور سنیے تو تقریباً بلا استثنا ریہ ملے گا کہ ہر آدمی مسلمانوں کی بربادی کا مرثیہ پڑھ رہا ہے اور ہر آدمی مسلمانوں کی بربادی کا ذمہ دار دوسری قوموں کو قرار دے رہا ہے۔

یہ بات اتنی زیادہ عام ہے کہ جو لوگ بظاہر اس سے مختلف بات کہتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ بھی حقیقۃً اس سے مختلف نہیں ہیں۔ ایک شخص سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے ایک رہنما کا نام لیا جنھوں نے اپنی تقریر میں جوش و خروش کے ساتھ غیر اقوام کی سازشوں کا انکشاف کیا تھا اور کہا تھا کہ ان سازشوں نے مسلمانوں کو زبردست نقصان پہونچایا ہے۔ مذکورہ شخص نے فوراً کہا کہ نہیں۔ آپ اس رہنما کی فلاں تقریر کو پڑھیے۔ اس میں انھوں نے مسلمانوں کی بربادی کا ذمہ دار خود مسلمانوں کو قرار دیا ہے۔ میں نے یہ کہا کہ آپ کا یہ حوالہ صرف مذکورہ رہنما کی تضاد فکری کو بتاتا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ انھوں نے اصل حقیقت کو نہیں سمجھا ہے، اس لیے مجمع کی رعایت سے وہ کبھی ایک بات کہہ دیتے ہیں اور کبھی دوسری بات۔

اس دنیا میں آدمی صرف اپنے کیے کو بھگتتا ہے۔ اگر دوسروں کو اپنی بربادی کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے تو بربادی کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ کیوں کہ اصل سبب تو خود اپنے اندر تھا، اور وہ بدستور اپنی جگہ باقی رہا۔

حد سے باہر

اخبار قومی آواز (۲۴ اکتوبر ۱۹۹۰) میں ایک صاحب کا مضمون "بابری مسجد ۔ رام جنم بھومی تنازعہ" کے بارہ میں چھپا ہے ۔ اس کا عنوان ہے ـــــــــ "ضرورت ہے رام چرن داس اور امیر علی کی" اس مضمون میں اجودھیا کے مسئلہ کی سنگینی کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے :

"بات ۱۸۵۰ کی ہے ۔ (اس وقت بھی بابری مسجد اور رام جنم کے تنازعہ نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی پیدا کر دی تھی) فیض آباد ضلع گزیٹیر سے پتہ چلتا ہے کہ اجودھیا کے مقامی مسلم رہنما امیر علی اور (مقامی) ہندو رہنما بابا رام چرن داس نے رام جنم بھومی اور بابری مسجد کے تنازعہ کا حل تلاش کرنے کی غرض سے دونوں فریقوں کی طرف سے معاہدہ کیا کہ جنم بھومی کی مخصوص متنازعہ آراضی ہندوؤں کو سونپ دی جائے ۔ اس کے عوض بابا رام چرن داس نے ہندوؤں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ پوری عمارت پر قابض ہونے کا مطالبہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں گے تاکہ مسلمانوں کو مسجد نہ ہٹانا پڑے ۔"

اس مضمون سے بظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آج رام چرن داس اور امیر علی جیسے لوگ موجود نہیں ہیں ۔ اگر ایسے افراد آج ہوتے تو مسئلہ فوراً حل ہو جاتا ۔ مگر یہ بات خلاف واقعہ ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی رام چرن داس اور امیر علی جیسے لوگ موجود ہیں اور سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں ۔ لیکن وہ موثر ثابت نہیں ہو رہے ہیں ۔ ایسی حالت میں اصل سوچنے کی بات یہ ہے کہ ۱۸۵۰ کے رام چرن داس اور امیر علی مسئلہ کو حل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے ، مگر آج کے رام چرن داس اور امیر علی مسئلہ کو حل کرنے میں سراسر ناکام ہو رہے ہیں ، اس کا سبب کیا ہے ۔

اس کا سبب بالکل سادہ ہے ۔ ۱۸۵۰ میں یہ مسئلہ ایک مقامی مسئلہ کی حیثیت رکھتا تھا ۔ وہ اجودھیا کے دو فرقوں کا مسئلہ تھا نہ کہ سارے ملک میں بسنے والی دو قوموں کا مسئلہ ۔ اس وقت بابری مسجد کے نام پر کوئی آل انڈیا یا انٹرنیشنل تنظیم نہیں بنی تھی جو اس کو بڑھا چڑھا کر تمام ہندوؤں اور تمام مسلمانوں کے لیے وقار کا مسئلہ بنا دے ۔

دو قوموں کے درمیان جب کوئی نازک مسئلہ پیدا ہو تو اس کو ہمیشہ مقامی دائرہ میں باقی رکھنا چاہیے ۔ مسئلہ کا مقامی دائرہ میں رہنا اس کا محدود دائرہ میں رہنا ہے ۔ مگر مسئلہ جب قومی اور ملکی سطح پر پھیلا دیا جائے تو اس وقت وہ غیر محدود دائرہ میں چلا جاتا ہے ۔ اور پھر ناممکن ہو جاتا ہے کہ کوئی ہندو یا کوئی مسلمان اس کو حل کر سکے ۔

عجیب لوگ

الرسالہ (اکتوبر ۱۹۸۵) میں ایک مضمون چھپا تھا جس کا عنوان تھا "الفاظ کا رجسٹر" اس میں دکھایا گیا تھا کہ اردو زبان میں معیار بندی نہ ہونے کی وجہ سے یہ صورت حال ہے کہ بڑے بڑے لکھنے والے بھی اپنی تحریروں میں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو جدید اصطلاح میں رجسٹر کے باہر کے الفاظ ہوتے ہیں۔

اس مضمون کو پڑھ کر ایک صاحب نے ہمیں پرجوش خط روانہ کیا ہے۔ ان کو اس مضمون پر سخت اعتراض ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد میں نے اردو زبان کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں سے "انکوائری" کی کہ کیا ایسا کوئی رجسٹر موجود ہے مگر ہر ایک نے ایسے رجسٹر سے لاعلمی کا اظہار کیا۔

انھوں نے لکھا ہے کہ ممکن ہے انگریزی زبان میں ایسے رجسٹر موجود ہوں مگر اردو میں ابھی تک ایسی کوئی کتاب نہیں چھپی ہے جس میں رجسٹر کے اعتبار سے الفاظ کی تقسیم کی گئی ہو۔ ایسی حالت میں اردو کے اہل قلم حضرات کو کیوں کر اس بات کا مجرم قرار دیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں رجسٹر کے باہر کے الفاظ استعمال کیے۔ جب خود رجسٹر کا وجود نہیں تو کیسے فیصلہ کیا جائے گا کہ فلاں لفظ رجسٹر کے باہر ہے اور فلاں لفظ رجسٹر کے باہر نہیں۔

ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ مذکورہ مضمون میں "الفاظ کا رجسٹر" سے مراد ذہنی رجسٹر ہے نہ کہ کوئی مطبوعہ رجسٹر۔ اس قسم کا رجسٹر ہمیشہ غیر مکتوب ہوتا ہے نہ کہ مکتوب۔ جو لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے انھیں کم از کم اپنی بے خبری کو جاننا چاہیے تاکہ وہ جاننے والے سے پوچھیں۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو نہیں جانتے، مزید یہ کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ نہیں جانتے۔

یہی وجہ ہے کہ لوگ وہاں بولتے ہیں جہاں انھیں چپ رہنا چاہیے۔ لوگ وہاں دوسرے کی غلطی کا اعلان کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں جہاں ان سے مطلوب تھا کہ اپنی کوتاہی کا اعتراف کریں۔ لوگ صرف بولنے کو کام سمجھتے ہیں حالاں کہ چپ رہنا بھی ایک کام ہے۔ لوگ اپنی واقفیت کے اظہار کو کمال سمجھتے ہیں حالاں کہ اپنی ناواقفیت کا اعتراف بھی کم کمال کی بات نہیں۔

آج کا انسان

دیکھنے میں ایک انسان دوسرے انسان سے الگ دکھائی دیتا ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے سارے انسان یکساں ہیں۔ بولنے کے وقت لوگ الگ الگ الفاظ بولتے ہیں مگر کرنے کے وقت سارے لوگ ایک ہو جاتے ہیں۔

بظاہر کوئی اِس قوم سے تعلق رکھتا ہے اور کوئی اُس قوم سے۔ کوئی جزئی دین کا علمبردار ہے اور کوئی کلی دین کا۔ کوئی انسانیت کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہے اور کوئی قومیت کا۔ کوئی انفرادی انقلاب پر تقریر کر رہا ہے اور کوئی اجتماعی انقلاب پر۔ کوئی توحید کا چمپئن بنا ہوا ہے اور کوئی قبر پرستی اور بزرگ پرستی کا۔ کوئی زمین کا احتساب کر رہا ہے اور کوئی آسمان کا۔

مگر یہ سارے فرق کہنے کے اعتبار سے ہیں۔ جب کرنے کا وقت آتا ہے تو سب کے سب ایک ہو جاتے ہیں۔ اب ہر ایک کا دین وہی بن جاتا ہے جس کو دوسرا شخص اپنا دین بنائے ہوئے ہیں۔ قول کے اعتبار سے سب کا دین الگ الگ ہے مگر عمل کے اعتبار سے سب کا دین ایک ہے۔

جہاں ذاتی مفاد کا معاملہ ہو وہاں لوگوں کی تمام قوتیں جاگ اٹھتی ہیں اور جہاں ذاتی مفاد نہ ہو وہاں وہ بالکل بے حس بنے رہتے ہیں۔ کوئی اپنے سے بڑھتا ہوا نظر آئے تو سارے لوگ حسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور جو شخص اپنے سے کم نظر آئے اس کو وہ حقیر سمجھ لیتے ہیں۔ اپنا آدمی ہو تو اس کی ہر بات صحیح نظر آتی ہے اور اگر غیر آدمی ہو تو اس کی ہر بات غلط دکھائی دیتی ہے۔ تعریف کرنے والے کی ہر شخص کے نزدیک زبردست قیمت ہے۔ اور جو شخص تنقید کرے وہ ہر ایک کی نظر میں بے قیمت ہو جاتا ہے۔ اپنے موافق بات کو سمجھنے کے لئے ہر آدمی ہوشیار ہے اور اپنے مخالف بات کو سمجھنے کے لئے ہر آدمی بے وقوف۔ جس سے کسی قسم کا مفاد وابستہ ہو اس کے لئے ہر آدمی بااخلاق بن جاتا ہے۔ اور جس سے کوئی مفاد وابستہ نہ ہو اس کے لئے ہر آدمی بے اخلاق ہے۔ کسی سے شکایت ہو تو اس کے بارہ میں آدمی ہر الٹی خبر کو بلا تحقیق مان لیتا ہے۔ اور جس سے دوستی ہو اس کے خلاف کوئی یقینی خبر ملے تب بھی وہ ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔

تقریر کی سطح پر ہر آدمی الگ الگ تقریر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر جینے کی سطح پر دیکھئے تو ہر آدمی ایک ہی سطح پر نظر آئے گا اور کسی آدمی کا دین وہی ہے جہاں وہ جی رہا ہے نہ کہ وہ جہاں وہ الفاظ کی نمائش کر رہا ہے۔

انسان کی سب سے بڑی کم زوری

ایک شخص کا کہنا تھا کہ دنیا میں صرف دکھ ہے۔ یہاں سکھ نام کی کوئی چیز نہیں۔ ایک روز وہ اپنی بیوی کے ساتھ ناشتہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ گفتگو کے دوران اس نے اپنا خیال دہرایا۔ اس کے ہاتھ میں مکھن لگا ہوا ڈبل روٹی کا ٹکڑا تھا۔ اس نے کہا دنیا میں دکھ اتنا زیادہ ہے کہ یہ ٹکڑا اگر میرے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گرے تو وہ بھی مکھن کی طرف گرے گا۔ اس کی بیوی نے کہا کہ تمھارا خیال صحیح نہیں۔ یہاں دکھ سکھ دونوں ہیں۔ ڈبل روٹی کا ٹکڑا اگر زمین پر گرے تو ادھر بھی گر سکتا ہے جدھر مکھن لگا ہوا ہے اور ادھر بھی جس طرف مکھن لگا ہوا نہیں ہے، بحث ہوتی رہی۔ آخر بیوی نے کہا کہ چلو تجربہ کر لو۔ ڈبل روٹی کا ٹکڑا زمین پر گراؤ پھر دیکھو کہ وہ دونوں رخوں میں سے کس رخ پر گرتا ہے۔ آدمی نے ٹکڑے کو فضا میں اچھالا۔ وہ زمین پر گرا تو اتفاقاً برعکس صورت حال پیش آئی۔ ٹکڑے کا مکھن لگا ہوا رُخ اوپر تھا۔ تجربہ نے عورت کی بات دو اور دو چار کی طرح ثابت کر دی تھی۔ مگر یہ چیز آدمی کو چپ نہ کر سکی۔ اس نے فوراً کہا: بات یہ ہے کہ میں نے غلط رخ پر مکھن لگا دیا تھا۔

یہ لطیفہ انسان کی نفسیات کو بہت خوبی کے ساتھ واضح کر رہا ہے۔ آدمی کسی بات کو اس وقت مانتا ہے جب کہ وہ خود بھی ماننا چاہے۔ اگر وہ ماننا نہ چاہے تو آپ کسی بھی طرح اس کو منوا نہیں سکتے۔ ہر دلیل کے توڑ کے لئے وہ کچھ نہ کچھ الفاظ تلاش کرے گا۔ کوئی دلیل خواہ وہ کتنی ہی مضبوط ہو، آدمی کو چپ کرنے والی ثابت نہیں ہو سکتی۔ مشین میں آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ بٹن دبا کر مطلوبہ نتیجہ حاصل کر لیں۔ مگر انسان اس قسم کی کوئی مشین نہیں ہے۔ یہاں نتیجہ تمام تر خود "مشین" کے اپنے ہاتھ میں ہے نہ کہ آپ کے ہاتھ میں۔ دلیل کو بٹن کا مقام نہیں دیا جا سکتا۔ اور بلاشبہ زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے۔

جب کوئی بات سامنے لائی جائے تو صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی خالص اصلیت کے اعتبار سے اس کو دیکھے۔ وہ کھلے ذہن کے ساتھ اس پر غور کرے۔ ماننے یا نہ ماننے کی بنیاد بات کا صحیح یا غلط ہونا ہو نہ کہ دوسرے اعتبارات۔ یہی طالبِ حق کا طریقہ ہے۔ مگر آج صورت حال یہ ہے کہ ہر آدمی نے اپنے ذہن کو کہیں نہ کہیں باندھ رکھا ہے۔ وہ کسی نہ کسی جگہ اپنے کو چھپائے ہوئے ہے۔ اس کے فیصلے اسی چھپی ہوئی وفاداریوں کے تحت ہوتے ہیں نہ کہ حقیقۃً بے لاگ جائزہ کے تحت۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب کوئی بات سامنے آتی ہے تو آدمی ایک قسم کے منفی ردعمل کا اظہار کرتا ہے، وہ ایجابی رویہ ظاہر نہیں کر پاتا۔ وہ بات کو اس کی اصلیت کے اعتبار سے دیکھنے کے بجائے اپنے تعصبات اور اپنی مصلحتوں کے تحت اس کو دیکھنے لگتا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کا ذہن یا تو تاویل کے رُخ پر چل پڑتا ہے یا تردید کے رخ پر۔ وہ تصدیق اور اعتراف کے رخ پر چلنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتا۔ جو بات آدمی کی پسند کے خلاف ہو، جس میں اس کی شخصیت چھوٹی ہو رہی ہو اس کو وہ سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ وہ اس کو غیر موافقانہ ذہن کے ساتھ سنتا ہے اور فوری تاثر کے تحت ایک رائے قائم کر کے اس کو رد کر دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں نے ایک بات کو غلط پا کر اس کو رد کیا ہے۔ حالاں کہ باعتبار حقیقت وہ اپنے ایک خود ساختہ تصور کو رد کر رہا ہوتا ہے نہ کہ مخاطب کی کہی ہوئی بات کو۔

جہاں دلیل کام نہیں کرتی

ایک سوامی جی تھے۔ انھوں نے دو مضامین میں ایم اے کیا تھا۔ ایک شخص نے سوامی جی سے پوچھا: یہ بتائیے کہ پُن اور پاپ کی تعریف کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں تم کو ایک جامع تعریف بتاتا ہوں۔ اس پر اپنے کو اور سب کو تول لو۔ وہ تعریف ان کے الفاظ میں یہ تھی:

Killing of a sensation is a sin and vice versa.

احساس کو مارنا گناہ ہے اور اسی طرح اس کے برعکس (احساس کو نہ مارنا نیکی ہے) پوچھنے والے نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ جانور کو ذبح کر کے کھاتے ہیں وہ کھلا ہوا پاپ کرتے ہیں۔ سوامی جی نے کہا اس میں کیا شک ہے۔ آدمی نے کہا: مگر وہ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ ایک جانور کو کاٹ کر ہم چالیس آدمی کھاتے ہیں اور تم لوگ چالیس سبزیوں کو کاٹتے ہو تو صرف ایک آدمی کھاتا ہے۔ اس لئے سبزی خوروں کا پاپ پھر بھی گوشت خوروں سے بڑھا ہوا ہے۔ سوامی جی نے کہا: ایسا نہیں۔ میں تم کو ایک مثال سے سمجھاتا ہوں۔ تمھارے سر پر ہزاروں بال ہیں۔ تم ان کو قینچی سے کاٹتے ہو تو کیا تکلیف ہوتی ہے۔ آدمی نے کہا نہیں۔ سوامی جی نے کہا: قینچی اگر سر کی کھال میں لگ جائے تو کیسا معلوم ہوگا۔ آدمی نے کہا: پھر تو بہت تکلیف ہوگی۔ سوامی جی نے کہا: اسی سے سمجھ لو۔ بال تمھارے زندہ جسم کا حصہ ہیں۔ مگر ان میں حساسیت صفر کے درجہ میں ہے اس لئے تم کو تکلیف نہیں ہوتی۔ جب کہ جسم کی کھال میں حساسیت پوری ہے اس لئے کھال میں قینچی لگنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ جانور میں اسی طرح احساس ہوتا ہے جس طرح تمھارے اندر احساس ہے۔ مگر پودوں میں احساس اسی طرح بدرجہ صفر ہے جس طرح تمھارے بال میں ہے، اس لئے سبزی کھانا پاپ نہیں ہے۔ جب کہ جانور کھانا پاپ ہے۔ کیونکہ جانور کو کھانے کے لئے ایک حسّاس وجود کو مارنا پڑتا ہے۔

آدمی نے کہا: گویا اس معاملہ میں آپ کے نزدیک اصل معیار احساس ہے۔ احساس ہو تو کاٹنا پاپ ہے اور احساس نہ ہو تو کاٹنا پاپ نہیں۔ سوامی جی نے کہا ہاں۔ آدمی نے کہا: آپ کو معلوم ہے کہ آج کل ایسے انجکشن تیار ہو گئے ہیں جن کو لگا دیا جائے تو احساس بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جانور کو اگر اس قسم کا انجکشن لگا دیا جائے اور اس کے بعد اس کو کاٹا جائے تو آپ کے معیار کے مطابق اس کو کاٹنا پاپ نہ ہوگا۔ سوامی جی کا چہرہ جو اس سے پہلے روشن تھا، اچانک پھیکا پڑ گیا۔ "اصل بات یہ ہے ۔ ۔ ۔ " انھوں نے کہا اور دوسری دوسری بحثیں شروع کر دیں۔ آدمی نے کہا کہ آپ اپنا موقف نہ بدلئے۔ یا تو میری بات کا جواب دیجئے یا اعتراف کیجئے کہ نیکی اور بدی کے لئے آپ کا معیار درست نہیں۔ مگر سوامی جی نے دونوں میں سے کوئی بات نہ کی۔ بلکہ دوسری دوسری بحثیں چھیڑ کر ظاہر کرتے رہے کہ ان کی بات رد نہیں ہوئی ہے۔

آدمی کسی بات کو صحیح سمجھ لے اور اس پر اس کو ایک مدت گزر جائے تو وہ اس سے اتنا زیادہ مانوس ہو جاتا ہے کہ اس کی صداقت پر یقین کرنے کے لئے اس کو دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر ایسے دلائل سامنے آئیں جو اس کی بات کو غلط ثابت کر دیں تب بھی مذکورہ عقیدہ کے ساتھ اپنی نفسیاتی وابستگی کی بنا پر اس کا یقین باقی رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ دلیل کی کاٹ خواہ اس کے پاس موجود نہ ہو مگر اس کے عقیدہ کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ـــــ دلیل اس کے لئے ہے جو دلیل پر کھلے ذہن سے غور کرے۔ جو شخص دلیل پر غور نہ کرے اس کے لئے کوئی دلیل دلیل نہیں۔

کیسا عجیب

انگریزی اخبار پیٹریاٹ (Patriot) کی ایک صحافتی ٹیم ہندستان کے مسلم مدارس کا جائزہ لینے کے لئے نکلی۔ ۸ جنوری ۱۹۸۵ کو وہ یوپی کے ایک عربی مدرسہ میں پہنچی۔ انھوں نے تفصیل کے ساتھ مدرسہ کو دیکھا۔ اس موقع پر مدرسہ کے ناظم اعلیٰ نے صحافیوں کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے بالخصوص ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ ہندستان کی جنگ آزادی کے دوران ہندستانی مسلمانوں کو برطانوی حکومت سے متنفر کرانے میں دینی مدارس نے ایک اہم اور موثر کردار ادا کیا ہے (جنوری ۱۹۸۵)

یہ بات جو لکھنے والے نے مسلم مدارس کے بارہ میں لکھی ہے وہی موجودہ زمانہ کی تمام مسلم قیادت پر صادق آتی ہے۔ ہماری قیادت نے موجودہ زمانہ میں اس راز کو نہیں سمجھا کہ دوسری قومیں ہمارے لئے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے ان قوموں کو حریف اور رقیب کی نظر سے دیکھا۔ انھوں نے ان کو خدا کے دین کا مدعو ہونے کی نظر سے نہیں دیکھا۔

مدعو ہونے کی حیثیت سے یہ قومیں ہماری محبت اور خیر خواہی کی مستحق تھیں مگر حریف اور رقیب سمجھنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ ہمارے لئے صرف نفرت کا موضوع بن کر رہ گئیں۔

کیسی عجیب ہے وہ اگلی نسل جس کے پاس فخر کرنے کے لئے یہ ہو کہ اس کی پچھلی نسل نے ان لوگوں سے نفرت کی جن کو خدا نے ان کے لئے مدعو بنا کر ان کے پاس بھیجا تھا۔ اس کے بعد اگر ان قوموں کو مسلمانوں کے دین سے نفرت ہو جائے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ جن لوگوں کے لئے ہمارے پاس نفرت کا تحفہ ہو کیا ان کے پاس ہمارے لئے محبت کا تحفہ ہوگا۔

موجودہ زمانہ کی مسلم قیادت نے بیشمار ہنگامے کھڑے کئے۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو انھوں نے اپنے بعد صرف دو چیزوں کی وراثت چھوڑی ہے ـــــــ مسلمانوں میں جھوٹا فخر اور غیر مسلموں میں جھوٹی نفرت۔

اسلام واقعۃً جس کے سینہ کے اندر سما جائے وہ اس کے اندر تواضع پیدا کرے گا نہ کہ فخر۔ اسی طرح جس کا ذہن اسلام کے زیر اثر بنا ہو وہ یک طرفہ طور پر دوسروں کا خیر خواہ بن جائے گا۔ خواہ دوسرے لوگ اس کے ساتھ جو بھی سلوک کر رہے ہوں۔

منفی بنیاد

جمال عبد الناصر (۱۹۷۰ - ۱۹۱۸) شاہ فاروق کے زمانہ میں مصر کی فوج میں ایک جونیر افسر تھے ۔ ۱۹۴۸ میں مصر اور اسرائیل کے درمیان لڑائی ہوئی ۔ اس لڑائی میں جمال عبد الناصر نے اپنے دستہ کے ساتھ غیر معمولی بہادری دکھائی ۔ تاہم اسرائیل جیت گیا اور مصر کو ذلت آمیز شکست ہوئی ۔

اس جنگ کے بعد جمال عبد الناصر کے دل میں سخت انتقامی جذبہ جاگ اٹھا۔ ایک طرف مصر کے شاہ فاروق کے خلاف ، کیوں کہ وہ ان کی نظر میں غدار تھا، دوسری طرف اسرائیل کے خلاف ، کیونکہ وہ انھیں ظالم دکھائی دے رہا تھا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ میں دونوں کو مٹائے بغیر چین نہیں لوں گا ۔

پہلے انھوں نے مصر کی فوج کے کچھ افسروں کو ساتھ لے کر ان کی ایک خفیہ تنظیم بنائی ۔ ۲۳ جولائی ۱۹۵۲ کو جمال عبد الناصر نے ان مصری افسروں کی مدد سے شاہ فاروق کے خلاف فوجی انقلاب کیا۔ شاہ فاروق جلاوطن ہو کر روم چلے گئے جہاں ۱۸ مارچ ۱۹۶۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا ۔

جمال عبد الناصر کے انتقامی جذبات کا دوسرا نشانہ اسرائیل تھا۔ انھوں نے مصر کے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد روس سے ہتھیار حاصل کیے اور دو بار اسرائیل سے جنگ کی ۔ ۱۹۵۶ میں اور ۱۹۶۷ء میں ۔ مگر دونوں بار انھیں مکمل شکست ہوئی ۔ اسرائیل نہ صرف جیتا بلکہ اس نے اپنے مقبوضہ رقبہ کو پانچ گنا بڑھالیا ۔

جمال عبد الناصر منفی اور انتقامی جذبہ کے تحت اٹھے تھے ۔ چنانچہ یہ جذبہ ان کے اوپر اتنا زیادہ چھایا کہ ان کی ساری کارروائیاں اسی کے رنگ میں رنگ گئیں ۔ انھوں نے ۱۹۶۲ میں یمن میں اپنی فوجیں داخل کر دیں ۔ انھوں نے مصر کی اخوانی جماعت کو کچلنے کی کوشش کی ۔ انھوں نے خود اپنی فوج کے بہت سے افسروں کو ہلاک کر دیا ۔ وہ اسی قسم کی منفی کارروائیوں میں مشغول رہے ۔ یہاں تک کہ ۲۸ ستمبر ۱۹۷۰ کو ان پر ہارٹ اٹیک ہوا اور اسی میں ان کا انتقال ہو گیا ۔

جو لوگ منفی سوچ اور انتقامی جذبات سے متاثر ہو کر اٹھیں وہ آخر تک اسی میں مبتلا رہتے ہیں ۔ ایسے لوگوں سے کسی مثبت پروگرام یا کسی تعمیری عمل کی امید نہیں کی جا سکتی ۔ اور بدقسمتی سے موجودہ زمانہ میں اٹھنے والے تمام مسلم رہنماؤں کا معاملہ یہی ہے ۔ وہ منفی فکر کے تحت اٹھے ، اس لیے وہ کوئی مثبت کارنامہ انجام نہ دے سکے ۔

منفی ذہن

لینن (۱۹۲۴-۱۸۷۰) کا ابتدائی گھریلو نام ولادمیر ایلیچ الیانوف تھا۔ بعد کو وہ لینن کے انقلابی نام سے مشہور ہوا۔ لینن ایک ایسے گھر میں پیدا ہوا جو سیاسی انتہا پسندی کا مزاج رکھتا تھا۔ لینن کے بڑے بھائی الگزینڈر نے روس کے بادشاہ زار کو قتل کرنے کی ایک سازش میں حصہ لیا تھا۔ مگر یہ سازش ناکام ہوئی اور لینن کے بھائی کو ۱۸۸۷ء میں پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بعد لینن کا پورا خاندان مسلسل زار کی پولیس کے عتاب کا شکار رہا۔

محبوب بھائی کی پھانسی کا واقعہ لینن کے خون کو گرم کئے ہوئے تھا۔ زار سے نفرت اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی۔ تاہم بھائی کے انجام کو دیکھ کر اس نے جان لیا تھا کہ شہنشاہ روس کو قتل کرنے کی انفرادی کوشش بے فائدہ ہے کوئی اجتماعی اور تنظیمی طاقت ہی اس کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ اور کارل مارکس کے نظریات کی صورت میں اس کو اپنی طلب کا جواب مل گیا۔

100 Great Modern Lives, by John Canning,
Century Books Ltd., London, 1972, p. 349

یونیورسٹی کی تعلیم کے زمانہ میں لینن کو یہ موقع ملا کہ وہ کارل مارکس کے خیالات سے آگاہ ہو۔ اس کے بعد وہ مزید تعلیم کے لئے جنیوا گیا۔ وہاں اس کو کافی سوشلسٹ لٹریچر ملا۔ طبعی طور پر مارکس کے خیالات میں لینن کو بے حد دلچسپی ہوئی۔ مارکس کا فلسفہ نہ صرف لینن کے قابل نفرت دشمن (زار) کو پوری طرح غلط ثابت کر رہا تھا بلکہ وہ اس پورے نظام کو جڑ سے اکھاڑنے کا جواز فراہم کر رہا تھا جس میں زار کو بڑائی کا مقام حاصل تھا۔ لینن کو مارکسی سوشلزم میں زار کے خلاف سیاست کے لئے فکری بنیاد مل رہی تھی۔ چنانچہ اس نے دل و جان سے اس کو قبول کر لیا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنی ذاتی نفرت کے تحت عمل کرتا ہے۔ مگر وہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ محبت انسانی یا اطاعت خداوندی کے لئے متحرک ہوا ہے۔ آدمی کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے۔ وہ باہر سے ایک طرح کا انسان دکھائی دیتا ہے اور اندر سے بالکل دوسری طرح کا انسان ہوتا ہے۔ اس کا فکر محض ردعمل ہوتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ اس کا فکر مثبت طور پر بنا ہے۔

خودفریبی

بہت سے لوگوں کو آپ دیکھیں گے کہ وہ کسی کو "شہید" کا لقب دے کر اس کی دھوم مچا رہے ہیں۔ اگر آپ ان صاحب کو شہید کے بجائے مقتول کہہ دیں تو وہ آپ سے اس طرح بگڑ جائیں گے جیسے کہ نعوذ باللہ آپ نے خدا کی شان میں کوئی گستاخی کر دی ہے۔ حالانکہ خود ان لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنے لئے اور اپنے بچوں کے لئے ایسی زندگی کو پسند کئے ہوئے ہوں گے جس کا شہادت اور قربانی سے کوئی تعلق نہیں۔

بہت سے لوگوں کو آپ دیکھیں گے کہ وہ کسی کو "بزرگ" بنا کر اس کی بزرگی کی جھوٹی کہانیاں خوب بیان کریں گے۔ اگر آپ ان بزرگ کے ساتھ مصنوعی القاب نہ لکھیں یا ان کا نام ایک عام آدمی کی طرح لے لیں تو وہ آپ پر اس طرح برس پڑیں گے جیسے کہ آپ نے کسی حرام فعل کا ارتکاب کر دیا ہے۔ مگر یہ سب کچھ صرف الفاظ کی دنیا میں ہوگا۔ عملاً ان لوگوں کا اپنا حال یہ ہوگا کہ ان کی زندگی ان اوصاف سے ضروری حد تک بھی خالی ہوگی جن کو وہ اپنے مفروضہ بزرگوں میں مبالغہ آمیز حد تک ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

یہ بظاہر غیر پرستی ہے۔ مگر حقیقۃً یہ خود پرستی کی بدترین قسم ہے۔ یہ کسی کی بڑائی کے نام پر اپنے آپ کو بڑا بنانے کی کوشش ہے۔ یہ دوسرے کی شہادت اور قربانی کا قصیدہ پڑھ کر اپنے آپ کو شہیدوں کی صف میں کھڑا کرنا ہے۔ یہ دوسروں کی بزرگی کا چرچا کر کے اپنے آپ کو بزرگوں کے زمرہ میں داخل کرنا ہے۔ یہ کچھ مسلّم شخصیتوں کو نمایاں کر کے ان کی فہرست کمال میں اپنا اندراج کرنا ہے۔ یہ اس نفسیات کو تسکین دینا ہے کہ ـــــ ہم خود بڑے نہیں، مگر ہم کو بڑوں سے نسبت تو حاصل ہے۔ حالانکہ اس قسم کی نسبت کی خدا کے یہاں کوئی حقیقت نہیں۔

جو لوگ ایسا کرتے ہیں انھیں شاید یہ معلوم نہیں کہ یہ دنیا حقائق کی دنیا ہے نہ کہ مفروضات کی دنیا۔ اس دنیا میں ہر آدمی حقیقت کے پیمانہ سے ناپا جا رہا ہے۔ ہر آدمی وہ ہے جو حقیقت واقعہ کی نسبت سے وہ قرار پائے نہ کہ وہ جو وہ خودساختہ مفروضات کے خانہ میں ظاہر ہو۔ بڑوں کی مدح خوانی سے کوئی بڑا نہیں ہو جاتا۔ بڑا وہ ہے جو حقیقت واقعہ کی نظر میں بڑا ہو۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے: لیس للانسان الا ما سعیٰ۔

سرکشی

ایک لطیفہ ہے۔ ایک مسجد کے امام صاحب تھے۔ ان کے گھر پر محلہ کے بنیا کے یہاں سے سامان آیا کرتا تھا۔ گھر والے قرض پر سامان منگاتے رہے یہاں تک کہ رقم زیادہ ہو گئی۔ بنیا نے کہا کہ پہلے پچھلا قرض ادا کرو اس کے بعد اور سامان لے جاؤ۔

امام صاحب بنیا کی اس گستاخی پر خفا ہو گیے۔ جمعہ کے روز جب محلہ کے تمام لوگ مسجد میں جمع تھے، امام صاحب نے کہا کہ بھائیو، میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں اس کو سنو۔ تمہارے محلہ کا بنیا کافر و مشرک ہے۔ آپ میں سے کوئی شخص اس کے یہاں سے سامان نہ خریدے۔ اس کے بعد انھوں نے قرآن و حدیث کے نصوص پیش کیے اور کہا کہ ان آیتوں اور حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص کافر و مشرک ہو اس سے معاشی تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے اٹھ کر کہا "امام صاحب، بنیا تو ۲۵ برس سے یہاں دکان کر رہا ہے، پھر آج ہی یہ مسئلہ آپ کیوں بیان کر رہے ہیں"۔ امام صاحب نے بگڑ کر کہا تم کافروں کے ساتھی ہو اس لیے تمہارا بھی بائیکاٹ ہونا چاہیے۔

امام صاحب نے بظاہر قرآن و حدیث کے حوالے دیئے تھے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس خاص معاملہ میں خود امام صاحب غلطی پر تھے نہ کہ بنیا۔ اس معاملہ میں اصل اور بنیادی بات صرف یہ تھی کہ امام صاحب کے اوپر بنیا کا حق تھا جس کو انھیں ادا کرنا چاہیے تھا۔ اس کے سوا امام صاحب نے جو باتیں کہیں وہ سب اصل مسئلہ کی نسبت سے غیر متعلق (Irrelevant) تھیں۔

یہی معاملہ آج کل مسلم معاشرہ کا ہو رہا ہے۔ ایک مسلمان دوسرے شخص کا حق مارے گا۔ اور جب حق دار اس سے اپنے حق کا مطالبہ کرے گا تو وہ حق دار کو اس کا حق لوٹانے کے بجائے یہ کرے گا کہ وہ اس کو طرح طرح سے بدنام کرنا شروع کر دے گا۔ حالاں کہ یہ سب غیر متعلق باتیں ہیں۔ مذکورہ مسلمان کو سب سے پہلے غصب شدہ حق لوٹانا چاہیے۔ اس کے بعد ہی وہ مزید جو کچھ کہنا چاہتا کہہ سکتا ہے۔ حق غصب کرنا غلطی ہے۔ اور غصب کرنے کے بعد صاحب حق کے خلاف بدنامی کی مہم چلانا غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ یہ آدمی کے جرم کو بڑھاتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اس کے جرم کو کم نہیں کرتا۔

پیغمبر کو ماننا

لوئی بونیل (Luise Bumule) فرانس کا مشہور فلم پروڈیوسر ہے۔ وہ ۱۹۰۰ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۹۸۳ میں وفات پائی۔ ابتداءً اس کو مسیحیت کی تعلیم دی گئی۔ اس کے بعد وہ فلمی صنعت میں داخل ہو گیا۔

گارجین، اگست ۱۹۸۳ میں اس کے کچھ خیالات شائع کئے گئے ہیں۔ اس نے کہا کہ آج بے شمار لوگ مسیحی ہیں۔ مگر وہ اضافی طور پر مسیحی ہیں نہ کہ حقیقی طور پر۔ حضرت مسیح اگر آج زمین پر واپس آئیں تو ان کے ماننے والے دوبارہ ان کو سولی پر چڑھا دیں گے:

If Christ came back, they'd crucify Him all over again

لوئی بونیل کی یہ بات صدفی صد درست ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مروجہ مسیحیت حضرت مسیح کے لائے ہوئے مذہب سے اتنی مختلف ہے کہ آج اگر حضرت مسیح زندہ ہوں تو خود ان کے ماننے والے انھیں برداشت نہ کریں۔

تاہم مسلمانوں کا حال بھی اس معاملہ میں ان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ آج دنیا بھر میں تقریباً ایک ارب مسلمان ہیں جو محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے معتقد ہیں اور ان کے نام پر لڑنے مرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ مگر ان مسلمانوں کا سارا جوش محمدؐ کی تاریخ سے ہے نہ کہ خود محمدؐ سے۔ وہ "محمد" جس کے ساتھ تاریخ شامل نہ ہو وہ موجودہ مسلمانوں کے لئے بھی اتنا ہی اجنبی ہے جتنا وہ اپنے ہم زمانہ لوگوں کے لئے تھا۔

محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پچھلے چودہ سو سال میں عظمت کی جو روایات جمع ہو چکی ہیں۔ اگر آپ کی ذات سے ان کو ہٹا دیا جائے اور آپ دوبارہ اسی ابتدائی حالت میں ظاہر ہوں جیسا کہ آپ قدیم مکہ میں ظاہر ہوئے تھے تو مجھے اپنے علم و تجربہ کی حد تک یقین ہے کہ مسلمانوں میں آپ کو پہچاننے والے اتنے بھی نہ نکلیں گے جتنی ایک آدمی کے ہاتھ میں انگلیوں کی تعداد ہوتی ہے۔

مسلم اداروں میں جس محمد کی دھوم ہے وہ تاریخی محمد ہیں نہ کہ وہ محمد جو تاریخ بننے سے پہلے تھے۔ تاریخ بننے سے پہلے والے محمد اگر آج ان اداروں میں آجائیں تو ان کو نہ کوئی ادارہ شیخ التفسیر بنائے اور نہ شیخ الحدیث۔ ان کو نہ کسی جلسہ کی صدارت ملے اور نہ کسی جماعت کی امارت۔ مسلمانوں کی بستی سے وہ اسی طرح بے رحمی کے ساتھ نکال دئے جائیں جس طرح مکہ والوں نے اپنے زمانہ کے محمدؐ کو نکال دیا تھا۔ قدیم مکہ والے محمدؐ کو پانے کے لئے جوہر کی بنیاد پر قدر دانی درکار ہے اور مسلمان آج اس صفت سے محروم ہیں۔

یہ قیادت ہے، خدمت نہیں

کسی کو ناحق ستانا، کسی کو بلا وجہ بے عزت کرنا اس زمین پر سب سے بڑا ناقابل معافی جرم ہے۔ جو لوگ ایسا جرم کریں وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ ایسے جرم کی سزا ان کو اس دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لئے سخت عذاب ہے، خواہ وہ بزعم خود اپنے کو کتنا ہی بڑا مسلمان سمجھتے ہوں۔ کتنی سنگین ہے یہ صورت حال۔ اس کے باوجود آدمی دوسرے کو ناحق ستاتا ہے، وہ بلا وجہ دوسرے کو بے عزت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی براہ راست یا بالواسطہ طور پر اس جرم میں شریک رہتے ہیں جو اسی نام پر اپنی قیادت قائم کئے ہوئے ہیں کہ وہ خدا کی زمین کو ظلم و فساد سے پاک کرنے کے لئے اٹھے ہیں۔ شاید لوگوں کو معلوم نہیں کہ "عدل" کے الفاظ بولنا اور "ظلم" پر عمل کرنا اللہ کی نظر میں آدمی کے جرم کو بڑھاتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اس کے جرم کو کم نہیں کرتا۔ کوئی آدمی عادل ہے یا ظالم، اس کا فیصلہ آدمی کے حقیقی عمل کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ بولے اور لکھے ہوئے الفاظ کی بنیاد پر۔ مزید یہ کہ ظالم صرف وہ نہیں ہے جس نے اپنے ہاتھوں سے ظلم کیا۔ بلکہ وہ لوگ بھی یکساں طور پر ظالم ہیں جنھوں نے ظالم کو شہ دی ہو، جنھوں نے قدرت کے باوجود ظالم کا ہاتھ نہ پکڑا ہو، جو ظالم کے ظلم کو دیکھنے اور جاننے کے باوجود اس پر راضی رہے ہوں۔ اللہ کے یہاں یہ سارے لوگ ایک ساتھ اٹھائے جائیں گے۔ آخرت میں ان میں سے ایک کا جو انجام ہوگا وہی انجام ان میں سے دوسرے کا بھی ہوگا

"بہت سے شاعر اپنے اشعار میں انسان دوست ہوتے ہیں، مگر ان کو زید، عمر، بکر سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی"

یہ بات جو ادبی ناقد نے شاعروں کے بارے میں کہی ہے، وہی ہمارے قائدین کے بارے میں صد فی صد درست ہے۔ ہمارا ہر قائد ملت کی ہمدردی کی باتیں کرتا ہے۔ وہ ملت کے مسائل پر تقریریں کرتا ہے اور بیان دیتا ہے۔ کہیں فساد ہو جائے تو فوراً ہوائی جہاز سے اڑ کر وہاں حالات کا جائزہ لینے کے لئے جاتا ہے۔ ملی مسائل کے بارے میں حکومت کے ذمہ داروں سے ملاقاتیں کرتا ہے اور بڑے بڑے اجتماعات میں ان کی بابت تجویزیں پاس کرتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ جس ملت کے بارے میں ہوتا ہے، اسی ملت کا ایک فرد اگر اس سے ہمدردی اور انصاف کی مانگ کرے تو اس کو سخت مایوسی ہوتی ہے۔ وہ "ملت" پر قربان ہونے کے لئے تیار ہے مگر "فرد" کو اس کا حق دینے کے لئے تیار نہیں۔ جمشید پور کے فساد کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ ایک لیڈر اپنے مکان سے باہر نکلا تو اس کے محلہ کا ایک آدمی اس کے سامنے آگیا۔ اس آدمی کو لیڈر کے کارندے نے پریشان کر رکھا تھا۔ آدمی نے اس کی شکایت کی اور صورت حال بتائی۔ مگر لیڈر نے پوری بات سننے کی زحمت نہیں کی۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا "مجھے اس وقت کی فلائٹ سے جمشید پور جانا ہے" لیڈر ہوائی جہاز کے ذریعہ جمشید پور پہنچا۔ اگلے دن "بذریعہ ٹیلیفون" موصول شدہ خبر اس کے اپنے اخبار میں چھپی کہ لیڈر محترم نے جمشید پور کا دورہ کیا اور وہاں اقلیتی فرقہ کے ساتھ جو بربریت کی گئی ہے اس کے سلسلے میں حکام سے ملاقاتیں کیں" —— یہی ہمارے تمام لیڈروں کا حال ہے۔ ملت پر فدا ہونے کے لئے ہر شخص بے قرار ہے مگر فرد ملت پر فدا ہونے کی فرصت کسی کو نہیں "اڑتے" کی سطح پر ہر آدمی مظلوموں کا ہمدرد ہے مگر "کرنے" کی سطح پر کوئی مظلوموں کا ہمدرد نہیں۔ (۸ اپریل ۱۹۸۰)

یہ فرق کیوں

ملک کے کسی شہر میں فرقہ وارانہ فساد کی خبر معلوم ہو تو تمام مسلم لیڈر اچانک جاگ اٹھتے ہیں۔ کوئی پرشور بیان دیتا ہے۔ کوئی جوشیلی تقریر کرتا ہے، کوئی حکومت کے ذمہ داروں سے ملاقات کے لئے دوڑ پڑتا ہے۔ کوئی ریلیف فنڈ قائم کرکے چندہ جمع کرنا شروع کردیتا ہے۔ کوئی باہر کے دورہ پر ہو تو وہ اپنا بیرونی دورہ مختصر کرکے فوراً ہوائی جہاز سے واپس آجاتا ہے تاکہ مصیبت زدگان کی مدد کرسکے۔

مگر یہی مسلم لیڈر جو اجتماعی فساد میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے اتنی تیزی دکھاتے ہیں، وہ انفرادی فساد کے موقع پر بالکل بے حس بنے رہتے ہیں۔ ان کے اپنے شہر میں ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو ستا رہا ہو یا کوئی مسلمان خود ان کی اپنی فساد انگیزی کا شکار ہو رہا ہو تو ایسے موقع پر ان سے کی گئی ہر فریاد صدا بہ صحرا ثابت ہوتی ہے۔ قوم کے ظلم پر بے چین ہو جانے والے لوگ فرد کے ظلم پر اس طرح بے حس و حرکت بنے رہتے ہیں جیسے ان کے سینہ میں دل نہیں بلکہ خشک پتھر ہے۔ وہ انسان نہیں بلکہ ایک ایسی مخلوق ہیں جو رحم اور ہمدردی اور انصاف جیسی چیزوں سے آشنا ہی نہیں۔

یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ ان لیڈروں کی تمام سرگرمیاں اپنے قیادتی مصالح کے تحت ہیں نہ کہ خدا کو خوش کرنے کے لئے۔ اگر ان کو خدا کی خوشنودی عزیز ہو، اگر وہ آخرت کی پکڑ سے ڈرتے ہوں تو وہ ہر ظلم پر تڑپ اٹھیں گے۔ ہر شخص کی مصیبت میں اس کے کام آنے کی کوشش کریں گے۔ مگر ان کے دل میں خدا اور آخرت جیسی چیزوں کا کوئی خانہ نہیں۔ ان کو تو صرف اپنی قیادت عزیز ہے اور قیادت ہمیشہ عوامی شہرت کے واقعات میں حصہ لینے سے چمکتی ہے نہ کہ انفرادی مصیبت میں کسی کے کام آنے سے۔ پھر کسی فرد کو مصیبت سے نکالنے کے لئے وہ کیوں اپنی جان کھپائیں۔ بے فائدہ طور پر کس لئے اس میں اپنا وقت ضائع کریں۔

اِس کا سبب

قدیم زمانہ میں جن لوگوں نے پیغمبروں کی مخالفت کی، انھوں نے لوگوں کو دو قسموں میں بانٹ رکھا تھا۔ اراذل (ہود ۲۷) اور اعاظم (الزخرف ۳۱)۔ ان کی تقسیم میں جو لوگ اراذل تھے انھیں میں سے کچھ افراد نے پیغمبروں کا ساتھ دیا۔ اور جن لوگوں کو قوم نے اعاظم کا درجہ دے رکھا تھا، وہ پیغمبروں کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ ہوئے۔

مگر بات صرف اتنی ہی نہ تھی۔ مزید ان کا حال یہ تھا کہ اعاظم کی صف کا کوئی آدمی اگر پیغمبروں کو مان کر اس کا ساتھی بن جاتا تو فوراً ہی وہ قوم کی نظروں سے گر جاتا، وہ اپنی عظیم ہونے کی حیثیت کو کھو دیتا تھا۔ مثال کے طور پر ابوبکر بن ابی قحافہ مکہ کے گروہ اعاظم سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر جب وہ پیغمبر کے ساتھی بن گئے تو مخالفین نے ان کو مجنون بن ابی قحافہ کہنا شروع کر دیا۔ اسی طرح عبداللہ بن سلام یہودیوں کے بڑے عالم تھے، مگر جب انھوں نے آپ کا ساتھ دیا تو یہودیوں نے کہا کہ وہ جاہل بن سلام ہیں۔ وغیرہ

قدیم مکہ کے لوگ مکہ کے ولید بن مغیرہ اور طائف کے ابومسعود کو نعوذ باللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں عظیم سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ کو اگر اپنی کتاب اتارنا تھا تو ان اعاظم کے اوپر اس کو کیوں نہیں اتارا (الزخرف ۳۱)

ان کی اس سوچ کا سبب کیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک غیر رواجی مذہب لے کر اٹھے تھے۔ اور ان کے اپنے سرداروں کا معاملہ یہ تھا کہ وہ وقت کے مروجہ مذہب کے نمائندہ بنے ہوئے تھے۔ رسول اللہ کا مذہب اس وقت ایک نیا مذہب تھا اور اہل مکہ کا مذہب قدیم مذہب۔ رسول اللہ کے مذہب کی پشت پر ابھی صرف دلیل کی طاقت تھی، جب کہ اہل مکہ کے مذہب کی پشت پر سیکڑوں سال کی روایات کا وزن شامل تھا۔ چنانچہ ایک فریق انھیں مذہب اکابر پر دکھائی دیتا تھا اور دوسرا فریق مذہب اصاغر پر۔

انسان کا یہ مزاج ہے کہ قدیم اس کی نظر میں عظیم بن جاتا ہے۔ یہی انسانی مزاج تھا جس نے مذکورہ بالا مسئلہ پیدا کیا۔

جڑ کی بات

۱۸ اپریل ۱۹۸۹ کا واقعہ ہے۔ میری ملاقات ڈاکٹر عبد السلام صاحب سے ہوئی۔ وہ پچھلے ۲۵ سال سے امریکہ (Tel. 312-267-4740) میں رہتے ہیں۔ وہاں وہ شکاگو کی نارتھ ایسٹرن یونی ورسٹی میں میتھمیٹکس کے پروفیسر ہیں۔

سلمان رشدی کے مسئلہ پر گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ مارچ ۱۹۸۹ میں ان کی یونیورسٹی میں "رشدی افیئر" پر ایک سیمینار کیا گیا۔ یونی ورسٹی کے مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن نے اس سیمینار کا انعقاد کیا تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ کہا، اس کا ایک جزء ان کے الفاظ میں یہ تھا:

A student in the meeting exclaimed that Rushdie should be killed for his crime. I reminded him that everybody should be serious when speaking. If he really believed that it is his duty to kill Rushdie, by now he would have been in London, and not here talking about it.

ایک مسلمان طالب علم نے اس میٹنگ میں پُرجوش طور پر کہا کہ رشدی کو شتمِ رسول کے جرم میں قتل کرنا ضروری ہے۔ میں نے طالب علم کو یاد دلایا کہ ہر آدمی کو اپنے قول میں سنجیدہ ہونا چاہیے۔ اگر واقعۃً وہ یقین رکھتا ہے کہ یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ رشدی کو قتل کر دے تو اس وقت اُس کو لندن میں ہونا چاہیے نہ کہ وہ یہاں رہ کر صرف قتل کی باتیں کر رہا ہو۔

یہ واقعہ علامتی طور پر ایک بہت بڑی خرابی کو بتاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی وہ کون سی کمزوری ہے جس نے ان کا یہ حال کر رکھا ہے کہ ان کے یہاں قول کے ہنگامے تو احتساب عالم کی سطح پر جاری ہیں۔ مگر عمل کی سطح پر ابھی تک احیار ملّت کی ابتدائی بنیاد بھی قائم نہ کی جا سکی۔

یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ عام طور پر اسی کمزوری میں مبتلا ہے۔ وہ کہتا ہے مگر وہ کرتا نہیں۔ وہ قوال ہے مگر وہ فعال نہیں۔ مگر جس قول کے ساتھ عمل شامل نہ ہو وہ گناہ ہے نہ کہ کوئی مطلوب عمل۔

اپنے اپنے شیشہ میں دیکھنا

پوڑی گڑھوال ایک پہاڑی علاقہ ہے۔ ریتا سنہا اپنے شوہر کے ساتھ یہاں رہتی ہیں۔ ان کی نسبتی ماں (ساس) ان کے یہاں آئیں اور ریتا سنہا کے مکان میں اپنے لڑکے اور بہو کے ساتھ رہنے لگیں۔ بوڑھی خاتون کو جانوروں کا شوق تھا۔ ایک روز ان کو پاس کے جنگل میں بلی کے تین بچے مل گئے وہ ان کو اپنی شال میں لپیٹ کر اٹھا لائیں اور ان کو پالنا شروع کیا۔ وہ اکثر ان کو اپنے ساتھ لئے رہتیں۔ کچھ دنوں کے بعد خاتون نے اپنی بہو سے کہا کہ میرے لئے ایک آتشیں شیشہ (Magnifying Glass) لا دو۔ خاتون کی فرمائش کے مطابق ان کو شیشہ فراہم کر دیا گیا۔

پوڑی گڑھوال میں ایک نیشنل پارک ہے جس میں شیر وغیرہ پالے گئے ہیں۔ اس سے پہلے خاتون اکثر پارک میں جانے اور شیر کو دیکھنے کا شوق ظاہر کرتی تھیں۔ مگر بلیاں اور آتشیں شیشہ مل جانے کے بعد ان کا شوق ٹھنڈا پڑ گیا۔ ان کے لڑکے ایک روز دفتر سے کچھ پہلے آ گئے اور بتایا کہ آج میں نے آدھے دن کی چھٹی لے لی ہے۔ آج ماں کو لے کر پارک میں چلنا ہے تاکہ وہ شیر وغیرہ دیکھ سکیں۔ ریتا سنہا خاتون کے کمرہ میں گئیں تاکہ ان کو یہ خوش خبری پہنچائیں۔ مگر خاتون نے اس خبر سے کوئی دلچسپی نہ لی۔ وہ اس وقت آتشیں شیشہ کے ذریعہ اپنی بلیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا: میرے آتشیں شیشہ میں یہ بلیاں بڑی ہو کر مجھ کو شیر کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ مجھ کو یہ سوچ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ میں خوبصورت شیروں کے درمیان ہوں۔ میں کسی پارک یا کسی چڑیا گھر جانا نہیں چاہتی۔ کیوں کہ وہاں میں شیر کو صرف دور سے دیکھوں گی۔ یہاں میں ان کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ (ٹائمس آف انڈیا ۳۱ دسمبر ۱۹۷۹)

یہ ایک بوڑھی معمولی تعلیم یافتہ خاتون کا قصہ ہے۔ مگر یہی ہمارے اکثر بڑے بڑے پڑھے لکھوں پر صادق آتا ہے۔ آج اکثر لوگوں کا یہ حال ہے کہ انھوں نے اپنی پسند کا ایک "آتشیں شیشہ" خرید رکھا ہے جس میں خارجی حقیقتیں ان کو ویسی ہی دکھائی دیں جیسا کہ وہ ان کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ کوئی بلی کو شیر کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے تو اس نے بڑھا کر دکھانے والا شیشہ حاصل کر لیا ہے۔ کوئی ہاتھی کو چیونٹی کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے تو اس نے ایسا شیشہ حاصل کر لیا ہے جس میں بڑی بڑی چیزیں بھی بہت چھوٹی ہو کر دکھائی دیں۔ حتیٰ کہ لوگوں کو ایسے شیشے بھی ہاتھ آ گئے ہیں جن میں معنوی حقائق کی صورتیں بھی بدل کر دکھائی دیتی ہیں۔ کسی کے شیشہ میں اس کا اپنا وجود ہمالیہ پہاڑ کی مانند بلند اور دوسرے کا وجود راستہ میں پڑے ہوئے پتھر کی طرح بے قیمت دکھائی دیتا ہے۔ کسی کے شیشہ میں اپنی موشگافیاں طاقت ور دلائل کی صورت میں نظر آتی ہیں اور دوسرے کے دلائل محض بے معنی الفاظ کا مجموعہ بن جاتے ہیں۔ کوئی اپنے شیشہ میں اپنے کام کو دیکھتا ہے تو وہ اس کو عالمی سیلاب کی طرح دکھائی دیتا ہے اور جب وہ دوسرے کے کام کو دیکھتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ کسی کے شیشہ میں اس کی اپنی ہر بات صحیح اور دوسرے کی ہر بات غلط نظر آتی ہے۔ ہر آدمی کے "شیشہ" نے اس کے لئے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ چیزیں اس کو ویسی ہی دکھائی دیں جیسا کہ وہ ان کو دیکھنا چاہتا ہے نہ کہ ویسی جیسا کہ وہ حقیقۃً ہیں۔ کوئی چیز باعتبار اصل خواہ کچھ ہو، دیکھنے والے کو وہ اس کی اپنی پسند کے مطابق ہی نظر آتی ہے ——— خوش قسمتی کی یہ قسم بھی کیسی عجیب ہے۔

جب گفتگو بے نتیجہ ہو کر رہ جائے

دو آدمیوں کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک شخص نے کہا: "بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ان کو صرف محسوس کر سکتے ہیں، ان کو الفاظ کی صورت میں متعین نہیں کر سکتے۔ مثلاً گڑ اور شکر کو لیجئے۔ چکھ کر ہر آدمی محسوس کر سکتا ہے کہ گڑ کا مزہ کیا ہے اور شکر کا مزہ کیا۔ لیکن اگر دونوں کے مزے کے فرق کو لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو آپ ان کو بیان نہیں کر سکتے۔" دوسرا آدمی فوراً بولا: "مجھے دونوں کا فرق معلوم ہے۔" اس کے بعد اس نے دونوں کے طبی اور غذائی فرق پر تقریر شروع کر دی "شکر کی تاثیر ٹھنڈی ہے اور گڑ کی تاثیر گرم ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

ظاہر ہے کہ اس قسم کی معلومات کی ایک انسائیکلو پیڈیا بھی تیار ہو جائے تو وہ گڑ اور شکر کے مزہ کے فرق کو لفظوں میں متعین نہ کر سکے گی۔ مگر مذکورہ بزرگ نے مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی مسکراہٹ کا لحاظ کئے بغیر اپنی تقریر جاری رکھی۔

کسی گفتگو کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کچھ باتیں پہلے سے جانتا ہو اور ان کو تسلیم کرتا ہو۔ اگر آپ کا مخاطب ایسا ہو کہ وہ نہ تو ضروری باتوں کو جانے اور نہ ان کو تسلیم کرے تو آپ اپنی گفتگو کو کسی حقیقی نتیجہ تک پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

کبھی آدمی اپنے خیالات میں اتنا گم ہوتا ہے کہ دوسرے کی بات اس کے ذہن میں داخل نہیں ہوتی۔ اس کو سن کر وہ ایسے عجیب و غریب انداز میں اس کا جواب دیتا ہے جیسے اس نے کہنے والے کے اصل مدعا کو سمجھا ہی نہ ہو۔ ٹرین چل رہی تھی۔ ڈبہ کے ایک مسافر نے اپنا سگار سلگایا۔ سامنے بیٹھی ہوئی عورت نے اس کی طرف دیکھا اور نرمی سے کہا: "تمبا کو کے دھوئیں سے میری طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔" مسافر نے اطمینان سے عورت کی بات سنی اور اس کے بعد گہرا کش لیتے ہوئے بولا: "محترمہ! ایسی حالت میں تو میں آپ کو یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ آپ تمبا کو نوشی نہ کیا کریں۔" خاتون کا مقصد یہ تھا کہ مسافر ڈبہ کے اندر تمبا کو نوشی نہ کرے۔ مگر مسافر نے خود خاتون کو تمبا کو نوشی نہ کرنے کی تلقین شروع کر دی۔ جب بھی آپ کسی کی بات کا جواب دے رہے ہوں تو سب سے پہلے آپ کو بے لاگ طور پر یہ جاننے کی کوشش کرنا چاہئے کہ کہنے والے نے کیا کہا ہے۔ اس کے بعد ہی آپ اس کی بات کا صحیح جواب دے سکتے ہیں۔ اچھی طرح سمجھے بغیر جو جواب دیا جائے وہ خود اپنے ذہن کی بات کا جواب ہوتا ہے نہ کہ مخاطب کی کہی ہوئی بات کا جواب۔

ایک صاحب نے کہا: "الرسالہ کی غلطی اسی سے واضح ہے کہ اس نے اپنا نام الرسالہ رکھا ہے۔" ان کے نزدیک الرسالہ کا مطلب تھا "سب سے اچھا رسالہ"۔ اور ظاہر ہے کہ جو اپنے کو سب سے اچھا کہے وہ یقیناً سب سے زیادہ برا ہے۔ ان کو بتایا گیا کہ الرسالہ اردو "رسالہ" کے معنی میں نہیں ہے۔ یہ عربی لفظ ہے اور اس کے معنی پیغام (The Message) کے ہیں۔ مگر وہ بدستور بحث کرتے رہے۔ وہ صرف اردو "رسالہ" سے آشنا تھے پھر عربی "الرسالہ" ان کے ذہن کا جزء کس طرح بنتا۔ عربی الرسالہ کو سمجھنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔ اور اپنی غلطی کا اعتراف کرنا وہ مشکل ترین کام ہے جہاں بڑے بڑے پہلوان بھی بے بس ثابت ہوتے ہیں۔

مفاد پرستی

ایک لطیفہ ہے کہ امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر جب یروشلم گیے تو اس وقت کے اسرائیلی وزیر اعظم مناہن بیجن ان کو دیوار گریہ کے پاس لے گیے جو یروشلم میں یہودیوں کی مقدس ترین جگہ ہے۔ وہاں جمی کارٹر نے دعا کرتے ہوئے کہا اے خدا عربوں کو اور اسرائیل کو امن تک پہونچنے میں مدد کر۔" بیجن نے کہا "آمین"۔ اس کے بعد کارٹر نے دعا کی کہ خدایا، مصریوں کو اور اسرائیل کو پُرامن طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی توفیق دے۔ بیجن نے کہا "آمین"۔ اس کے بعد جمی کارٹر نے دعا کی کہ خدایا، اسرائیلیوں کو بتا دے کہ وہ عربوں کو وہ تمام علاقے واپس کر دیں جن پر انھوں نے ۱۹۶۷ کی جنگ میں قبضہ کیا ہے۔ یہ سن کر بیجن نے کہا "جناب صدر، میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آپ ایک دیوار کو خطاب کر رہے ہیں":

When former US president Carter visited Jerusalem, Israel's Prime Minister Begin took him to the Wailing Wall. "Oh God," Carter prayed, "please help the Arabs and Israelis to find peace."
"Amen," said Begin.
"And please, God, let the Egyptians and Israelis live in peaceful co-existence."
"Amen," said Begin.
"And please tell the Israelis to return to the Arabs all the territories they occupied in the 1967 War."
"I would like to remind you, Mr President," said Begin, "that you are talking to a wall."

Reader's Digest, May 1981

یہ صرف اسرائیلی وزیر اعظم کا لطیفہ نہیں، یہی موجودہ زمانہ کے تمام انسانوں کی تصویر ہے۔ لوگ انصاف کی باتیں کرتے ہیں مگر اس سے مراد صرف وہ انصاف ہوتا ہے جس کا فائدہ ان کی اپنی ذات کو مل رہا ہو، جو انصاف ان کی اپنی ذات کے خلاف فیصلہ دے اس سے لوگوں کو کوئی دلچسپی نہیں۔ لوگ دعاؤں پر آمین کہتے ہیں مگر ان کی آمین صرف اس دعا کے لیے ہوتی ہے جس کی زد دوسروں پر پڑ رہی ہو، جس دعا کی زد خود ان کے اپنے اوپر پڑے اس دعا کے اوپر کوئی آمین کہنے والا نہیں۔ لوگ حق پرستی کی باتیں کرتے ہیں مگر ان کی حق پرستی کا مطلب دوسروں پر اپنے حقوق ثابت کرنا ہے، جو حق انھیں ان کی اپنی ذمہ داریاں یاد دلائے اس حق کا آج کی دنیا میں کوئی خریدار نہیں۔

کوئی معیار نہیں

ٹام آلٹر (Tom Alter) ایک امریکی نژاد ہندستانی ایکٹر ہیں۔ ہندستان میں لمبے قیام کی وجہ سے وہ اردو سے بخوبی واقف ہوگئے ہیں۔ انھوں نے ایک انٹرویو میں اپنے بارہ میں کہا کہ میں رواں اردو بولتا ہوں۔ کیوں کہ میرا گھر مسوری میں ہے اور مسوری میں ہر آدمی اردو بولتا ہے، اردو جاننا میرے فلمی پیشہ میں میرے لئے واقعۃً مددگار ثابت ہوا ہے (ہندستان ٹائمس ۱۵ جنوری ۱۹۸۴)

ٹام آلٹر نے کہا کہ میں امریکہ کے مقابلہ میں ہندستان میں فلمی کام کرنا پسند کرتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ میں کوئی فلم اگر فنی حیثیت سے معیار کے مطابق نہیں ہے تو فلم ناکام ہو جائے گی۔ مگر ہندستان میں اگر فلم فنی حیثیت سے خراب ہو تب بھی فلم چل جاتی ہے۔ ایک خراب فلم کے ذریعہ بھی یہاں دولت کمائی جا سکتی ہے:

> In America, if the technique is not upto standard, the film flops. But here in India even if the technique is bad, the film runs. A bad film also makes money here.

مغربی ملکوں میں ہر چیز کی معیار بندی (Standardisation) ہوگئی ہے۔ جو چیز معیار سے کم ہو وہ لوگوں کے درمیان قبولیت حاصل نہیں کرتی۔ اس کے برعکس ہندستان اور اس قسم کے دوسرے ملکوں میں معیار بندی نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے ان ملکوں میں ہر چیز چل جاتی ہے خواہ وہ معیار کے مطابق ہو یا معیار کے مطابق نہ ہو۔

مسلم دنیا کا حال اس معاملہ میں شاید سب سے زیادہ خراب ہے۔ مسلم دنیا میں تیسرے درجہ کا اخبار نکال کر بھی آپ صحافی بن سکتے ہیں۔ تاریخ کے ردی خانہ میں جانے والی کتابیں چھاپ کر بھی مصنفین کی فہرست میں آپ کا نام درج ہو سکتا ہے۔ بے قیمت شاعری اور بے معنی خطابت کا مظاہرہ کر کے بھی آپ کو مفکر اسلام کا خطاب مل سکتا ہے۔ ایک بے بنیاد جذباتی نعرہ لگا کر بھی آپ قوم کے عظیم معمار کہے جا سکتے ہیں۔

مزید یہ کہ جب آپ کا جذباتی نعرہ قوم کو گڑھے میں دھکیل دے تو آپ نہایت آسانی سے کوئی (Scapegoat) پا جائیں گے جس کے سر سارا الزام لگا کر بدستور اپنے معتقدین کے درمیان قوم کے نجات دہندہ بنے رہیں۔

بے معنی بحثیں

امام غزالی (۵۰۵ - ۴۵۰ھ) مشہور ترین حکماء اسلام میں سے ہیں۔ وہ معلم اور متکلم بھی تھے اور اسی کے ساتھ صوفی بھی۔ ان کی کتابوں میں احیاء علوم الدین ایک معرکتہ الآرا کتاب سمجھی جاتی ہے۔

امام غزالی نے عربی ترجموں کی مدد سے یونانی فلسفہ کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد اپنی کتاب تہافت الفلاسفہ لکھی۔ انھوں نے فلسفہ ارسطو حسب تشریح ابن سینا سے ۲۰ مسئلے منتخب کئے۔ ان میں سے تین مسئلے ان کے نزدیک ایسے تھے جو کفر بواح کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی بنا پر انھوں نے بعض مسلم فلسفیوں کی تکفیر کی۔

۱۰۵۶ھ کا واقعہ ہے۔ شاہ جہاں نے ہندستان سے اپنا ایک سفیر شاہ ایران کی خدمت میں روانہ کیا۔ ان کا نام جاں نثار خان تھا۔ ان کے ساتھ محمد فاروق اور محب علی نامی دو اشخاص اور تھے یہ دونوں معقولات کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔

اس وقت ایران کا جو وزیر تھا وہ بھی معقولات کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس کی نسبت سعد اللہ خاں علّامی نے لکھا ہے کہ اعلم العلماء آں دیار است۔ یعنی وہ اس علاقہ کا سب سے بڑا عالم ہے۔ محمد فاروق اور محب علی کو اپنے فضل و کمال کا بہت دعویٰ تھا۔ چنانچہ وہ شاہ ایران کے دربار میں بلائے گئے اور ایرانی وزیر سے ان کا مناظرہ ہوا۔ وزیر نے پوچھا کہ امام غزالی نے مسائل ثلاثہ (قِدَم عالم اور نفی علم باری بجزئیات مادیہ اور انکار حشر اجساد) کی بنا پر ابونصر فارابی اور شیخ بوعلی سینا کو کافر قرار دیا ہے۔ اور دوسرے گروہ نے ان حکماء کے کلام کی توجیہہ و تاویل کی ہے۔ آپ لوگ اس بارہ میں کیا کہتے ہیں۔ مذکورہ دونوں اشخاص اس سوال کا جواب نہ دے سکے۔ سعد اللہ خاں علّامی کے الفاظ ہیں:

مدعیان دروغ چوں شمع کشتہ بے فروغ ماندند

یعنی علم کے جھوٹے دعویدار بجھے ہوئے چراغ کی طرح بے فروغ ہو کر رہ گئے (الدرۃ الثمینہ)

شاہجہاں کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب کہ دنیا ایک دور سے نکل کر دوسرے دور میں داخل ہونے جا رہی تھی۔ مگر عین اسی زمانہ میں مسلمان لایعنی بحثوں میں مبتلا تھے۔ وہ ایسے معاملات کو جیت اور ہار کا معاملہ سمجھتے تھے جن کا جیت اور ہار سے کوئی تعلق نہیں۔

خدا کو چھوڑ کر

ایک صاحب نے پرجوش انداز میں فرمایا کہ اسلام نقوش سے نہیں بلکہ نفوس سے حاصل ہوتا ہے۔ نقوش (کتابیں) جامد چیزیں ہیں اور جمود سے حرکت پیدا نہیں ہو سکتی۔ نفوس (شخصیتیں) زندہ اور متحرک ہوتی ہیں اور حرکت اور زندگی ہمیشہ حرکت اور زندگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ بزرگ شخصیتوں سے وابستہ ہوں اور ان سے اسلام سیکھیں۔

بظاہر یہ بات بڑی خوشنما معلوم ہوتی ہے مگر وہ سراسر بے بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین نہ نقوش سے ملتا ہے اور نہ نفوس سے۔ وہ صرف خدا سے ملتا ہے۔ آدمی خدا کی کتاب پڑھے۔ وہ اس کے رسول کی سنت کا مطالعہ کرے۔ وہ اس کی کائنات میں اس کی پھیلی ہوئی نشانیوں پر غور کرے اور پھر بار بار دعا کرتا رہے تو یقیناً اس کو دین مل جائے گا۔ یقیناً خدا سے اس کا ربط قائم ہو جائے گا جو اصل مطلوب ہے۔

عجیب بات ہے کہ لوگوں کو فانی انسان دکھائی دیتے ہیں مگر خدا دکھائی نہیں دیتا۔ وہ انسان جو کسی ایک جگہ ہے اس سے ان کی ملاقات ہو جاتی ہے مگر وہ خدا جو ہر جگہ ہے اس سے ان کی ملاقات کی نوبت نہیں آتی۔ وہ انسان جو کوئی ایک یا دو زبان بولتا ہے اس کی بات ان کی سمجھ میں آجاتی ہے مگر وہ خدا جو ہر زبان بولتا ہے اس کی بات سمجھنے سے وہ قاصر رہتے ہیں۔

کیسی عجیب بات ہے کہ لوگ دور دور کے انسانوں کو جانتے ہیں مگر وہ خدا کو نہیں جانتے جو ان سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ کوئی شخص کتابوں میں اٹکا ہوا ہے اور کوئی شخص انسانی شخصیتوں میں۔ خدا سب سے بڑی حقیقت کے طور پر ہر شخص کے قریب ترین موجود ہے مگر وہ کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اے پیغمبر، جب میرے بندے میرے بارہ میں پوچھیں تو کہہ دو کہ میں قریب ہوں اور پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں۔ (البقرہ) پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ خدا اور بندے کے درمیان کسی تیسرے وسیلہ کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص براہ راست خدا کو پا سکتا ہے۔ ہر آدمی براہ راست خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ مگر پیغمبر کے وارثین پیغمبر کے نام پر یہ تبلیغ کر رہے ہیں کہ خدا تک پہنچنا چاہتے ہو تو کسی شخصیت کے حلقہ بگوش ہو جاؤ۔ کسی بزرگ کا دامن تھام لو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام تر خود ساختہ دین ہے اور خود ساختہ دین کبھی کسی کو خدا تک نہیں پہنچا سکتا۔

دنیا کے تابع

سومناتھ مندر جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ۶ جنوری ۱۰۲۶ کو محمود غزنوی نے اسے ڈھا دیا تھا اور پھر وہ دوبارہ بنایا گیا، یہاں آجکل ایک عجیب نزاع برپا ہے۔ اس تاریخی مندر میں مختلف مذہبی امور کی ادائگی کے لئے ۱۲۵ آدمی مقرر ہیں۔ ان کو مندر کی طرف سے ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔ اس تنخواہ کی مقدار ۲۵۰ روپئے ماہوار سے لے کر ۴۰۰ روپے ماہوار تک ہے۔ یہ تنخواہ ان کارکنوں کو کم محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے تنخواہ میں اضافہ کے لئے لیبر کورٹ میں دعویٰ کر دیا۔

مندر ٹرسٹ جس کے صدر مسٹر مرارجی ڈیسائی ہیں، اس کا کہنا ہے کہ سومناتھ مندر ایک مذہبی وقف ہے اور اس کا معاملہ ریلیجس ٹرسٹ ایکٹ کے تحت آتا ہے۔ دوسری طرف کارکنوں کا کہنا ہے کہ وہ ایک صنعت ہے اس کا معاملہ انڈسٹریل ڈسپیوٹس ایکٹ کے تحت طے کیا جانا چاہئے۔ مندر کے کارکنوں کا فائدہ اس میں ہے کہ مندر کو ایک صنعت قرار دیا جائے اور اس کا معاملہ انڈسٹریل ڈسپیوٹس ایکٹ کے تحت لیبر کورٹ میں طے کیا جائے۔ اس طرح ان کو صنعتی مزدوروں والی مراعات حاصل ہو جائیں گی جو ریلیجس ٹرسٹ ایکٹ کے تحت انھیں نہیں مل سکتیں (ٹائمس آف انڈیا یکم ستمبر ۱۹۸۴)

بظاہر یہ بڑی عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو آج تمام مذہب والوں کا یہی حال ہے، حتی کہ خود مسلمانوں کا بھی۔

مسلمان آج اسلامی تعلیمات کی تشریح عوامی خواہشات کی روشنی میں کرتے ہیں کیوں کہ اس طرح انھیں عوامی مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر وہ خالص حق کی روشنی میں اسلام کی تشریح کریں تو عوام کی بھیڑ فوراً ان کا ساتھ چھوڑ دے۔ وہ اسلام کو زمانہ کے تابع کر کے پیش کرتے ہیں تاکہ ہر ایک کی موافقت انھیں حاصل رہے۔ اگر وہ زمانہ کو اسلام کے تابع بنا کر پیش کریں تو کوئی ان کو ساتھ دینے والا نہ ملے۔

دین اصلاً آخرت کی چیز ہے۔ مگر دین کو آخرت کی چیز کی حیثیت سے لینے میں زیادہ قیمت ملتی ہوئی نظر نہیں آتی، اس لئے ہر آدمی دین کو دنیا کی چیز بنا کر اختیار کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ وہ اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کر سکے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو سومناتھ کو ڈھانے والے بھی وہیں نظر آئیں گے جہاں سومناتھ کو آباد کرنے والے نظر آتے ہیں۔

سنانے والے بہت ، سننے والا کوئی نہیں

آدمی اپنے کو نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ یہی ہر دور میں آدمی کی سب سے بڑی خواہش رہی ہے۔ قدیم زمانہ میں اپنے کو نمایاں کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ "تلوار" تھا۔ اس لئے آدمی تلوار کے کارنامے دکھا کر اپنی جاہ پسندی کے جذبہ کی تسکین حاصل کرتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں پریس اور پلیٹ فارم اس کے ذریعے بن گئے ہیں، اس لئے آج لوگ لکھنے اور بولنے کے کمالات دکھا رہے ہیں۔ جس کو بھی کچھ موقع مل گیا ہے وہ چاہتا ہے کہ تحریر و تقریر کے میدان میں ظاہر ہو کر اپنے آپ کو نمایاں کرے۔ مزید یہ کہ تلوار کا کھیل بڑا جان جوکھم کا کھیل تھا۔ اس لئے نسبتاً کم لوگ اس میدان میں اترنے کا حوصلہ کرتے تھے۔ اس کے برعکس قلم کو حرکت میں لانا یا لاؤڈ اسپیکر پر الفاظ کے دریا بہانا بہت آسان کام ہے۔ اس لئے آج ہر آدمی جاہ اور شہرت کے میدان میں دوڑ لگانے کے لئے بے قرار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری انسانی آبادی "سنانے والوں" میں تبدیل ہو گئی ہے۔ زمین کی پشت پر "سننے والا" کوئی نہیں۔

جہاں بھی دیکھئے، ہر آدمی دوسرے کو درس دیتا ہوا نظر آئے گا۔ کوئی اپنے بھائیوں کے درمیان خطابت کے جوہر دکھا رہا ہے اور کوئی برادران وطن کے نام انسانیت کا پیغام نشر کر رہا ہے، کوئی عربوں کو نصیحت کر رہا ہے اور کوئی اہل مغرب کو کھری کھری باتیں سنا رہا ہے۔ کوئی اہل بدعت کے خلاف قلمی جہاد کا کارنامہ انجام دے رہا ہے اور کوئی فرق ضالّہ کی حقیقت کھولنے میں مصروف ہے۔ خود اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کا محاسبہ کرنے کی فرصت کسی کو نہیں۔

ان لفظی سورماؤں کی حقیقی زندگیوں کو دیکھئے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ ذاتی نمائش کا کاروبار ہے نہ کہ دین و ملت کی خدمت کا، ہر ایک زبان سے حق و انصاف کا پیغام دے رہا ہے اور عمل سے حق و انصاف کو پامال کر رہا ہے۔ ایک شخص قوم کی تعمیر کا نعرہ لگا رہا ہوگا، مگر خود اپنے زیر معاملہ فرد قوم کو برباد کر رہا ہوگا۔ ایک شخص دوسروں کو انسانیت کا پیغام سنا رہا ہوگا اور خود اس سے جس انسان کا معاملہ پڑے اس سے حیوانی سلوک کر رہا ہوگا۔ ایک شخص دوسروں سے انصاف قائم کرنے کا مطالبہ کر رہا ہوگا اور خود جب ایک شخص سے انصاف کرنے کا وقت آئے گا تو وہاں وہ بے انصافی کرنے لگے گا۔

قرآن میں شاعر اور نبی کا یہ فرق بتایا گیا ہے کہ شاعر ایسی بات کہتا ہے جس پر وہ خود عامل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس نبی جو کچھ کہتا ہے وہی کرتا بھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے قائدین شاعروں کے اسوہ پر چل رہے ہیں نہ کہ پیغمبروں کے اسوہ پر۔ مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں جس چیز کی قیمت ہے وہ صرف عمل ہے۔ اگر آدمی زبان سے فساد اور نا انصافی کے خلاف آواز لگا رہا ہو مگر خود عملی اعتبار سے فساد اور نا انصافی کے مقام پر ہو تو آخرت میں اس کے ساتھ معاملہ اس کے عمل کے اعتبار سے کیا جائے گا نہ کہ اس کے قول کے اعتبار سے۔

ایک معجزہ جو کبھی پیش نہیں آیا

ایک مصیبت زدہ بستی تھی۔ ڈاکوؤں نے اس کے باشندوں کے گھروں کو جلا دیا تھا۔ ان کی معاشیات تہس نہس ہوگئی تھیں۔ ان کو اپنے چاروں طرف ناکامی اور بربادی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک روز اچانک بستی کے ایک بزرگ کو ایک معجزاتی تدبیر سوجھی۔ ان کو نظر آیا کہ بستی کے مسئلہ کا بہترین حل یہ ہے کہ وہ ہر روز کسی خالی میدان میں جا کر ۵۱ پھلجھڑیاں چھوڑیں۔ انھوں نے اس پر عمل شروع کر دیا۔ چند روز کے بعد ان کو اندازہ ہوا کہ ان کے پاس پھلجھڑیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اب وہ روزانہ ۱۰۱ پھلجھڑیاں چھوڑنے لگے۔ مزید اضافہ ہوا تو انھوں نے پھلجھڑیوں کی تعداد ۱۵۱ اور آخر میں ۳۰۱ کر دی۔ منصوبہ کامیاب رہا۔ ادھر وہ پھلجھڑیاں چھوڑتے رہے، اُدھر بستی کے مکانات کے ملبہ سے شاندار کوٹھیاں ابھرنا شروع ہوگئیں۔ لوگوں کی اجڑی ہوئی دکانیں از سر نو تعمیر ہو کر سامان سے اور گاہکوں سے بھر گئیں۔ ان کے نوجوان تعلیم و ترقی کے میدانوں میں بے روک ٹوک دوڑنے لگے۔ ہر طرف بستی کی عزت و اقبال کے جھنڈے لہرانے لگے۔ ان کے دشمن ذلیل و خوار ہو کر ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سو گئے ـــــ اس تمام کارروائی میں ۲۱۲۶ پھلجھڑیاں استعمال ہوئیں اور حیرت انگیز طور پر اس میں صرف دو ہفتے لگے۔ ۹ جولائی ۱۹۷۹ کو تاریخ انسانی کی یہ انوکھی مہم شروع ہوئی اور ۲۵ جولائی ۱۹۷۹ کو شان دار کامیابیوں کے ساتھ ختم ہوگئی۔

اس بے نظیر کامیابی پر شاعروں نے اشعار لکھے۔ بیان دینے والوں نے بیانات دیئے۔ تقریر کرنے والوں نے تقریریں کیں۔ بزرگ کے اپنے اخبار نے موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ اس کے فاتحانہ کارنامے شائع کئے۔ مگر بستی والے ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں: "یہ معجزہ کہاں پیش آیا۔ ہم کو اس کا کوئی علم نہیں۔ ہم تو اب بھی اسی بُری حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے مکانات اب بھی ٹوٹے ہوئے ہیں۔ ہماری دکانیں اب بھی اجڑی ہوئی ہیں۔ ہمارے بچوں کا مستقبل اب بھی اسی طرح غیر یقینی ہے جس طرح وہ پہلے غیر یقینی تھا۔ یہ انوکھا معجزہ شاید ایک انوکھا راز بھی ہے جس کو صرف پھلجھڑی سیاست کے ماہرین ہی جان سکتے ہیں۔ دوسرا کوئی شخص اس کو سمجھ نہیں سکتا۔

آدمی الفاظ پالیتا ہے

صدر سادات نے ایک تقریر میں کہا: مصر اب تک ایک نامعلوم خوف وہراس میں مبتلا تھا جس کی وجہ سے مصر ٹھٹھر کر رہ گیا تھا۔ اب مصر کو اس خوف سے نجات مل گئی ہے۔ اب ہم فخر کے ساتھ ایک نئے مصر کی تعمیر کر سکتے ہیں (۱۹ جولائی ۱۹۷۹) مصر اور اسرائیل کے درمیان سمجھوتہ بہت سے لوگوں کے نزدیک عرب مفادات سے غداری ہے۔ مگر اسی واقعہ کے بارے میں صدر سادات نے یہ الفاظ پالئے کہ وہ مصر کے لئے نئے شان دار دور کا دروازہ کھولتا ہے۔

عمل کم الفاظ زیادہ

مسٹر سی۔ایس۔جھا اقوام متحدہ میں ہندوستان کے نمائندہ رہ چکے ہیں۔ اگست۔ستمبر ۱۹۶۵ میں ہند و پاک جنگ کے بعد تاشقند میں جو کانفرنس ہوئی، اس میں وہ شریک تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس کانفرنس میں سابق صدر محمد ایوب خاں کا رجحان مصالحت کی طرف تھا۔ مگر ذوالفقار علی بھٹو اور مسٹر عزیز احمد کا خیال تھا کہ ہندستان جب تک کشمیر کے معاملہ میں پاکستان کے موقف کو نہ تسلیم کرے، کوئی معاہدہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ ۶ جنوری ۱۹۶۶ کو روسی میزبانوں کی طرف سے کھانے کی ایک دعوت تھی۔ مسٹر عزیز احمد نے گفتگو کے دوران اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا جس پر تین سطروں میں ایک عبارت لکھی ہوئی تھی۔ ان کے بیان کے مطابق یہ ان کی طرف سے مشترکہ اعلامیہ کا مجوزہ مضمون تھا۔ جو مسٹر بھٹو نے پنسل سے لکھا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ "طرفین نے کشمیر کے سوال پر تبادلہ خیال کیا اور اس پر متفق ہوئے کہ وہ اقوام متحدہ کے چارٹر اور اقوام متحدہ کے رزولیوشن کے مطابق پر امن حل کے لئے باہم گفتگو کریں گے"۔ اس کے بعد مسٹر جھا لکھتے ہیں: بظاہر اس کا مطلب یہ تھا کہ مسٹر بھٹو جس چیز کو جنگ کے ذریعہ حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں اس کو وہ تاشقند میں حاصل کر لینا چاہتے ہیں (السٹریٹڈ ویکلی ۶ مئی ۱۹۷۹)

It seemed that Bhutto wished to succeed in Tashkent
in what he had failed to achieve by war !

آخری جملہ میں مسٹر جھا نے جو تبصرہ کیا ہے، وہ موجودہ دور کی پوری مسلم سیاست پر صادق آتا ہے، ہمارے قائدین آج جس سیاست میں مشغول ہیں وہ ہر جگہ یہی ہے کہ میدان مقابلہ میں ہاری ہوئی بازی کو تقریروں اور تحریروں کے زور پر دوبارہ جیت لیں۔ عدم تیاری، ناقص منصوبہ بندی، اتحاد کی کمی، صورت حال کا غلط اندازہ، یہ وہ چیزیں ہیں جنھوں نے ہمارے قائدین کے بڑے بڑے اقدامات کو ناکام بنا دیا ہے۔ ان کے لئے دوسرا راستہ یہ تھا کہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے اور دوبارہ صحیح تیاری کر کے کھوئی ہوئی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ مگر وہ حیرت انگیز جسارت کے ساتھ الفاظ کو عمل کا قائم مقام بنانے میں مشغول ہیں۔

زندگی کے معاملات کا فیصلہ عمل کے میدان میں ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کے میدان میں۔ عمل کے حقیقی میدان میں جو لوگ قیادتی اہلیت کا ثبوت نہ دے سکیں وہ اکثر بحث و گفتگو کی میز پر یا تقریر کے پنڈال میں لفظوں کے کرتب دکھا کر اپنے کو باعمل ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اس قسم کی عملیت صرف آدمی کے جرم میں اضافہ کرتی ہے۔ ایک شخص جب حقیقی عملی امتحان میں ناکام ہو جائے تو اس کے لئے صحیح راستہ صرف یہ ہے کہ اپنی نااہلی کا اعتراف کر کے خاموش بیٹھ جائے یا پھر اپنے منصوبہ کی خامیوں کو درست کر کے دوبارہ صحیح تر انداز سے اس کی جدوجہد شروع کرے۔ اس کے بجائے لفظی کمالات کے ذریعہ عمل کا کریڈٹ لینے کی کوشش کرنا ایک ایسا فعل ہے جو نہ خدا کی نگاہ میں کوئی قیمت رکھتا ہے اور نہ بندوں کی نگاہ میں۔

خود ساختہ اسلام

ایک نوجوان طالب علم کے ساتھی نے طالب علم کا تعارف کراتے ہوئے کہا " ان کو طلبہ کی اسلامی تحریک سے بہت دلچسپی ہے ۔ وہ طلبہ کی اسلامی سرگرمیوں میں کافی حصہ لیتے ہیں اور آج کل مسلم طلبہ کے ایک تنظیم کے سکریٹری بھی ہیں ۔ اس وقت وہ پانچ ضلع کو کور (Cover) کر رہے ہیں "

یہ لیڈروں کی ایک نئی قسم ہے جو مسلمانوں کے درمیان بہت بڑے پیمانے پر پیدا ہو گئی ہے ۔ مسلمانوں میں آج کل بے شمار ایسے لیڈر ملیں گے جن میں سے کوئی پانچ ضلع کو کور کر رہا ہوگا کوئی پانچ ریاست کو ، کوئی پانچ ملک کو کور کر رہا ہوگا کوئی پانچ بر اعظم کو ، حتیٰ کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی خوش قسمتی اس حد کو پہونچی ہے کہ انھوں نے اپنے لیے ایسے لیڈر پالیے ہیں جو ساری کائنات کو کور کر رہے ہوں :

ہے حقیقت اس کے دیں کی احتساب کائنات

مسلمانوں کے درمیان آج کل لیڈروں کی اتنی کثرت ہے کہ جتنے مسلمان ہیں شاید اتنے ہی ان کے درمیان لیڈر بھی ہوں ۔ مگر یہ لیڈر سب کے سب وہ ہیں جو "دوسروں" کو کور کر رہے ہیں ۔ ان میں کوئی بھی ایسا لیڈر نظر نہیں آتا جو خود اپنے آپ کو کور کر رہا ہو ۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں احتساب غیر کی دھوم ہے مگر احتساب خویش ان کے اندر اتنا کمیاب ہے کہ ڈھونڈنے سے بھی کہیں نظر نہیں آتا ۔

یہ اسلام جس کی آج کل کے مسلمانوں میں دھوم ہے بلاشبہ وہ اسلام نہیں جس کی تعلیم خدا اور رسول نے دی ہے ۔ یہ مسلمانوں کا اپنا بنایا ہوا اسلام ہے جس کا قرآن وحدیث سے کوئی تعلق نہیں ۔

قرآن وحدیث کے مطابق حقیقی مومن وہ ہے جو اپنے آپ کو کور کرے ۔ مومن اللہ سے ڈرنے والا ہوتا ہے وہ جہنم کے اندیشہ سے کانپ رہا ہوتا ہے ۔ یہی ایمان کی اصل ہے ۔

ایسا ایمان کسی کے اندر پیدا ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی ساری توجہ اپنے آپ پر لگ جاتی ہے ۔ اپنے آپ کو حق پر کھڑا کرنا اس کا سب سے بڑا مسئلہ بن جاتا ہے ۔ اور جو لوگ اپنے آپ کو حق پر کھڑا کرنے والے ہوں وہی اپنے باہر بھی حق کو کھڑا کرتے ہیں ۔ اس کے برعکس جو لوگ صرف یہ جانتے ہوں کہ انھیں دوسروں کے خلاف حق کا جھنڈا لے کر کھڑا ہونا ہے وہ صرف دنیا کے فساد میں اضافہ کریں گے وہ دنیا کی تعمیر کرنے والے نہیں بن سکتے ۔

اسلام کا استحصال

ٹائم میگزین (۱۵ فروری ۱۹۹۳) نے ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں ایک باتصویر رپورٹ چھاپی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم اور فساد ہو رہا ہے، اس کی وجہ مسلمانوں کے خلاف وہ مذہبی نفرت (religious hatred) ہے جو ہندوؤں کے دلوں میں پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف ہندو نفرت کی تاریخ دسویں صدی عیسوی تک جاتی ہے جب کہ مسلم حملہ آوروں نے برصغیر ہند کو لوٹنا اور ہندو مندروں کو تباہ کرنا شروع کیا :

> Hindu hatred for Muslims dates back to the 10th century, when Muslim invaders first began looting the subcontinent and destroying Hindu temples (p. 25).

مسلم حملہ آوروں پر یہ الزام بہت عرصہ سے لگایا جا رہا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۴ - ۱۸۵۷) نے اپنے اعلیٰ انشا پردازانہ اسلوب میں اس کا طاقت ور دفاع کیا۔ برٹش انڈیا میں ان کی یہ تحریریں بہت مقبول ہوئیں۔ اس کے بعد مسلمان لکھنے اور بولنے والوں کا یہی عام رجحان بن گیا۔ ہر ایک اسی طرح شبلی کے اسلوب میں مسلم بادشاہوں کا دفاع کرنے لگا۔

یہ اسلوب مسلمانوں کو خوش کرنے میں بہت کامیاب رہا۔ مگر ہندوؤں کے ذہن کو بدلنے میں وہ اتنا ہی ناکام ثابت ہوا۔ ہندوؤں کا ذہن برعکس طور پر شدید ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اب بیسویں صدی کے آخر میں پہنچ کر مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی تاریخی نفرت اپنی آخری انتہا پر پہنچ گئی ہے۔ یہ الٹا انجام بتاتا ہے کہ شبلی کا اسلوب مفید نہ تھا۔ کیوں کہ اس معاملہ میں اصل کام ہندو نفرت کو ختم کرنا ہے نہ کہ مسلمانوں کی واہ واہ حاصل کرنا۔

اب ضرورت ہے کہ مسلمان اس معاملہ میں اپنے پورے رویہ کو تبدیل کریں۔ ہمیں ان مسلم بادشاہوں کا دفاع نہیں کرنا ہے بلکہ ان کی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے ان سے برأت ظاہر کرنا ہے۔ ہمیں یہ کہنا ہے کہ اسلام بلاشبہہ ایک سچا مذہب ہے۔ مگر مسلمانوں کا معاملہ اس سے الگ ہے۔ موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمان ہیں جو اپنے ذاتی مقاصد کی تکمیل کے لیے اسلام کا استحصال کرتے ہیں، اسی طرح پہلے بھی ہوا۔ مگر ان مسلمانوں کی کارگزاریوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

دنیا کے بارے میں سنجیدہ، آخرت کے بارے میں سنجیدہ نہیں

ایک لیڈر کا سیاسی مفاد دوسرے لیڈر سے وابستہ ہو تو وہ اس کی خوبیوں سے آخری حد تک واقف ہو جاتا ہے اور دل کھول کر اس کا اعتراف کرتا ہے۔ اسی طرح ایک دکان دار کے پاس جب کوئی آدمی نوٹوں کی گڈیاں لے کر شادی کا سامان خریدنے کے لئے جاتا ہے تو دکان دار اس سے کمال نرمی اور اخلاق کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ڈاکوؤں کی پارٹی حد درجہ اتفاق و اتحاد کے ساتھ کام کرتی ہے۔ اسمگلنگ کی دنیا میں دیانت داری اور قول کی پابندی کا اصول انتہائی معیاری صورت میں قائم ہوتا ہے۔ لوگ اپنے دنیا کے معاملات میں پوری طرح سنجیدہ ہیں۔ کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ ایسے نہ بنیں تو وہ اپنے مطلوبہ فوائد کو حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لئے جہاں دنیوی مفاد اور دنیوی مصلحت کا معاملہ ہو، وہ بہت جلد با اصول اور با اخلاق انسان بن جاتے ہیں۔ مگر جہاں دنیوی مفاد خطرہ میں نظر نہ آئے اور دنیوی مصلحتوں کے بگڑ جانے کا اندیشہ نہ ہو وہاں وہ بالکل بے حس اور بے کردار بن جاتے ہیں۔ دنیا کی چیزوں میں ان کی حساسیت خوب کام کرتی ہے۔ وہ معاملہ کی نزاکتوں کو فوراً سمجھ لیتے ہیں اور فوراً اپنے رویہ کو اس کے مطابق بنا لیتے ہیں۔ مگر جہاں ان کی اپنی ذات محفوظ نظر آئے۔ جہاں دنیوی مفادات خطرہ میں نہ ہوں وہاں وہ ایسے بن جاتے ہیں گویا ان کے اندر احساس نام کی کوئی چیز موجود ہی نہیں۔ ایک ہوشیار آدمی اچانک بالکل بے وقوف اور ایک حساس آدمی اچانک بالکل بے حس دکھائی دینے لگتا ہے۔

لوگ خواہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، ان کا اصلی مذہب صرف دنیا پرستی ہے۔ خدا پرستی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اگر وہ مذہبی ہوتے تو جو اخلاقیات کسی کے اندر دنیا کے زور پر ابھرتی ہیں وہی اخلاقیات ان کے اندر آخرت کے زور پر پیدا ہوتیں۔ سچا مذہب یہ ہے کہ آدمی خالص اصول پسندی اور اعتراف حقیقت کی بنیاد پر دوسرے کے فضل کو مانے، خواہ اس کے لئے کوئی ظاہری دباؤ موجود نہ ہو۔ آخرت کے خوف نے اس کے اندر نرمی اور تواضع پیدا کر دی ہو۔ اللہ کی رضا حاصل کرنے کا جذبہ اس کو اتحاد و اتفاق پر مجبور کر دے۔ جہنم سے بچنے اور جنت حاصل کرنے کے شوق میں وہ عہد کو پورا کرنے والا اور معاملات میں دیانت داری برتنے والا بن گیا ہو۔

کچھ ایسے لوگ بھی ملیں گے جو عام حالات میں شرافت اور معقولیت کا ثبوت دیں گے۔ لیکن اگر ان کے خلاف کوئی قابل شکایت بات ہو جائے تو وہ فوراً بدل جائیں گے۔ ان سے شرافت اور معقولیت کا تحفہ صرف اس کو مل سکتا ہے جو ان کی "انا" کو خوش کر رہا ہو۔ جو ان کی اپنی بڑائی کے تانے بانے کو منتشر نہ کرے۔ مگر جس شخص سے انھیں کسی قسم کی ٹھیس پہنچ جائے، اس کے لئے وہ مکمل طور پر غیر شریف اور غیر معقول انسان بن جاتے ہیں۔ اس قسم کے کردار کے لوگوں کا بھی دین و مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ مذہب نام ہے حقیقت اعلیٰ کو معیار بنانے کا۔ مگر وہ اپنے عمل سے بتا رہے ہیں کہ وہ خود اپنی ذات کو معیار بنائے ہوئے ہیں۔ وہ خود پرست ہیں نہ کہ خدا پرست۔ جتنا سنجیدہ وہ اپنی ذات کے بارے میں ہیں اتنے ہی سنجیدہ اگر وہ آخرت کے بارے میں ہوتے تو وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتے تھے۔

ہمارے علماء

مولانا عبیداللہ سندھی (۱۸۷۲ — ۱۹۴۴) نے ہندستان کی آزادی کی تحریک کے زمانہ میں یورپ کا سفر کیا تھا۔ وہ یورپ کے سفر سے واپس آئے تو انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ علماء اپنا موجودہ کرتا اور پائجامہ اتار دیں اور ہیٹ اور پتلون پہنیں۔ اس سے ان کا جمود ٹوٹے گا اور ان کے اندر جدید حالات کے لحاظ سے سوچنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ علماء یہ تجویز سن کر بگڑ گئے۔ کسی نے مولانا عبیداللہ سندھی کو کافر قرار دیا، کسی نے کہا کہ وہ پاگل ہو گئے ہیں۔

ہمارے علماء کبھی اس کے لئے تیار نہیں ہوسکتے کہ وہ ہیٹ اور کوٹ پینٹ پہن کر سڑکوں پر چلیں، حالانکہ یہ زیادہ سے زیادہ لغو ہے نہ کہ حرام۔ دوسری طرف یہی علماء جان بوجھ کر ایسے کام کرتے ہیں جو شریعت میں صراحۃً حرام قرار دئے گئے ہیں ——— وہ اسلامی اتحاد کو توڑتے ہیں، وہ ایک دوسرے کے خلاف تخریب کاری کے منصوبے بناتے ہیں۔ ان کا ایک گروہ دوسرے گروہ پر غبن، خیانت، کذب بیانی اور عہد شکنی کے الزامات لگاتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کی پوشیدہ باتوں کا پتہ لگا کر عوام میں ان کو شہرت دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کے اوپر تنقید کر دے تو اس کے خلاف ان کے انتقام کی آگ برسوں تک نہیں بجھتی۔

یہ سارے کام بلاشبہ خدا کی شریعت میں حرام ہیں۔ مگر ہمارے علماء پوری دلیری کے ساتھ ان کا ارتکاب کرتے ہیں، وہ اس مقصد کے لئے جلسے کرتے ہیں، لاکھوں روپے خرچ کر کے اخبار نکالتے ہیں جو ان کی ان خرافات کی اشاعت کرے، وہ اپنے لوگوں کو ملا کر جتھے بناتے ہیں اور پھر ایک جتھا دوسرے جتھے کو گرانے اور ذلیل کرنے کے لئے وہ تمام کارروائیاں کرتا ہے جو اس کے لئے ممکن ہیں۔

یہ صورت حال ثابت کر رہی ہے کہ ہمارے علماء کے یہاں اب صرف نمائش والا دین باقی رہ گیا ہے، حقیقت والا دین ان کے یہاں موجود نہیں۔ عوام میں اپنا دینی وقار قائم رکھنے کے لئے عرفی طور پر جن چیزوں کی اہمیت ہے ان پر وہ سختی سے قائم ہیں اور جو چیزیں خدا کے یہاں ان کو روسیاہ کرنے والی ہیں ان کی انھیں کوئی فکر نہیں۔ ان کو عوام کا ڈر ہے۔ مگر خدا کا ان کے دل میں کوئی ڈر نہیں۔

عوام چندے دیتے ہیں، عوام استقبال کرتے ہیں، عوام حلقہ فراہم کرتے ہیں۔ عوام کے بل پر قیادت و پیشوائی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو دیتے ہیں کہ عوام کے درمیان ان کا دینی بھرم قائم رہے۔ ان کو دنیا کی ضرورت تھی جو عوام کے ذریعہ انھیں مل گئی۔ پھر خدا کی جنت اور جہنم کے لئے فکرمند ہونے کی انھیں کیا ضرورت۔

موجودہ دینی مدارس

دینی مدارس، بلاشبہہ موجودہ زمانہ میں اہم دینی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان کے افادی پہلو پر اتنا زیادہ لکھا جاچکا ہے کہ میری طرف سے اس سلسلے میں صرف تصدیق کافی ہے۔ اس پر مزید اضافہ کی کوئی ضرورت نہیں۔

تاہم دینی مدارس کی بعض علامات مثلاً ان میں باہمی اختلاف بلکہ تصادم یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان میں مسلّمہ خوبیوں کے باوجود، کوئی کمی ہے۔ اگر کمی نہ ہو تو یہ ناممکن ہے کہ یہ مدارس مسلمانوں کی باہمی جنگ کا میدان بن جائیں۔ حالاں کہ مسلمانوں کی باہمی جنگ سراسر حرام ہے۔

میرے نزدیک وہ کمی یہ ہے کہ یہ مدارس اپنے افراد کو صرف داخلی نشانہ دیتے ہیں، وہ ان کو کوئی خارجی نشانہ نہیں دیتے۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ داخلی نشانہ بالآخر باہمی ٹکراؤ پیدا کرتا ہے۔ جب کہ خارجی نشانہ یہ کرتا ہے کہ قوتوں کو خارج کی طرف موڑ کر لوگوں کو آپس کے تصادم سے بچالیتا ہے۔ وہ قوتوں کو خارجی محاذ پر لگادیتا ہے۔

موجودہ دینی مدارس کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ تحفظ کی نفسیات کے زیر اثر وجود میں آئے۔ چنانچہ ان کا سارا نظام اور نصاب تحفظ کے مقصد کے تحت بنا۔ بالفاظ دیگر ان مدارس نے اول روز سے مسلمانوں کو صرف داخلی نشانہ دیا۔ وہ ان کو کوئی خارجی نشانہ نہ دے سکے۔ اور جس قوم کے افراد کے پاس صرف داخلی نشانہ ہو وہ ایک حد پر پہنچ کر ہمیشہ آپس میں ٹکرانا شروع کر دیتے ہیں۔

قرآن میں دینی تعلیم کا جو تصور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ایسے افراد تیار ہوں جو غیر مسلم اقوام پر انذار کا کام کریں (التوبہ ۱۲۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ دینی اداروں کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ وہ قوم کے افراد کو عمل کا خارجی نشانہ دے سکیں۔

تاہم خارجی نشانہ سے میری مراد پرامن خارجی نشانہ ہے نہ کہ اس قسم کا جارحانہ خارجی نشانہ جس کو موجودہ زمانہ کے جھوٹے قائدین نے دریافت کیا ہے۔

خارجی نشانہ سے میری مراد وہی چیز ہے جس کو قرآن میں انذار کہا گیا ہے۔ یعنی پرامن دعوت کے ذریعہ اہل عالم کو خدا کے پیغام سے باخبر کرنا۔ موجودہ مدارس میں اگر تعلیم کے ساتھ دعوت کو بھی اس کی صحیح اور موثر صورت میں شامل کر دیا جائے تو مدارس زیادہ بامقصد بن جائیں اور زیادہ مفید بھی۔

ہمارے مدارس

صحابہ ہمیشہ اساسات دین پر متوجہ رہتے تھے۔ مگر بعد کو عباسی خلافت کے زمانہ میں دوسری قوموں کے اثر سے مسلمانوں کا یہ حال ہوا کہ وہ اساسات دین کے بجائے جزئیات دین کو طے کرنے میں الجھ گئے۔ ان کے درمیان عجمی قوموں کے اختلاط سے نئے نئے مسائل پر بحثیں ہونے لگیں۔ یہ بحثیں حقیقۃً ان امور پر نہ تھیں جو قرآن و حدیث میں واضح الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں۔ بلکہ زیادہ تر ان پہلوؤں پر تھیں جو لوگوں نے اپنے غیر ضروری قسم کے خوض و تعمق سے خود پیدا کیا تھا۔ فقہ میں جزئیاتی امور پر بحثیں پیدا ہوگئیں اور اعتقادیات میں کلامی موشگافیوں سے پیدا شدہ مسائل لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت جو اسلامی نظام تعلیم بنا اس میں انھیں فقہی اور اعتقادی بحثوں نے سب سے زیادہ جگہ حاصل کرلی۔ حتی کہ خود قرآن و حدیث بھی اب انھیں اختلافی بحثوں کی روشنی میں پڑھائے جانے لگے۔ یہ انداز تعلیم جو ابتداءً عباسی دور میں رائج ہوا بعد کو مقدس بن کر اسلامی نظام تعلیم کا لازمی جزء بن گیا اور آج بھی وہ کسی نہ کسی طرح اس کا لازمی جزء بنا ہوا ہے۔ جو چیز صرف اسلام کی تاریخ تھی اس کو اسلام کی حقیقت سمجھ لیا گیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی درس گاہوں سے اس سے بالکل مختلف انسان بن کر نکلنے لگے جو قرآن کو مطلوب تھے۔ قرآن کو اسلامی تعلیم سے ایسے انسان مطلوب تھے جو اللہ سے ڈریں (انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء) اور جو دنیا کے لوگوں کو آنے والے سخت دن سے ہوشیار کریں (ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم) مگر اب اسلام کے تعلیمی نظام سے ایسے لوگ پیدا ہونے لگے جو جزئیاتی بحثوں کے ماہر ہوں اور اختلافی مسائل میں کمال فن کی داد دے سکیں۔

اس فرق کا مزید شدید تر نقصان یہ ہوا کہ ہمارے مدارس قساوت اور بے حسی کی تربیت گاہ بن گئے۔ اگر آپ خدا کی عظمت کا تذکرہ کریں، اگر آپ جنت اور جہنم کو یاد کریں تو آپ کے اندر خشوع اور تقویٰ کے جذبات ابھریں گے۔ اس کے برعکس اگر آپ ظاہری جزئیات اور لفظی موشگافیوں میں بحث و مباحثہ کریں تو اس سے صرف قساوت کو غذا ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے مدارس خشوع کے بجائے غفلت اور قساوت کی پیداوار کا مرکز بن کر رہ گئے ہیں۔

تنگ نظری

لاروشے فوکالڈ (La Rochefoucauld) کا قول ہے کہ معمولی ذہن کے لوگ عام طور پر ہر اس چیز کو بُرا کہنے لگتے ہیں جو ان کی چھوٹی قامت سے زیادہ ہو :

Mediocre spirits generally condemn everything that exceeds their small stature.

انسان کی یہ عام کمزوری ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنی ذات کے لحاظ سے ناپتا ہے۔ جو چیز اس کی بڑائی میں اضافہ کرے یا کم از کم اس کی بڑائی کو باقی رکھے اس کا وہ پرجوش طور پر حامی بن جاتا ہے اس کے برعکس جو چیز اس کو اپنی بڑائی کے لیے خطرہ نظر آئے اس کا وہ دشمن بن جاتا ہے، خواہ وہ بجائے خود کتنی اچھی چیز کیوں نہ ہو۔

عربی درس گاہوں میں عام طور پر قدیم معقولات کا کورس شامل رہتا ہے۔ یہ گویا معقولات کے نام پر نامعقولات ہے۔ کیوں کہ معقولات کے نام سے یہاں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اُن کا حقیقی عقلیات سے کوئی تعلق نہیں۔ عربی مدارس میں معقولات کا نصاب مکمل کرنے کے بعد بھی آدمی اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ آج کی دنیا میں پڑھے لکھے لوگوں کے درمیان اسلام کو مدلل انداز میں پیش کرسکے۔

ایک عربی درس گاہ کے انتظامی ارکان نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ اس کے نصاب سے قدیم معقولات کی تمام کتابیں خارج کر دی جائیں اور جدید علمی معیار کے مطابق معقولات کا نیا نصاب بنایا جائے۔ تاہم عملاً اس کو اختیار نہ کیا جاسکا۔ کیوں کہ درس گاہ کے شیخ المعقولات نے اس کی زبردست مخالفت کی۔ اور وہ چوں کہ اس درس گاہ کے انتہائی سینیر استاد تھے ان کی بات لوگوں کو ماننی پڑی۔

اس مخالفت کا سبب یہ تھا کہ مذکورہ بزرگ صرف قدیم معقولات کے ماہر تھے۔ وہ جدید معقولات سے بالکل بے خبر تھے۔ ان کو اندیشہ ہوا کہ درس گاہ میں اگر قدیم معقولات کو ختم کیا گیا تو اس کے بعد ان کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد ان کی مثال اس اردو ٹیچر کی ہو جائے گی جو اپنے آپ کو ایک ایسے اسکول میں پائے جہاں ذریعہ تعلیم صرف روسی زبان ہو۔

لوگ چندہ نہیں دیں گے

پھلواری شریف کے چند نوجوان جلسۂ سیرت کا پروگرام بنا رہے تھے، ان کا جذبہ یہ تھا کہ پھلواری شریف ایک تاریخی بستی ہے، لہٰذا جلسہ بھی تاریخی نوعیت کا ہونا چاہیے۔ ایک اخبار کے ایڈیٹر لکھتے ہیں کہ میں نے ان سے پوچھا کہ کتنا روپیہ خرچ کروگے، جواب ملا کہ تقریباً پانچ ہزار روپیہ چندہ ہو جائے گا۔ میں نے کہا بلاشبہ ہمارے لیے یہ بات باعثِ فخر ہے کہ ہم حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت ہیں۔ ان کی محبت ہماری سب سے قیمتی متاع ہے۔ لیکن ان کی یاد کو تازہ رکھنے، ان کے اسوۂ حسنہ کو عام کرنے کے لیے جلسہ ہی کیا ضروری ہے، پھلواری شریف میں کوئی اچھی لائبریری نہیں، اتنی رقم سے ایک اچھی لائبریری کی بنیاد ڈالی جاسکتی ہے جس میں سیرت پر اعلیٰ درجہ کا لٹریچر ہو اور اسی لائبریری میں تعلیم بالغان کا ایک مرکز بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔ جلسہ کی تقریریں ہوا میں تحلیل ہو جائے گی، لائبریری کا فیض پورے سال بھر لوگوں کو پہونچتا رہے گا۔ نوجوان میری بات کے قائل ہوگیے، تاہم وہ اپنے پروگرام کو بدلنے پر راضی نہیں ہوئے۔ انھوں نے کہا " لیکن لائبریری کے لیے لوگ چندہ نہیں دیں گے، جب کہ میلادالنبی کے جلسہ کے لیے آسانی سے رقم فراہم ہو جائے گی " (نقیب، پٹنہ، ۱۶ جنوری ۱۹۷۸)

اس واقعہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ لوگ چندہ نہیں دیں گے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ لوگ چونکہ اس کے لیے چندہ نہیں دیں گے اس لیے ہمیں وہی کام کرنا ہے جس میں لوگ چندہ دیں۔

یہ چھوٹا سا واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بربادی کی وجہ کیا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جو لوگ مسلمانوں میں کام کرنے کے لیے اٹھتے ہیں وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر انھیں کاموں کی طرف چلے جاتے ہیں جن میں چندہ زیادہ جمع ہوتا ہو، جن میں شہرت زیادہ ملتی ہو، جن میں عوام کی بھیڑ زیادہ اکٹھا ہوتی ہو، جن میں فوراً سے فوراً لیڈری حاصل ہو جائے۔ عوام کے اس مزاج کو بدلنے کی واحد صورت یہ ہے کہ ان کے رہنما اپنا مزاج بدلیں۔ وہ ایسے کاموں میں طاقت لگائیں جن میں "چندہ" نہیں ملتا۔ ایک نسل جب اس طرح قربانی دے گی، اس کے بعد ہی وہ وقت آئے گا جب کہ اگلی نسل اس کا پھل پاسکے۔

نشانہ کا فرق

شیطان کا طریقہ عداوتِ آدم ہے اور پیغمبر کا طریقہ عداوتِ فساد۔ شیطانی عمل کا محرک ضد اور حسد ہوتا ہے۔ اس لئے وہ "شخص" کو اپنی سرگرمیوں کا نشانہ بناتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں پیغمبرانہ عمل کا محرک برائی کو دور کرنا ہے۔ اس لئے پیغمبر کا سارا زور برائی کے خلاف ہوتا ہے نہ کہ برائی کرنے والے کے خلاف۔

رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم نے مکہ میں تحریک شروع کی تو عمر بن الخطاب آپ کے زبردست مخالف بن گئے مگر آپ نے ایسا نہیں کیا کہ عمر بن الخطاب کو شخصی طور پر ختم کرنے کی مہم شروع کر دیں۔ اس کے بجائے آپ نے یہ دعا فرمائی کہ خدایا عمر ابن الخطاب کے ذریعہ اسلام کو طاقت دے۔ اسی طرح مدینہ میں ایک نام نہاد مسلمان عبد اللہ ابن ابی آپ کے خلاف مسلسل سازشیں کرنے لگا۔ مگر آپ نے ایسا نہ کیا اس کے قتل کا منصوبہ بناتے۔ آپ نے مدینہ کا حاکم ہونے کے باوجود اس کو زندہ رہنے دیا یہاں تک کہ وہ اپنی طبعی موت مرا۔

حقیقت یہ ہے کہ تحریکیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن کا مقصد شعوری یا غیر شعوری طور پر، جاہ و مرتبہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ یعنی دوسرے کے مقابلے میں اپنے کو بڑا بنانا۔ اس قسم کی تحریک ہمیشہ کچھ متعین افراد یا گروہوں کو اپنا نشانہ بناتی ہے۔ ایک شخص یا گروہ کو بڑائی کے مقام تک پہنچنے کے لئے ہمیشہ دوسرا شخص یا گروہ رکاوٹ ہوتا ہے۔ اس لئے حصول جاہ کی تحریکیں ہمیشہ ان لوگوں کے خلاف اٹھتی ہیں جو عملاً جاہ کے مقامات پر قابض ہوں۔

اس کے برعکس معاملہ ان تحریکوں کا ہوتا ہے جو خوف خدا اور فکر آخرت کی بنیاد پر اٹھیں۔ ایسی تحریکوں کی توجہ ہمیشہ اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ برائی کرنے والوں کے اندر یہ جذبہ پیدا کریں کہ وہ اپنی برائی کو چھوڑ دیں اور دنیا و آخرت میں خدا کے غضب سے بچ جائیں۔ ایسی تحریک کو لے کر اٹھنے والوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ برائی کو ایک لمحہ کے لئے برداشت نہیں کر سکتے۔ مگر برائی کرنے والے کو ہر وقت گلے لگانے پر تیار رہتے ہیں۔ برائی کے خلاف اپنی ساری طاقت لگا دینے کے باوجود برائی کرنے والے کے لئے ان کے دل میں خیر خواہی ہوتی ہے اور اس کے حق میں ان کی زبان سے ہمیشہ دعائیں نکلتی رہتی ہیں۔

آپ کو اٹھنا ہے تو برائی کے خلاف اٹھئے نہ کہ برائی کرنے والے کے خلاف۔ کیونکہ برائی کے خلاف اٹھنا پیغمبر کی سنت ہے اور برائی کرنے والے کے خلاف اٹھنا شیطان کی سنت۔

جنگ نہیں

ٹائمس آف انڈیا (۴ دسمبر ۱۹۸۹) میں ایک عالمی جائزہ شروع ہوا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ آج دنیا کے سیاسی مدبرین کس انداز میں سوچتے ہیں۔ اس میں بالکل درست طور پر جدید ذہن کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ عالمی طاقت یا سماجی تبدیلی کے لیے جنگ کے ہتھیار کا استعمال اب ایک ناممکن چیز بن چکا ہے:

War as an instrument of world power or social change is now an impossibility.

موجودہ زمانہ میں مختلف ایسے اسباب پیش آئے ہیں جنھوں نے جنگ کے طریقہ کو ایک ناممکن طریقہ بنا دیا ہے۔ آج کوئی قوم جنگ کرکے وہ فائدہ حاصل نہیں کرسکتی جو قدیم زمانہ میں حکمراں طبقہ اس سے حاصل کیا کرتا تھا۔

جدید صورت حال نے تمام دنیا میں لوگوں کا ذہن بدل دیا ہے۔ تمام لوگ ٹکراؤ کے بجائے گفت وشنید کے طریقہ کی وکالت کرنے لگے ہیں۔ روس اور امریکہ جن کے پاس سب سے زیادہ جنگی طاقت ہے۔ وہ بھی آپس میں مفاہمت کی باتیں کر رہے ہیں تاکہ ان میں ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔

جدید دنیا میں اب صرف ایک قوم کا استثنار ہے جو آج بھی جنگ میں مشغول ہے۔ جس کے رہنما آج بھی جنگ اور تلوار کی اصطلاحوں میں بول رہے ہیں۔ یہ بدقسمتی سے مسلم قوم ہے۔ مسلمان آج بھی ہر جگہ بے فائدہ لڑائی لڑ رہے ہیں۔ مسلم رہنما آج بھی جنگی اصطلاحات میں پرشور تقریریں کرنے میں مشغول ہیں۔

آج انتہائی ضروری ہوگیا ہے کہ مسلمانوں کے اندر بے معنی لڑائی کا مزاج ختم کیا جائے۔ ان کی ذہنی تربیت کے ذریعہ انھیں ایسا بنایا جائے کہ وہ جدید دنیا کو سمجھیں اور تلوار کے بجائے افکار ونظریات کی طاقت سے اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔

یہ صورت حال اللہ کی عظیم نعمت ہے جو عین مسلمانوں کے حق میں ہیں۔ اس طرح خدا تاریخ کو اس میدانِ مقابلہ میں لایا ہے جہاں اسلام واضح طور پر فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ مادی طاقت میں کوئی دوسرا اہلِ اسلام سے آگے بڑھ سکتا ہے۔ مگر فکر ونظریہ کے معاملہ میں اسلام کو اجارہ داری کی حد تک ناقابلِ تسخیر قوت حاصل ہے۔ ہتھیار کے میدان میں فتح اور شکست دونوں کا امکان ہے۔ مگر فکری مقابلہ کے میدان میں اسلام کی فتح یقینی ہے۔ یہاں کوئی اس کے اوپر فتح پانے والا نہیں۔

دین یا قوم پرستی

دین الگ چیز ہے اور قوم پرستی الگ چیز۔ ایک قول یا عمل جو قوم پرستی کے جذبہ کے تحت کیا جائے وہ بہر حال قوم پرستی ہی رہے گا، اس سے کبھی دینی نتائج بر آمد نہیں ہو سکتے، خواہ بظاہر اس کے لئے دین اور اسلام کے الفاظ کیوں نہ استعمال کئے گئے ہوں۔

علاّمہ اقبال نے کہا تھا:

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

یہی بات ہندستان کے پہلے خلاباز راکیش شرما نے اس وقت کہی جب کہ وہ تین سو کیلومیٹر کی بلندی پر خلا میں اڑ رہے تھے۔ ۵ اپریل ۱۹۸۴ کو ہندستانی خلاباز اور زمین پر بیٹھے ہوئے حکومت ہند کے ذمہ داروں کے درمیان ایک بات چیت ہوئی۔ اس بات چیت کا ایک حصہ، اخباری رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا ۶ اپریل ۱۹۸۴) کے مطابق یہ تھا:

Rakesh Sharma told Air Chief Marshal Dilbagh Singh "For the Indian Air Force, the sky is no longer the limit." The Air Cheif Marshal told Sharma that the Indian Air Force was "very proud" of his achievement.

راکیش شرما نے ایر چیف مارشل دلباغ سنگھ سے کہا کہ ہندستانی ہوائیہ کے لئے آسمان اب حد نہیں ہے۔ اس کے جواب میں ایر چیف مارشل نے شرما سے کہا کہ ہندستانی ہوائیہ کو اس کامیابی پر بہت زیادہ فخر ہے۔

مندرجہ بالا دونوں جملوں میں کس قدر مشابہت ہے۔ حالاں کہ ان میں سے ایک جملہ "مومن" کی زبان سے نکلا ہے اور دوسرا جملہ "کافر" کی زبان سے۔ اب چوں کہ مومن کا کلام اور کافر کا کلام دونوں ایک نہیں ہو سکتا، اس لئے ضروری ہے کہ اس یکسانیت کی کوئی دوسری وجہ تلاش کی جائے۔

اس حیثیت سے جب دونوں کی باتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے کلام میں جو مشابہت ہے اس کا سبب قومی جذبہ کی یکسانیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ پہلے شعر کا تعلق ایمان سے ہے اور نہ دوسرے قول کا تعلق کفر سے۔ یہ سراسر قومی جذبہ سے نکلے ہوئے کلام ہیں۔ اقبال چوں کہ مسلم روایات میں پیدا ہوئے اس لئے انھوں نے اپنے قومی جذبہ کا اظہار اسلامی الفاظ میں کیا۔ راکیش شرما کی پرورش وطنیت کے ماحول میں ہوئی اس لئے انھوں نے اپنے قومی جذبہ کے لئے "ہندستان" کا لفظ استعمال کیا۔ دونوں میں صرف ظاہر کا فرق ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

قومی نہ کہ دینی

اخبار ٹیلی گراف (کلکتہ) کی ۱۰ جنوری ۱۹۸۵ میں صفحہ تین پر ایک تصویر ہے۔ اس تصویر میں ایک کالے بچہ کے ساتھ ایک سفید نسل کی بچی بیٹھی ہوئی ہے۔ دونوں ایک کھلی ہوئی کتاب کے سامنے جھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا ہے کہ ایک چھوٹی اسرائیلی لڑکی ایک باتصویر کتاب کے ذریعہ ایتھوپیا کے ایک چھوٹے لڑکے کو عبرانی زبان سکھا رہی ہے۔ یہ تصویر ایلیات کی ہے جو بحر احمر کے کنارے واقع ہے۔ یہ بچہ ان ہزاروں یہودیوں میں سے ایک ہے جو حال میں اسرائیل پہنچے ہیں:

A little Israeli girl using a picture book to teach Hebrew to an Ethiopian boy at Eliat on the Red Sea coast. The boy arrived with thousands of other Ethiopians recently.

۱۹۸۴ میں ایتھوپیا (افریقہ) میں غیر معمولی قحط پڑا۔ انسان اور جانور بھوک سے مرنے لگے۔ یہاں یہودی تقریباً ۲۵ ہزار کی تعداد میں آباد ہیں جن کو فلاشا کہا جاتا ہے۔ اسرائیل کی حکومت نے یہ منصوبہ بنایا کہ ان یہودیوں کو اسرائیل میں بسایا جائے۔ ان کو ایتھوپیا سے اسرائیل لانے کے لئے جو ہوائی سروس جاری کی گئی اس کا سرکاری نام عمل موسٰی (Operation Moses) رکھا گیا۔ اسرائیل کے وزیر اعظم شیمون پیریز (Shimon Peres) نے اسرائیلی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اس عظیم انسانی خدمت کے کام کو ہم جاری رکھیں گے۔ ہم اس وقت تک اس سے باز نہ آئیں گے جب تک ایتھوپیا کا آخری یہودی ہمارے پاس نہ آجائے:

We shall continue this noble and humane rescue act and shall not interrupt it until the last of Ethiopia's Jews has arrived with us.

حضرت موسٰی کے زمانہ میں یہود مصر میں آباد تھے۔ آپ ان کو خدائی منصوبہ کے تحت مصر سے نکال کر سینا میں لے گئے۔ اسی ظاہری مشابہت کی بنا پر ایتھوپیا کے یہودیوں کو وہاں سے نکال کر اسرائیل لے جانے کو مذکورہ نام دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک قومی واقعہ کو دینی اصطلاح میں بیان کرنا ہے۔ یہی مسلمان بھی موجودہ زمانہ میں بڑے پیمانہ پر کر رہے ہیں۔ وہ اپنی قومی تحریک کو دعوت کا عنوان دیتے ہیں۔ وہ اپنی قومی بھگدڑ کو ہجرت کہتے ہیں۔ وہ اپنی قومی لڑائیوں کے لئے جہاد کا پرفخر لفظ پالیتے ہیں۔ مگر ایک چیز جو باعتبار حقیقت قومی ہو وہ خدا کے نزدیک قومی ہی رہے گی۔ دینی الفاظ بولنے سے وہ دینی نہیں ہو جائے گی۔

قومی مقابلے

غالباً ۱۹۳۲ کا واقعہ ہے، ڈی اے وی کالج لاہور میں تاریخ کے استاد لالہ ابلاغ رائے نے ایک مقالہ شائع کیا۔ یہ مقالہ اخبار ٹریبیون میں چھپا۔ اس میں انھوں نے تحقیقات پیش کرتے ہوئے ثابت کیا تھا کہ جنوبی امریکہ کی دریافت کرنے والے ایک ہندو مذہبی رہنما تھے جن کا نام ارجن دیو تھا۔ ارجنٹینا (Argentina) انھیں ارجن دیو کے نام پر ہے جو جنوبی امریکہ کا ایک ساحلی ملک ہے۔

لالہ ابلاغ رائے کا یہ مقالہ شائع ہوا تو مسلمانوں میں کھلبلی شروع ہوئی۔ مسلمانوں کو نظر آیا کہ ہندو ان سے بازی لے گئے ہیں۔ اس کے بعد مولانا ظفر علی خاں اٹھے اور انھوں نے مسلمانوں کے جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے اپنے اخبار زمیندار میں ایک مضمون شائع کیا۔ اس میں انھوں نے ثابت کیا کہ جنوبی امریکہ کی دریافت ایک مسلم درویش حضرت شیخ چلی رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی۔ چنانچہ جنوبی امریکہ کا ایک ملک آج تک انھیں کے نام پر منسوب چلا آرہا ہے۔ اس ملک کا نام چلی (Chile) ہے (ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی، ۱۶ فروری ۱۹۷۷)

یہ ایک دلچسپ مثال ہے جو بتاتی ہے کہ موجودہ صدی کے نصف اول میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کس قسم کے قومی مقابلے جاری تھے۔ اس مزاج کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمان اپنے حقیقی دین کو زندہ کرنے کے بجائے اس کوشش میں لگ گئے کہ وہ ہندو قوم کی ہر چیز کا ایک اسلامی جواب اپنے یہاں فراہم کریں ـــــ جنم اشٹمی کے جواب میں جشن میلاد، ہولی کے جواب میں شب برات، ہندو مہا بھارت کے جواب میں شاہنامہ اسلام، ڈاوری کے جواب میں جہیز، کریاکرم کے جواب میں میت کی رسوم، حتیٰ کہ بت پرستی کے جواب میں قبر پرستی، وغیرہ اس قسم کی بے شمار دھوم جو ہمارے یہاں نظر آتی ہے وہ سب اسی جوابی ذہنیت کا نتیجہ ہے۔

اس کوشش میں مسلمانوں نے اپنے قومی فخر کے لئے تو ضرور نئے نئے سامان فراہم کر لئے مگر اصلی اور حقیقی دین سے وہ دن بدن دور ہوتے چلے گئے۔ ان کا دین حقیقۃً خدا کا دین نہ رہا بلکہ خدا کے دین کا ہندستانی اڈیشن بن کر رہ گیا۔

قومی ریس سے پیدا ہونے والا مذہب قومی مذہب ہے نہ کہ خدائی مذہب ۔ ایسے مذہب سے قومی جذبات کو تسکین مل سکتی ہے، مگر وہ خدا کو خوش کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ خدا اس مذہب کو زندہ کرنے سے خوش ہوگا جو اس نے اتارا ہے نہ کہ اس مذہب سے جو ہم خود اپنے قومی کارخانہ میں ڈھال کر تیار کر لیں۔

کتنا فرق

برطانیہ نے سو سال پہلے ہانگ کانگ کو پٹہ کے تحت چین سے حاصل کیا تھا۔ اس پٹہ کی مدت ۱۹۹۷ میں ختم ہو رہی ہے۔ اس سلسلہ میں دو سال تک چین کی کمیونسٹ حکومت اور برطانیہ کے درمیان بات چیت ہوتی رہی۔ ۲۴ نشستوں کے بعد آخر کار ۲۶ ستمبر ۱۹۸۴ کو ایک معاہدہ پر دونوں کے دستخط ہو گئے۔ اس کے مطابق یکم جولائی ۱۹۹۷ کو ہانگ کانگ چین کے حوالہ کر دیا جائے گا۔

جوائنٹ ڈیکلریشن (نہ کہ ٹریٹی) کے مطابق چین کے قبضہ میں آنے کے بعد بھی اگلی نصف صدی تک ہانگ کانگ اپنی موجودہ حالت پر باقی رہے گا۔ کیمونسٹ اصولوں کے سراسر خلاف یہاں اظہار رائے، اجتماع، اسٹرائک، عبادت اور سفر کی پوری آزادی ہوگی۔ برطانی باشندے یہاں کی سرکاری ملازمتوں میں لئے جا سکیں گے۔ ہانگ کانگ ڈالر بدستور باقی رہے گا، اس فرق کے ساتھ کہ اس پر سے ملکہ برطانیہ کی تصویر حذف کر دی جائے گی۔ معاہدہ بتاتا ہے کہ ہانگ کانگ ایک اسپشیل ایڈمنسٹریٹیو ریجن بن جائے گا۔ مبصر کے الفاظ میں:

> The colony will enjoy a high degree of autonomy. The Socialist system and Socialist politics shall not be practised—and Hong Kong's previous capitalist system and life-style shall remain unchanged for fifty years.

ہانگ کانگ کو اعلیٰ درجہ کی آزادی حاصل رہے گی۔ اشتراکی نظام اور اشتراکی پالیسی زیر عمل نہیں لائی جائے گی۔ ہانگ کانگ کا پچھلا سرمایہ دارانہ نظام اور اس کا طرز زندگی غیر متغیر طور پر ۵۰ سال باقی رہے گا۔

(انڈین اکسپریس ۲۷ ستمبر ۱۹۸۴)

اس طویل معاہدہ میں اور بھی بہت سی باتیں طے کی گئی ہیں، مثلاً یہ کہ کیمونسٹ چین ہانگ کانگ کی ائیرلائن (Cathay Pacific) میں شیئر نہیں خریدے گا۔ ہانگ کانگ کا انتظام ہانگ کانگ کے عوام چلائیں گے۔ البتہ چین کی طرف سے ایک چیف ایگزیکیٹیو وہاں رہے گا۔ چین کے تحت ہانگ کانگ کو آزاد حیثیت (Autonomous status) حاصل رہے گی وغیرہ۔

اس کے عین برعکس مثال مصر کی ہے۔ نہر سوئز برطانیہ اور فرانس کے پاس پٹہ (۱۸۶۹) پر تھی۔ یہ پٹہ کچھ سالوں میں ختم ہونے والا تھا۔ مگر صدر ناصر نے یہ کیا کہ اچانک ۱۹۵۶ میں اس کو قومی ملکیت میں لینے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد مغربی طاقتوں نے اس کا انتقام اس طرح لیا کہ اسرائیل کے ذریعہ مصر کو سوئز سمیت تہس نہس کر ڈالا۔

ہمارا المیہ

سرا ینڈریو ہکسلے (Sir Andrew Huxley) ایک نوبل انعام یافتہ سائنس داں ہیں۔ وہ رائل سوسائٹی (لندن) کے صدر ہیں۔ ۷ جنوری ۱۹۸۴ کو انھوں نے انڈین نیشنل سائنس اکاڈمی (نئی دہلی) میں لکچر دیا۔ اس کا عنوان تھا سائنس اور سیاست (Science and Politics)

انھوں نے کہا کہ سائنس کی تحقیقات میں جو غیر معمولی وسائل درکار ہوتے ہیں وہ اس وقت صرف روس اور امریکہ کو حاصل ہیں۔ برطانیہ میں بھی اس سلسلے میں کافی کام ہو رہا ہے مگر وہ صرف مغربی یورپ کے ساتھ اتحادی پروگرام (Collaborative programme) کے ذریعہ ممکن ہوا ہے نہ کہ ذاتی وسائل کے ذریعہ (ٹائمس آف انڈیا ۱۸ جنوری ۱۹۸۴ء)

انھوں نے بتایا کہ اس معاملہ میں سب سے زیادہ دردناک حال غیر ترقی یافتہ ممالک کا ہے۔ وہ سائنسی تحقیقات میں سب سے پیچھے ہیں حالانکہ صنعتی ممالک بہترین صلاحیتوں کو انھیں زیر ترقی ممالک سے لے رہے ہیں:

> Industrialised countries are drawing the best of the talent from developing countries.

کیسی عجیب بات ہے۔ جن نوجوانوں کے سرپرستوں نے مغربی قوموں سے لڑائی کی تھی کہ وہ ان کے ملکوں کو لوٹ رہے ہیں اور بے پناہ قربانی کے بعد ان کے قبضہ سے آزادی حاصل کی تھی۔ اب انھیں کی بہترین اولاد خود اپنی مرضی سے بھاگ کر ان ملکوں میں جا رہی ہے تاکہ وہ ان کی صلاحیتوں کو لوٹیں اور ان کے ذریعہ اپنی عالمی قیادت کو برقرار رکھیں۔

اس دوسری لوٹ سے بچنے کی واحد صورت وہی ہے جس کو موجودہ زمانہ میں برطانیہ نے اختیار کیا ہے۔ یعنی مختلف ممالک کے مشترکہ وسائل سے اعلیٰ ترین سائنسی تحقیق کا انتظام کرنا تاکہ ان ملکوں کے اعلیٰ سائنسی ذہنوں کو خود اپنے ملک میں کام کے وہی مواقع مل سکیں جس کے لئے وہ مغربی ملکوں میں جاتے ہیں۔ مگر غیر ترقی یافتہ ممالک (تیسری دنیا) میں دو ملک بھی ایسے نہیں ہیں جو حقیقی معنوں میں اتحاد و اشتراک کے ذریعہ کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ تخریب کے عنوان پر لوگوں کو متحد کرنا سب سے زیادہ آسان کام ہے اور تعمیر کے عنوان پر متحد کرنا سب سے زیادہ مشکل کام۔

کیسی عجیب تھی وہ آزادی جو خون کے بہاؤ کے ذریعہ حاصل کی گئی۔ اور کیسی عجیب ہے وہ غلامی جو صلاحیتوں کے بہاؤ (Brain drain) کے ذریعہ دوبارہ ہماری طرف لوٹ آئی ہے۔

خوش فہمیوں کے باوجود

رونالڈ ریگن امریکہ کے سب سے زیادہ معمر صدر ہیں۔ ۷۲ سال کی عمر میں بھی وہ جوانوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے اعضاء میں کسی قسم کی کمزوری محسوس نہیں ہوتی۔ امریکی عوام کو فخر ہے کہ ان کے وھائٹ ہاؤس کا صدر ایک ایسا شخص ہے جو ۷۲ سال کی عمر میں بھی لوہے کے راڈ کی طرح سیدھا کھڑا ہوتا ہے۔ امریکی میگزین پریڈ (Parade) نے صدر امریکہ سے ایک انٹرویو لیا۔ اس نے صدر امریکہ کی صحت کے اصولوں اور ان کی ورزش کے بارہ میں ان سے سوالات کئے۔ اس سلسلے میں سوال و جواب کا ایک حصہ یہ تھا:

Mr. President, what about the food you eat ? Do you follow any special diet which accounts for your glowing health ?
Well, actually, I don't follow any particular diet, nor do I have fads, but I do confess I have a weakness for desserts.
Desserts ?
Yes, something like the Arabian desert with its oil.

جناب صدر، آپ اپنی غذا کے بارہ میں بتائیں۔ کیا آپ کوئی خصوصی غذا کھاتے ہیں جو آپ کی شاندار صحت کا سبب ہے۔ جواب میں صدر امریکہ نے کہا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں کسی خاص غذا کی پابندی نہیں کرتا۔ اور نہ میری کوئی مرغوب چیز ہے۔ گو میں اعتراف کرتا ہوں کہ صحرا میری کمزوری ہے۔ "صحرا" انٹرویور نے تعجب کے ساتھ کہا۔ صدر امریکہ نے جواب دیا۔ ہاں، عرب جیسا صحرا جس کے ساتھ تیل بھی ہو (ٹائمس آف انڈیا ۳۰ جنوری ۱۹۸۴)

مسلم اقلیت کے علاقوں میں مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ اکثریتی فرقہ ان کے قبرستانوں کے اوپر اپنی نئی زندگی کی تعمیر کر رہا ہے۔ مگر مذکورہ واقعہ علامتی شکل میں بتاتا ہے کہ مسلم اکثریت کے ممالک کا حال بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ان ملکوں میں مسلمانوں کے پاس حکومت ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں پر ان کا قبضہ ہے۔ خدا کی دی ہوئی دولت بھی افراط کے ساتھ ان کے پاس موجود ہے۔ مگر حال یہ ہے کہ ایک "کافر اور ظالم" حکمراں فخر کے ساتھ کہتا ہے کہ مسلم ملکوں کی قدرتی دولت کو اپنی خوراک بنانا، یہی میری غیر معمولی صحت کا راز ہے۔

یہ صورت حال مسلمانوں کے لئے زبردست انتباہ ہے۔ کیوں کہ مسلمان جب غیر مسلموں کے استغلال کا شکار ہو جائیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ خدا کی مدد سے محروم ہو چکے ہیں۔

جمہوریت کی قیمت

اسرائیل کا ایک دلچسپ واقعہ نظر سے گزرا۔ اس کے اصل الفاظ یہ تھے:

Worn out after an interminable meeting, a Tel Aviv company director said with a sigh, "If the children of Israel had been led by a committee instead of by Moses, they'd still be in Egypt."

تل ابیب کی ایک کمپنی کا ڈائرکٹر لا متناہی میٹنگوں سے سخت اکتا چکا تھا۔ اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا کہ اگر بنی اسرائیل کی رہنمائی حضرت موسٰی کے بجائے ایک کمیٹی کر رہی ہوتی تو بنی اسرائیل ابھی تک مصر ہی میں ہوتے (ریڈرز ڈائجسٹ اکتوبر ۱۹۸۴)

مجلس اور کمیٹی کی بحثوں کا جن لوگوں کو تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ ان میں کس قدر بے فائدہ باتیں ہوتی ہیں۔ لفظی نکتے، دور از کار امکانات، غیر اہم پیش بندیوں پر لوگ اس قدر بحثیں کرتے ہیں کہ الاماں والحفیظ۔ راقم الحروف اس دنیا میں جن چیزوں سے پناہ مانگتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ خدا اس کو کبھی کسی مجلس یا کمیٹی کا ممبر نہ بنائے۔

کوئی بڑا کام اجتماعی کوشش سے ہوتا ہے۔ اور اجتماعی کوشش میں ہمیشہ بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کی صورت کیا ہو۔ اختلاف رائے کو اتحاد عمل کے ساتھ کس طرح مطابق کیا جائے۔

اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک شخصی اعتماد اور دوسری جمہوریت۔ اول الذکر میں یہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنی اپنی رائے دیتے ہیں مگر بالآخر مرکزی قائد کی رائے کو تمام لوگ بلا بحث مان لیتے ہیں۔ ثانی الذکر میں یہ ہوتا ہے کہ جو معاملہ پیش آتا ہے اس پر ہر شخص کی الگ الگ رائے لی جاتی ہے اور جس طرف رایوں کی کثرت ہوتی ہے اس کو اختیار کر لیا جاتا ہے۔

بظاہر ثانی الذکر طریقہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس طریقہ میں کام کم ہوتا ہے اور بحث مباحثہ زیادہ۔ اسلام میں درمیان کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ ابتدائی مرکزی قائد کو منتخب کرنے میں عوامی رائے کا پورا لحاظ کیا جاتا ہے مگر جب عوامی رائے سے ایک امیر کا انتخاب ہو جائے تو اس کو اسی طرح مکمل اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں جیسے موجودہ زمانہ میں امریکہ کے صدر کو۔

انسان کی بے بسی

ٹائم میگزین (۲۴ اگست ۱۹۹۲) کی کور اسٹوری صدر امریکہ جارج بش کے بارہ میں ہے۔ اس کے صفحہ ۲۰ پر جارج بش کی ایک تصویر ہے۔ اس تصویر میں صدر امریکہ اپنے ایک ہاتھ سے اپنا سر پکڑے ہوئے ہیں۔ چہرے پر فکرمندی کے آثار ہیں۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا ہے کہ بش ذہنی طور پر ختم نظر آتے ہیں :

Explaining his woes with a terse answer, "the economy", Bush seemed intellectually spent.

اس شمارہ میں ایک خصوصی انٹرویو بھی شامل ہے جو ٹائم کے نمائندہ مائیکل کریمر اور ہنری مولر نے مرتب کیا تھا، اس انٹرویو کا ایک سوال و جواب یہ ہے :

Q. When you lie awake at night thinking about the crises that have perhaps not yet occurred in this new world order, what worries you most?

A. Unpredictability. You can't see very clearly where everything's going to come out. You see great problems, economic problems in the former Soviet Union, and you see ancient ethnic rivalries impacting over all that. I worry about the Middle East still, though I'm very pleased with the great progress that's been made. But you have some very bad actors, Saddam Hussein being one.

(*Time* August 24, 1992)

انٹرویور نے سوال کیا کہ جناب صدر، رات کے وقت جب آپ بستر پر ہوتے ہیں اور ان آنے والے بحرانوں کے بارہ میں سوچ رہے ہوتے ہیں جو شاید ابھی اس نئے عالمی نظام میں وقوع میں نہیں آئے، اس وقت کیا چیز ہے جو آپ کو زیادہ پریشان کرتی ہے۔

صدر امریکہ نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ معاملات کا ناقابل پیشین گوئی ہونا۔ آدمی بہت زیادہ واضح طور پر دیکھ نہیں سکتا کہ چیزوں کا نتیجہ کیا نکلنے والا ہے، ہم بڑے بڑے مسائل کو دیکھ رہے ہیں۔ جیسے سابق سوویت یونین میں اقتصادی مسئلہ۔ اسی طرح قدیم نسلی رقابتیں جو ان سب پر چھا جاتی ہیں۔ میں اب بھی شرق اوسط کے بارہ میں متردد ہوں۔ اگرچہ جو عظیم پیش رفت ہوئی ہے اس سے میں بہت خوش ہوں۔ مگر ہم کو کچھ بہت برے کرداروں کا سامنا ہے۔ صدام حسین انھیں میں سے ایک ہے۔

ایک رپورٹ

مسیحی چرچ نے عالمی سطح پر ایک مذہبی جائزہ لیا ہے۔ اس کا خلاصہ انگریزی میگزین کرسچینیٹی ٹوڈے نے شائع کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ ۱۹۳۴ سے اب تک اسلام میں ۵۰۰ فی صد کی رفتار سے اضافہ ہوا ہے۔ جب کہ اسی مدت میں مسیحیت میں صرف ۴۷ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ دونوں میں سے ہر ایک مذہب کے ماننے والوں کی تعداد اس وقت ساری دنیا میں ایک بلین ہے۔ ہندوازم کو ماننے والوں کی تعداد ۵۰۰ ملین ہے۔ بدھزم کو ماننے والوں کی تعداد ۲۴۵ ملین ہے اور یہودیت کو ماننے والوں کی تعداد ۱۵ ملین :

Christianity Today magazine (March 1992) reported that since 1934, Islam has grown by 500 per cent and Christianity by 47 per cent. Both religions have about a billion followers, followed by Hinduism with 500 million followers, Buddhism with 245 million followers and Judaism with about 15 million followers.

اس جائزہ کے مطابق، ۶۰ سال پہلے، اسلام کے ماننے والوں کے مقابلہ میں مسیحیت کو ماننے والوں کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ مگر آج دونوں مذہب کو ماننے والوں کی تعداد تقریباً یکساں ہو چکی ہے۔ یہ رفتار اگر اسی طرح جاری رہتی ہے تو اکیسویں صدی کی آمد تک اہل اسلام کی تعداد یقینی طور پر تمام مذاہب کے ماننے والوں کی تعداد سے زیادہ ہو جائے گی۔

تاہم صرف تعداد کا اضافہ خوش ہونے کے لیے کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس بڑھتی ہوئی تعداد کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان ہر جگہ تعلیم میں پیچھے ہیں۔ علی گڑھ (ہندستان) میں مسلم کالج سو برس پہلے قائم ہوا جو بعد کو مسلم یونی ورسٹی بن گیا۔ مسلمان فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ مسلم یونی ورسٹی صرف ایک ادارہ نہیں، وہ ایک عظیم تحریک ہے۔ مگر ایک حالیہ جائزہ سے معلوم ہوا ہے کہ علی گڑھ ضلع کے دیہاتوں میں آج بھی صرف دو فی صد مسلمان ایسے ہیں جن کو تعلیم یافتہ کہا جا سکتا ہے (اسٹیٹسمین ۱۲ اپریل ۱۹۹۲) کتنا زیادہ کام ہو چکا۔ اس کے باوجود کتنا زیادہ کام کرنا ابھی باقی ہے۔

ایک سبق

" اللہ تعالیٰ ہی کو مقدم کرو اور دین کو دنیا پر ترجیح دو۔ جب تک انسان اپنے اندر دنیا کا کوئی حصہ بھی پاتا ہے وہ یاد رکھے کہ ابھی وہ اس قابل نہیں کہ دین کا نام بھی لے۔ یہ ایک غلطی لوگوں کو لگی ہوئی ہے کہ دنیا کے بغیر دین حاصل نہیں ہوتا۔ انبیاء علیہم السلام جب دنیا میں آئے ہیں، کیا انھوں نے دنیا کے لئے سعی اور مجاہدہ کیا ہے یا دین کے لئے؟ اور باوجود اس کے کہ ان کی ساری توجہ اور کوشش دین ہی کے لئے ہوتی ہے پھر کیا وہ دنیا میں نامراد رہے۔ کبھی نہیں۔ دنیا خود ان کے قدموں پر آکر گری۔ یہ یقیناً سمجھو کہ انھوں نے دنیا کو گویا طلاق دے دی تھی۔ لیکن یہ ایک عام قانون قدرت ہے کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں وہ دنیا کو ترک کرتے ہیں۔ اس سے یہ مراد ہے کہ وہ دنیا کو اپنا مقصود اور غایت نہیں ٹھہراتے۔ اور دنیا ان کی خادم اور غلام ہو جاتی ہے۔ جو لوگ برخلاف اس کے دنیا کو اپنا اصل مقصود ٹھہراتے ہیں خواہ وہ دنیا کو کسی قدر بھی حاصل کریں مگر آخر ذلیل ہوتے ہیں۔ سچی خوشی اور اطمینان اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے عطا ہوتا ہے۔ یہ مجرد دنیا کے حصول پر منحصر نہیں ہے۔" (ملفوظات جلد ہفتم صفحہ ۳۱۶ ـ ۳۱۷)

اوپر جو عبارت نقل کی گئی، وہ ایک اقتباس ہے۔ اس کو پڑھئے۔ بظاہر یہ کسی مسلمان بزرگ کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ در اصل مرزا غلام احمد قادیانی کا ملفوظ ہے جو قادیان کے ہفت روزہ بدر (۳۱ مئی ۱۹۹۰) کے صفحہ اول پر چھپا ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کو تمام مسلم علماء نے متفقہ طور پر کافر قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود ان کے "ملفوظات" میں ایسی باتیں ملتی ہیں جن کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ وہ کسی سچے بزرگ کا کلام ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صرف اچھا کلام اس بات کا ثبوت نہیں کہ اس کو کہنے والا اچھا انسان یا صحیح انسان بھی ضرور ہے۔ کسی انسان کو سمجھنے کے لئے اس کے پورے کلام اور اس کی پوری زندگی کو دیکھنا چاہئے نہ کہ صرف جزئی کلام یا جزئی زندگی کو۔ کسی انسان کے بارہ میں حکم لگانے کے لئے اس کی تقریر یا تحریر کا صرف ایک اقتباس کافی نہیں۔

نادان دوستوں سے بچاؤ

ایک شخص کے پاس ایک گدھا تھا۔ وہ اس گدھے پر سواری کرتا تھا۔ ایک روز آدمی اس پر چڑھا تو گدھے نے اس کو زمین پر پٹک دیا۔ آدمی کو سخت چوٹ آئی۔ مالک کی چوٹ دیکھ کر گدھا سنجیدہ ہوگیا اور اس کو دوبارہ اپنی پیٹھ پر بٹھاکر روانہ ہوا۔ مالک خاموش ہوگیا کہ دیکھو یہ گدھا کہاں جاتا ہے۔ گدھا اس کو لے کر سیدھا اسپتال پہنچا۔ آدمی کے محلہ والوں کو جب معلوم ہوا کہ گدھے نے اس کو پیٹھ سے گرا دیا تھا اور اس کے بعد اس کو اٹھا کر اسپتال لے گیا تو انھوں نے اس آدمی کو مبارک باد دی کہ تم بڑے خوش نصیب ہو کہ تم کو ایسا اچھا گدھا ملا ہے۔ آدمی نے کہا: ہاں گدھا تو اچھا ہے مگر وہ مجھ کو جہاں لے گیا وہ مویشیوں کا اسپتال تھا۔

یہ ایک تمثیل ہے جو یہ بتاتی ہے کہ اخلاص کے ساتھ عقل بھی ضروری ہے۔ آدمی اگر بے وقوف ہو تو اس کا اخلاص بھی ویسا ہی ہوگا جیسا مذکورہ گدھے کا اخلاص۔ وہ ایک آدمی کی تکلیف پر دکھی ہوگا اور اس کو اپنی پیٹھ پر لاد کر اسپتال لے جائے گا۔ مگر وہ جس اسپتال میں اس کو پہنچائے گا وہ "مویشیوں" کا اسپتال ہوگا نہ کہ "آدمیوں" کا اسپتال۔

بدقسمتی سے موجودہ زمانہ میں ہماری قوم اسی قسم کے مخلص نادانوں کی مہربانیوں کا شکارگاہ بنی ہوئی ہے۔ ہر قائد نہایت اخلاص اور دردمندی کے ساتھ قوم کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ مگر وہ قوم کی اصلاح کے لئے ایسی تدبیریں کرتا ہے جو قوم کے مرض کو اور بڑھانے والی ہوں نہ کہ اس کو گھٹانے والی۔

ہماری جدید قومی تاریخ کا سب سے زیادہ المناک واقعہ یہ ہے کہ ہر قائد کو لاکھوں، بعض اوقات کروروں ساتھی اور بے شمار اسباب و وسائل ملے۔ ہر قائد اپنے مقررہ نشانہ کو حاصل کرنے میں غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔ مگر اس کے باوجود قوم کی مغلوبیت اور زبوں حالی میں کوئی کمی نہ ہوسکی۔ بلکہ مسائل کی پیچیدگیاں دن بدن بڑھتی چلی گئیں۔ شان دار کامیابیوں کے باوجود شان دار ناکامی کی وجہ یہی مخلصانہ نادانی ہے۔ ہر قائد قوم کو اپنی پیٹھ پر لاد کر اسپتال پہنچا رہا ہے۔ مگر وہ جس اسپتال میں پہنچاتا ہے وہ مویشیوں کا اسپتال ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مویشیوں کے اسپتال کے علاج سے انسان کا مرض اچھا نہیں ہوسکتا ـــــ چھوٹی سی بات پر لڑکر بڑے نقصان کو دعوت دینا، ایک معمولی مسئلہ کے نام پر ادھم مچا کر دوسرے ناقابل حل مسائل کھڑے کرلینا، جلسے جلوس کے تماشوں کو عہد ساز اور تاریخ آفریں بتا کر قوم کی بے حساب طاقت اس میں برباد کردینا، سب اسی نادانی کی مثالیں ہیں (۲۸ مئی ۱۹۸۱)

شیطانی فریب

۲۵ دسمبر ۱۹۸۴ کو میری ملاقات ایک مصری نوجوان سے ہوئی۔ وہ لندن کے ایک عربی رسالہ کے نامہ نگار ہیں۔ یہ عربی رسالہ ایرانی انقلاب کی حمایت میں نکالا گیا ہے۔ مصری نوجوان سے میری جو گفتگو ہوئی اس کا ایک حصہ یہ تھا:

"میں امام خمینی کا عاشق ہوں"

"کیوں"

"وہ جدید تاریخ کے پہلے مسلم قائد ہیں جنھوں نے اسلام دشمن طاقتوں کو ذلت آمیز شکست دی"

یہ گفتگو بتاتی ہے کہ بہت سے مسلمان جو امام خمینی کے پرجوش حامی ہیں اس کا اصل راز کیا ہے۔ اس کا راز تمام تر منفی ہے نہ کہ مثبت۔ جو لوگ قومی اور سیاسی اسباب کے تحت مغربی قوموں کی نفرت اپنے دلوں میں لئے ہوئے تھے انھوں نے خمینی انقلاب کے واقعہ میں یہ تسکین پالی کہ اس نے ـــــ ہم کو ذلیل کرنے والوں کو ذلیل کر دیا۔ امام خمینی کی یہ حمایت مفروضہ اسلام دشمنوں کو شکست دینے کی بنا پر ہے نہ کہ خود اسلام کو قائم کرنے کی بنا پر۔ اس خوشی کا راز قومی مراد کو پالینا ہے نہ کہ اسلامی مراد کو پالینا۔

لیکن زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو یہ منفی بنیاد بھی محض خیالی ہے۔ غور کیجئے کہ وہ کون ہے جس کو امام خمینی نے "ذلت آمیز" شکست دی ہے۔ وہ در اصل خود ایران کا مسلم بادشاہ ہے نہ کہ وہ اسلام دشمن طاقتیں جن کو روس اور امریکہ کہا جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ امام خمینی کی "فتح" کا تعلق امریکہ اور روس سے نہیں، بلکہ خود ایران کے مسلم بادشاہ سے ہے۔ پرجوش مجاہدین نے اولاً شاہ ایران کو "دشمنوں کا ایجنٹ" کا لقب دیا۔ اس کے بعد اس کو فتح کرکے اعلان کر دیا کہ ہم نے اسلام دشمن طاقتوں کے اوپر فتح پائی ہے۔

اسی کو قرآن میں تزئین اعمال کہا گیا ہے۔ یعنی برے اعمال کو اچھا کرکے دکھانا۔ مسلمان آج اسی شیطانی فریب میں مبتلا ہیں۔ وہ ایک مسلمان کو قتل کرتے ہیں اور فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم نے ایک مرتد کو قتل کیا ہے۔ وہ اپنے بھائی کو ذلیل کرتے ہیں اور یہ کہہ کر خوش ہوتے ہیں کہ ہم اسلام دشمن عناصر کو ذلیل کر رہے ہیں۔ وہ اپنے حکمراں کو تخت سے اتارتے ہیں اور پھر اس طرح یوم فتح مناتے ہیں جیسے انھوں نے کافروں اور مشرکوں کے اوپر غلبہ حاصل کر لیا ہو۔

عبرت ناک

عراق۔ایران جنگ کو اب تقریباً آٹھ سال پورے ہو رہے ہیں۔ اس تباہ کن جنگ کی خبریں اخبارات میں آتی رہتی ہیں۔ امریکی میگزین ٹائم (۴ اپریل ۱۹۸۸) نے اپنے صفحہ ۱۱ پر بعض تصویریں چھاپی ہیں۔ اس تصویر میں ایک کُرد علاقہ کو دکھایا گیا ہے جہاں ایک وحشیانہ بمباری کے نتیجہ میں عورت اور مرد اور بچے انتہائی بے کسی کی حالت میں مرے ہوئے پڑے ہیں۔

اس رپورٹ کو پڑھنے کے بعد ایک اسرائیلی شہری کیرول ڈیزنٹ (Carol Dezent) نے ٹائم کو ایک خط لکھا ہے جو اس کے شمارہ ۹ مئی ۱۹۸۸ میں چھپا ہے۔ کیرول ڈیزنٹ نے اپنے خط میں کہا ہے کہ میں نے اس سے پہلے اس قدر ہولناک جنگی تصویریں نہیں دیکھیں۔ اگر دنیا اسرائیل کی حالیہ کارروائیوں کو اتنا غیر منصفانہ سمجھتی ہے تو معصوموں کے اس اجتماعی قتل کے خلاف اس کی چیخ پکار کہاں ہے :

If the world deems Israel's recent actions so unjust, where is the thunders outcry against this mass killing of innocents?

اس میں شک نہیں کہ عراق۔ایران جنگ میں خود مسلمانوں کے ہاتھ سے مسلمان جس طرح مارے جا رہے ہیں وہ وحشت اور بربریت میں اپنی مثال نہیں رکھتی۔ مگر یہ صرف عراق اور ایران کا مسئلہ نہیں۔ یہی تمام مسلم دنیا کا مسئلہ ہے۔ آج مسلمان کو مسلمان کے ہاتھ سے جو نقصان پہونچ رہا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو کافروں اور مشرکوں کے ذریعہ انھیں پہونچ رہا ہے۔ ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات میں "ہندوؤں" کے ہاتھ سے مسلمانوں کو جو نقصان پہونچتا ہے اس سے ہزاروں گنا زیادہ نقصان خود مسلمان اپنے بھائیوں کو پہونچا رہے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یہاں مسلمان دوسرے مسلمان کا ایک مکان ہڑپ کرتا ہے تو ایران اور عراق میں پوری پوری بستی کو بم سے اڑا دیا جاتا ہے۔ یہاں لوگوں کے بس میں کردار کشی ہے تو وہ کردار کشی کر رہے ہیں۔ وہاں کے حکمراں جسم کشی پر قادر ہیں، اس لیے وہ بمباری کر کے جسم کے چیتھڑے اڑا رہے ہیں۔

لعنت کیا ہے

یہود میں جب بگاڑ آیا تو پیغمبروں کے ذریعہ ان پر لعنت کی گئی۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا اُن پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے نکل جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو اپنے درمیان ہونے والی بُرائی سے روکتے نہ تھے۔ کیسا بُرا کام تھا جو وہ کر رہے تھے۔ تم اُن میں سے بہتوں کو دیکھو گے کہ کفر کرنے والوں سے دوستی رکھتے ہیں۔ کیسی بُری چیز ہے جس کو وہ اپنے آگے بھیج رہے ہیں جس سے اللہ ان پر ناراض ہوا اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔ اور اگر وہ اللہ پر اور رسول پر اور جو کچھ اس پر اترا ہے اس پر ایمان لاتے تو وہ ان کو دوست نہ بناتے، مگر ان میں سے اکثر نافرمان ہیں (مائدہ ۷۸ - ۸۱)

لعنت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پیغمبروں نے آکر یہود کے سامنے یہ الفاظ دہرائے کہ "تم پر لعنت ہے" یا "تم ملعون ہو"۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ان کے مذہبی بھرم کو کھولا۔ یہود عملاً اپنی خواہشات اور اپنے قومی تعصبات پر چل رہے تھے مگر اپنی اس روش کو مذہب کا نام دیتے تھے۔ انھوں نے خدائی تعلیمات کی خود ساختہ تشریح کر کے اس کو اپنے حسبِ حال بنالیا تھا۔ پیغمبروں نے یہ کیا کہ ان کے اِس فریب کو بے نقاب کیا۔ ان کا تجزیہ کر کے کھول دیا کہ وہ کیا ہیں اور اپنے کو کیا ظاہر کر رہے ہیں۔

مذکورہ آیت میں بتایا گیا ہے کہ یہود پر یہ لعنت حضرت داؤد اور حضرت مسیح کے ذریعہ کی گئی۔ ان پیغمبروں کی تقریریں آج بھی بائبل میں موجود ہیں۔ ان کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس "لعنت" کی عملی صورت کیا تھی۔ یہاں ہم حضرت داؤد کے اقوال کا کچھ حصہ نقل کرتے ہیں:

خدا شریر سے کہتا ہے۔ تجھے میرے آئین بیان کرنے سے کیا واسطہ۔ اور تو میرے عہد کو اپنی زبان پر کیوں لاتا ہے۔ جب کہ تجھے تربیت سے عداوت ہے۔ اور تو میری باتوں کو پیٹھ پیچھے پھینک دیتا ہے۔ تو چور کو دیکھ کر اس سے مل گیا۔ اور تو زانیوں کا شریک رہا ہے۔ تیرے منھ سے بدی نکلتی ہے۔ اور تیری زبان فریب گھڑتی ہے۔ تو بیٹھا بیٹھا اپنے بھائی کی غیبت کرتا ہے۔ اور اپنی ہی ماں کے بیٹے پر تہمت لگاتا ہے۔ تو نے گمان کیا کہ میں بالکل تجھ ہی سا ہوں۔ لیکن میں تجھے ملامت کر کے ان کو تیری آنکھوں کے سامنے ترتیب دوں گا۔ اب اے خدا کو بھولنے والو اسے سوچ لو۔ ایسا نہ ہو کہ میں تم کو پھاڑ ڈالوں اور کوئی چھڑانے والا نہ ہو۔ جو شکر گزاری کی قربانی گزرانتا ہے وہ میری تمجید کرتا ہے۔ اور جو اپنا چال چلن درست رکھتا ہے اس کو میں خدا کی نجات دکھاؤں گا (زبور ۵۰)

بائبل کی زبان سے

رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ درخت کاٹ ڈالو اور یروشلم کے مقابل دمدمہ باندھو۔ یہ شہر سزا کا سزاوار ہے۔ اس میں ظلم ہی ظلم ہے۔ جس طرح پانی چشمہ سے پھوٹ نکلتا ہے اسی طرح شرارت اس سے جاری ہے۔ ظلم اور ستم کی صدا اس میں سنی جاتی ہے۔ اے یروشلم تربیت پذیر ہو، تا نہ ہو کہ میرا دل تجھ سے ہٹ جائے۔ نہ ہو کہ میں تجھے ویران اور غیر آباد زمین بنا دوں۔

رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ دیکھ، ان کے کان نامختون ہیں۔ اور وہ سن نہیں سکتے۔ دیکھ خداوند کا کلام ان کے لئے حقارت کا باعث ہے۔ وہ اس سے خوش نہیں ہوتے۔ اس لئے میں خداوند کے قہر سے لبریز ہوں۔ ان کے گھر کھیتوں اور بیویوں سمیت اوروں کے ہو جائیں گے کیونکہ خداوند فرماتا ہے میں اپنا ہاتھ اس ملک کے باشندوں پر بڑھاؤں گا۔ اس لئے کہ چھوٹوں سے بڑوں تک سب کے سب لالچی ہیں۔ اور نبی سے کاہن تک ہر ایک دغا باز ہے۔ کیوں کہ وہ میرے لوگوں کے زخم کو یوں ہی سلامتی سلامتی کہہ کر اچھا کرتے ہیں حالاں کہ سلامتی نہیں ہے۔

خداوند یوں فرماتا ہے کہ راستوں پر کھڑے ہو اور دیکھو اور پرانے راستوں کی بابت پوچھو کہ اچھی راہ کہاں ہے۔ اسی پر چلو اور تمہاری جان راحت پائے گی۔ پر انھوں نے کہا کہ ہم اس پر نہ چلیں گے۔

اس سے کیا فائدہ کہ سبا سے لوبان اور دور کے ملک سے اگر میرے حضور لاتے ہیں۔ تمہاری سوختنی قربانیاں مجھے پسند نہیں۔ اور تمہارے ذبیحوں سے مجھے خوشی نہیں۔ اس لئے خداوند یوں فرماتا ہے کہ دیکھ میں ٹھوکر کھلانے والی چیزیں ان لوگوں کی راہ میں رکھ دوں گا۔ اور باپ اور بیٹے باہم ان سے ٹھوکر کھائیں گے۔ ہمسایہ اور ان کے دوست ہلاک ہوں گے۔ میدان میں نہ نکلنا اور سڑک پر نہ جانا، کیوں کہ ہر طرف دشمن کی تلوار کا خوف ہے۔

وہ سب کے سب نہایت سرکش ہیں۔ وہ غیبت کرتے ہیں۔ وہ تو تانبہ اور لوہا ہیں۔ وہ سب کے سب معاملہ کے کھوٹے ہیں۔ دھونکنی جل گئی۔ سیسہ آگ سے بھسم ہو گیا۔

وہ مردود چاندی کہلائیں گے، کیوں کہ خداوند نے ان کو رد کر دیا ہے۔ (یرمیاہ، باب ۶)

برائی کی علامت

۱۳ مئی ۱۹۸۱ کو دنیا کی سب سے زیادہ گرما گرم خبر یہ تھی کہ ویٹیکن (اٹلی) کے پوپ جان پال دوم پر ایک شخص نے پستول سے قاتلانہ حملہ کیا۔ پوپ شدید طور پر زخمی ہوئے تاہم وہ بچ گئے۔

حملہ کرنے والا ایک ترک نوجوان محمد علی اغسا تھا۔ اس کو پولیس نے فوراً گرفتار کر لیا۔ پوچھ تاچھ کے دوران محمد علی اغسا نے بتایا کہ وہ مظلوم اور پس ماندہ قوموں کا حامی ہے۔ وہ دنیا کے ایک ایسے بڑے کو قتل کرنا چاہتا تھا جو سامراج کی علامت (Symbol of Imperialism) ہو۔ اس نے بتایا کہ اس نے پہلے برطانیہ کی ملکہ الزبتھ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ پھر یہ سوچ کر ان کو چھوڑ دیا کہ وہ ایک عورت ہے۔ اس کے بعد اس نے چاہا کہ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر کرٹ والڈ ہائم کو قتل کرے۔ مگر وہ امریکہ میں رہتے ہیں اور امریکہ پہنچنے کے ذرائع اس کے پاس نہ تھے۔ بالآخر اس نے اٹلی کے پوپ کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا۔ تحقیق کے دوران معلوم ہوا کہ محمد علی اغسا ایک مخلص مسلمان ہے۔ وہ فرائض کا پابند ہے۔ وہ شراب اور سگرٹ اور سور کے گوشت سے مکمل پرہیز کرتا ہے۔ مظلوم انسانوں کا اس کو اتنا درد ہے کہ اس نے بستر پر سونا چھوڑ دیا ہے۔ وہ رات کے وقت کرسی پر بیٹھے بیٹھے اپنی میز پر سر رکھ کر تھوڑی دیر کے لئے سوتا ہے اور اس کے بعد اپنے کام میں مشغول ہو جاتا ہے۔

ترک نوجوان کی یہ کہانی موجودہ زمانہ میں ہمارے بیشتر لیڈروں کی کہانی ہے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے ذوق اور حالات کے لحاظ سے یہ کیا کہ کسی حکمراں، کسی لیڈر، کسی قوم یا کسی خاندان کو برائی کی علامت قرار دے لیا اور بس اس کو نیچا دکھانے یا اس کو ختم کرنے میں اپنی ساری طاقت لگادی۔ ہمارے لیڈروں میں سے اکثر اس اعتبار سے کامیاب رہے کہ انھوں نے جس کو برائی کی علامت سمجھا تھا اس کا کسی نہ کسی طرح خاتمہ ہو گیا مگر اس کے باوجود برائی اپنی پوری طاقت کے ساتھ باقی رہی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ برائی کا بے حد ناقص اندازہ ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ کسی خاص شخص یا خاص گروہ میں مجسم ہوئی ہے۔ اس قسم کی چیز فوری شہرت اور قیادت حاصل کرنے میں ضرور کارآمد ہو سکتی ہے، مگر اس قسم کی چیزوں سے کبھی برائی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ برائی کی جڑیں ہمیشہ اس سے بہت زیادہ دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں کہ ایک علامتی شخصیت کو ہلاک کر کے ان کا خاتمہ کیا جا سکے۔ یہ دراصل سستا کریڈٹ لینے کی کوشش ہے اور سستا کریڈٹ خدا کی اس محکم کائنات میں کبھی کسی کو نہیں ملتا۔

نادانی کی سیاست

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴) میں ایک طرف برطانیہ اور اس کے حلیف تھے جن کو اتحادی طاقتیں (Allied Powers) کہا جاتا تھا۔ دوسری طرف جرمنی اور اس کے حلیف تھے جن کو محوری طاقتیں (Axis Powers) کہا گیا۔ اس جنگ میں ترکوں نے اتحادیوں کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا۔ اسی زمانہ میں لندن ٹائمس نے اپنے ایک مضمون میں ترکوں کو مشورہ دیا کہ وہ جنگ سے الگ رہیں۔ مولانا محمد علی اس جنگ میں اپنے دشمن انگریز کو ان کے مخالفوں کے ہاتھوں شکست کھاتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے، چنانچہ وہ لندن ٹائمس کے مشورہ کو پڑھ کر بے قابو ہو گئے۔ انھوں نے چالیس گھنٹہ کی لگاتار محنت کے بعد اپنے انگریزی اخبار کامریڈ کے لئے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا: ترکوں کا انتخاب (Choice of the Turks)

مولانا محمد علی کے اس مشہور ترین مضمون میں ترکوں کو پُرزور مشورہ دیا گیا کہ وہ جرمنی کے ساتھ ہو کر انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے کے فیصلہ پر قائم رہیں۔ مولانا محمد علی کے نزدیک دو ممکن راستوں میں سے صحیح راستہ ترکوں کے لئے یہ تھا کہ وہ انگریزوں کے مقابلہ میں جرمنوں کے محاذ میں شامل ہو جائیں۔

مگر جنگ کا نتیجہ مولانا محمد علی کی خواہشوں کے خلاف نکلا۔ جنگ ختم ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ جرمنوں کی شکست کے ساتھ ترکوں کے لئے بھی شکست کا پیغام بن کر آئی ہے۔ اس کے بعد انگریزوں نے ترکوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو کوئی فاتح قوم مفتوح قوم کے ساتھ کرتی ہے۔ اب مولانا محمد علی دوبارہ بے تاب ہو گئے۔ وہ مسلمانوں کا ایک وفد لے کر لندن گئے تاکہ ہندستان کے انگریز وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ سے ملاقات کریں۔ مگر وائسرائے نے ان سے ملاقات نہ کی اور انھیں ناکام واپس آنا پڑا۔ اس کے بعد وہ دوسرے وفد کے ساتھ ۱۹۲۰ میں دوبارہ لندن گئے اور انگریزی قوم اور انگریز حکمرانوں کو مسلمانان ہند کے "جذبات" سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ وہاں انھوں نے چند تقریریں کیں، صرف یہ سننے کے لئے کہ آپ نے جب نازک وقت میں ہمارے جذبات کا لحاظ نہ کیا تو آپ کیسے امید رکھتے ہیں کہ ہم آپ کے جذبات کا لحاظ کریں گے۔

کوئی فاتح قوم جنگ کے بعد ایسے گروہ سے رعایت نہیں کرتی جس نے جنگ کے زمانہ میں اس کے دشمنوں کا ساتھ دیا ہو۔ چنانچہ برطانیہ کی اعلی سیاسی شخصیتوں نے مولانا محمد علی سے ملاقات بھی نہ کی۔ اب فیصلہ کی طاقت اتحادیوں کی طرف جا چکی تھی ان کے نزدیک محمد علی کا کیس اب حق کا کیس نہیں تھا بلکہ مجرم کی چیخ پکار کا کیس تھا۔ انھوں نے ترکوں کی مخالفانہ کارروائی کا یہ بدلہ لیا کہ ترکی کے حصے بخرے کر کے ترکی کی عظیم خلافت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

اصل مسئلہ

فریڈرک اعظم (۱۷۱۲ - ۱۷۸۶) روس کا بادشاہ تھا۔ اس کو ملک میں وصول ہونے والے ٹیکس کی مقدار کم نظر آئی۔ اس نے ٹیکس کی شرح بڑھادی۔ تاکہ اس کے خزانہ میں زیادہ مقدار میں رقم جمع ہوسکے۔ مگر اس کے بعد وصول شدہ ٹیکس کی جو رقم خزانہ میں آئی وہ پچھلے سالوں سے کچھ زیادہ نہ تھی۔ بادشاہ نے اپنے درباریوں سے کہا کہ کیا بات ہے، ٹیکس کی شرح میں اضافہ کے باوجود ٹیکس کی رقم میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔

دربار میں ایک پرانا فوجی جنرل تھا۔ اس نے بادشاہ کے سوال کا جواب عملی صورت میں دیا۔ اس نے برف کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں لے کر اس کو اوپر بلند کیا۔ اور لوگوں سے کہا کہ اس کو دیکھ لیجئے کہ یہ کتنا بڑا ہے۔ اس کے بعد اس نے برف کو اپنے قریب کے آدمی کو دیا اور اس سے کہا کہ اس کو دست بدست بادشاہ تک پہونچاؤ۔ اب ایک نے دوسرے کو اور دوسرے نے تیسرے کو دیتے ہوئے برف کو آگے بڑھایا۔ یہاں تک وہ بادشاہ تک پہونچ گیا۔ برف جب بادشاہ تک پہونچا تو وہ پگھلتے پگھلتے مونگ پھلی کے دانہ کے برابر ہوچکا تھا۔

اس مثال سے مذکورہ جنرل نے بادشاہ کو یہ سبق دیا کہ سرکاری مالیہ میں کمی کی وجہ عمال کی بدعنوانی ہے نہ کہ ٹیکس کی شرح میں کمی۔ اگر عمال کے اندر بدعنوانی کو ختم نہ کیا جائے تو وصول شدہ رقم کا بڑا حصہ ان کی جیب میں جاتا رہے گا اور حکومت کے حصہ میں آنے والی رقم بدستور وہی کی وہی رہے گی۔

یہی صورت حال آج ہندستان کی ہے، ہمارے یہاں ہر سال ٹیکسوں میں اضافہ کیا جارہا ہے۔ مگر حکومت کو ملنے والی رقم میں مطلوبہ اضافہ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ حد درجہ بڑھے ہوئے کرپشن کی وجہ سے ٹیکس کی پوری رقم حکومت کے خزانہ میں نہیں پہونچتی۔ وہ افسروں کی جیب میں چلی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ واشنگٹن پوسٹ کی رپورٹ کے مطابق ہندستان اس وقت دنیا کا چوتھا سب سے زیادہ مقروض ملک ہے۔ ہندستان پر اس وقت جو غیر ملکی قرضہ ہے، اس کی مقدار ترسٹھ ارب ڈالر ہے۔

ہندستان کے اقتصادی مسئلہ کا حل کرپشن کو گھٹانا ہے نہ کہ ٹیکس کو بڑھانا۔

سیاسی اخلاقیات

۱۹۳۰ میں ہندستان میں مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں ستیہ گرہ کی تحریک شروع ہوئی۔ اس سلسلہ میں جواہر لال نہرو گرفتار کرکے جیل بھیج دیئے گیے۔ ان کی گرفتاری کے بعد ان کی اہلیہ کملا نہرو الہ آباد کانگریس کمیٹی کی صدر مقرر ہوئیں۔ بی۔ ایس۔ پانڈے ان کے سکریٹری تھے۔

مسٹر پانڈے نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ کملا نہرو جب سٹی کانگریس کی صدر ہوئیں تو انھوں نے پرجوش طور پر کام کرنا شروع کیا۔ بدیسی کپڑوں کی دکانوں پر پکٹنگ کے لیے انھوں نے نئی نئی خواتین کی بھرتی کی۔ انھیں میں سے ایک لال بہادر شاستری کی اہلیہ للتا شاستری بھی تھیں۔ مسٹر پانڈے لکھتے ہیں کہ جب میں پکٹنگ کے مقام پر پہونچا تو میں نے دیکھا کہ للتا شاستری نے اپنی کلائیاں زخمی کر لی ہیں۔ اور ان کے کپڑوں پر خون کے دھبے ہیں۔ میں سکتے میں آگیا۔ کملا نہرو نے بڑے فخر کے ساتھ اس نئی شرمیلی خاتون رضا کار کی بہادری کا قصہ بیان کیا۔ للتا شاستری ایک گاہک سے ہاتھ جوڑ کر درخواست کر رہی تھیں کہ وہ بدیسی کپڑا نہ خریدے۔ اس پر دکان دار نے برجستہ کہا " بہن جی! آپ ولایتی کپڑا خریدنے کو منع کر رہی ہیں، مگر آپ نے جو چوڑیاں پہن رکھی ہیں یہ بھی تو ولایتی ہیں"۔ للتا شاستری حیرت سے بولیں " اچھا؟ "

دکان دار: "ہاں بہن جی! یہ چوڑیاں ولایتی ہیں!"

للتا جی نے دکان دار کے اس جملہ کو دہرایا۔ پھر دکان دار کے ہاتھ سے آہنی گز لے کر اپنی ساری چوڑیاں توڑ ڈالیں اور ہاتھ جوڑ کر دوبارہ اس خاتون گاہک سے درخواست کی کہ وہ ولایتی کپڑا نہ خریدے اور دکاندار سے کہا کہ وہ ولایتی کپڑا نہ فروخت کریں۔ اس اچانک عمل پر گاہک اور دکان دار گم سم رہ گیے۔ پڑوس کے تمام دکاندار نادم ہوگیے اور اس کے بعد انھوں نے اپنی دکانیں فوراً بند کر دیں۔ (قومی آواز ۶ مئی ۱۹۸۵)

ساٹھ سال پہلے کانگریس کارکنوں کا یہ جوش محض ایک سیاسی تحریک کا جوش تھا نہ کہ حق و صداقت کا جوش۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۷ میں آزادی ملنے کے بعد انھیں کانگریسیوں کی اولادوں کی سب سے بڑی خواہش یہ بن گئی کہ اپنے گھروں کو بدیسی سامانوں سے بھرلیں ——— تحریکی اور سیاسی جوش کی یہ قسم مسلم جماعتوں میں بھی بڑے پیمانہ پر پائی جاتی ہے۔

ایران کا سبق

سابق شاہِ ایران محمد رضا پہلوی (۱۹۸۰ - ۱۹۱۹) کے خلاف آیات اللہ خمینی کی قیادت میں جو تحریک چل رہی تھی، اس کے نتیجہ میں دسمبر ۱۹۷۸ میں شاہ کو ایران چھوڑ دینا پڑا۔ اس کے بعد وہ مختلف ملکوں میں پھرتے رہے۔ یہاں تک ۲۷ جولائی ۱۹۸۰ کو قاہرہ کے اسپتال میں ان کا انتقال ہوگیا۔

فروری ۱۹۷۹ میں آیات اللہ خمینی ایک فاتح کی حیثیت سے پیرس سے تہران آئے۔ اس کے بعد انہوں نے ایران میں "اسلامی جمہوریہ" کی بنیاد رکھی۔ الرسالہ کی رائے اول دن سے یہ رہی ہے کہ ایران کا انقلاب اسلامی انقلاب نہیں، وہ صرف منفی نوعیت کا ایک مخالف شاہ انقلاب ہے۔ مگر مسلمان جو موجودہ زمانہ میں خوش فہمیوں میں جینے کے عادی ہوگئے ہیں، انہوں نے اس کو اسلام کی فتح قرار دیا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بیان دیا کہ "ایران کا انقلاب خالص اسلامی انقلاب ہے"۔ شاہ کی حکومت کے خاتمہ کے بعد مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پاکستان نے ایران کی نئی قیادت کو مبارکباد کا تار بھیجا۔ یہ تار اور اس کا ایرانی جواب یہاں مقابل کے صفحہ پر درج ہے۔

مگر جلد ہی کھلا کہ ایران کا انقلاب محض ایک انتقامی انقلاب تھا نہ کہ اسلامی انقلاب۔ چنانچہ حکومت پر قبضہ ملتے ہی خمینی گروپ نے ایران کے شہریوں کو گولی مارنا شروع کیا۔ بے شمار لوگ انتقامی جذبات کی تسکین میں مار ڈالے گئے۔ تاہم مولانا مودودی کی جماعت کے پاس اس کی توجیہہ موجود تھی ــــ یہ سب اسلام دشمن ہیں جو قتل کیے جا رہے ہیں۔

اس کے بعد ۱۹۸۰ میں ایران اور عراق میں جنگ چھڑ گئی۔ وہ اتنی بڑھی کہ پانچ سال گزرنے پر بھی اس کے خاتمہ کی صورت نظر نہیں آتی۔ اس بربادی اور قتل کو دیکھ کر دنیا بھر کے لوگ چیخ اٹھے۔ اب مولانا مودودی کی جماعت کو اعلان کرنا چاہیے تھا کہ ان کے قائد نے حالات کو سمجھنے میں بھیانک غلطی کی۔ انہوں نے انتقامی ہنگامے کو اسلامی انقلاب سمجھ لیا۔ مگر ان کی خوش قسمتی سے دوبارہ انہیں ایسے الفاظ مل گئے جن کے ذریعہ وہ اپنی غلطی کو دوسرے کے خانہ میں ڈال سکیں۔ جماعت اسلامی پاکستان کے جنرل سکریٹری قاضی حسین احمد صاحب نے اپنے ایک بیان میں کہا: ایران۔عراق جنگ عالم اسلام کے خلاف سازش ہے۔ اس جنگ میں عالم اسلام کے وسائل تباہ ہو رہے ہیں۔

(روزنامہ وفاق لاہور، ۹ جون ۱۹۸۵)

لوگ جھوٹے الفاظ میں جیتے ہیں۔ حالاں کہ مومن وہ ہے جو حقائق میں جینے لگے۔

IRAN / PRESS RELEASE

December 14, 1978

Text of the

TELEGRAM FROM THE JAMAAT ISLAMI OF PAKISTAN TO DR. EBRAHIM YAZDI

Jamaat Islami Pakistan supports the cause of Islam and freedom of Muslim People. In Islam we are whole heartedly with Islamic Movement of Iran. We condemn the atrocities and barbarious activities of Shah and his stooges. We and the peoples of Pakistan are with you. May Allah establish Islamic Republic with soverignty of Allah in Iran.

Maulana Abul Aala Maudoodi
Founder Jamaateislami, Mian Tufail Mohammad
Ameer Jamaateislami Pakistan, Syed Asad
Gilani Ameer Jamaateislami Pakistan, Lahore.

* * * * * * * * * * * * * * * * *

December 15, 1978

Text of the

TELEGRAM FROM DR. EBRAHIM YAZDI TO THE JAMAAT ISLAMI OF PAKISTAN

Dear Brothers in Islam:

Assalamo Alaikum Wa Rahmatollah Wa Barakateh

Your kind timely telegraph was received with great appreciation. The heroic struggle of Iranian Muslims and their Islamic Revolutionary Movement under the unified political and religious leadership of our beloved leader Imam Khomeini, has succeeded tremendously in defeating the Taquti regime of the Shah and his foreign supporters. Victory is closer than ever before. I pray to Allah Sobhana Wa Taalla that the struggle and solidarity of Muslim Ummat, especially the devoted Muslims of Pakistan, will bring prosperity and Filah for Muslim Brothers throughout the world.

With many thanks, Wa Assalm
Your brother in Islam,

Ebrahim Yazdi

اپنی غلطی

پروفیسر فریڈرش وان ہایک (پیدائش ۱۸۹۹) ایک برطانی مفکر ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب میں مغربی تہذیب کی ناکامی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم اپنی تہذیب کے موجودہ بحران کی تقریباً ہر توجیہہ قبول کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں، سوا ایک توجیہہ کے: یہ کہ دنیا کی موجودہ حالت خود ہماری اپنی واقعی غلطی کا نتیجہ ہو سکتی ہے اور یہ کہ اپنے کچھ بہت محبوب مقاصد کی طرف ہماری دوڑ نے بظاہر اس سے مختلف نتیجہ پیدا کیا ہے جس کی ہم اس سے امید کر رہے تھے۔

We are ready to accept almost any explanation of the present crisis of our civilisation except one: that the present state of the world may be the result of genuine error on our part, and that the pursuit of some of our most cherished ideals has apparently produced results different from those which we expected.

Friedrich Von Hayek, '*The Road to Serfdom,* London, 1944

یہ کمزوری جس کی طرف برطانی پروفیسر نے اشارہ کیا ہے، یہ اقوام عالم کی عام کمزوری ہے۔ اور خود موجودہ مسلمانوں میں یہ کمزوری بہت بڑے پیمانہ پر پائی جاتی ہے۔ (۲۴ جون ۱۹۸۴)

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اپنے احیاء کے لئے بے شمار بہت بڑی بڑی تحریکیں چلائیں۔ یہ تمام تحریکیں پرشور ہنگاموں کے باوجود اپنے اصل مقصد میں سراسر ناکام رہیں۔ جب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ان "عظیم الشان تحریکوں" کی ناکامی کا سبب کیا ہے تو مسلمان ہمیشہ کچھ بیرونی دشمن یا خارجی اسباب پا لیتے ہیں۔ جن کو وہ اپنی ناکامی کا ذمہ دار قرار دے سکیں۔ یہ بات کسی طرح ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ خود ان کے قائدین کا غلط تجزیہ یا ناقص منصوبہ بندی ان کی ناکامیوں کا اصل سبب ہو سکتا ہے۔

کسی واقعہ کا سبب اگر اپنے اندر ہو اور اس کو آپ باہر ڈھونڈنے لگیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے سر درد کے اسباب کو ہوا میں تلاش کرنے لگے۔

استعداد کا فرق

آٹھویں صدی میں مسلمان صنعتی اور فوجی اعتبار سے مغربی قوموں سے برتر تھے۔ اس لیے وہ مغرب کے اوپر غالب آ گئے۔ موجودہ زمانہ میں مغرب نے تمام فکری اور عملی شعبوں میں برتری حاصل کر لی، اس لیے انھوں نے مسلم ملکوں کے اوپر غلبہ حاصل کر لیا۔ یہ تبدیلی عین فطری قانون کے تحت ہوئی۔ کیوں کہ یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں ہمیشہ ایسا ہی ہوگا کہ کمزور مغلوب ہو جائے گا اور جو طاقت ور ہے وہ دوسروں کے اوپر غلبہ حاصل کر لے گا۔

اس تبدیلی کے بعد ضرورت تھی کہ مسلمانوں کو نئے زمانہ کے اعتبار سے باشعور اور طاقت ور بنایا جائے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں سے یہ غلطی ہوئی کہ انھوں نے تبدیلیٔ قیادت کے اس معاملہ کو فطری قانون کا معاملہ نہیں سمجھا بلکہ اس کو مغربی سازش کا معاملہ سمجھ لیا۔ اسی غلط فہمی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے تمام لکھنے اور بولنے والے سو سال سے بھی زیادہ مدت سے شکایت اور احتجاج میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ مغربی قوموں کی سازشوں کا انکشاف کرنے میں مصروف ہیں۔ حالانکہ اس قسم کی لفظی ورزش کا کوئی فائدہ نہیں۔

اصل کام یہ تھا کہ مسلمانوں کو از سر نو تیاری کی طرف متوجہ کیا جائے۔ انھیں عصری تبدیلیوں سے واقف کرایا جائے۔ ان کو ابھارا جائے کہ وہ جدید تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو مستعد اور مستحکم بنائیں۔ مگر تمام بہترین وقت لفظی احتجاج میں گزر گیا اور تیاری اور استحکام کے میدان میں کوئی بھی حقیقی کام نہ ہو سکا۔

ہمارے لکھنے اور بولنے والے طبقہ کی غلط رہنمائی نے موجودہ زمانہ کے بیشتر مسلمانوں کے ذہن کو بگاڑ دیا ہے۔ وہ معاملات کو صرف شکایت اور سازش کے رخ سے دیکھنا جانتے ہیں۔ وہ فطری حقائق کی روشنی میں معاملات کو دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اس ذہنی بگاڑ کی بنا پر انھیں کام صرف یہ نظر آتا ہے کہ اپنے مفروضہ دشمن کے خلاف ایسے الفاظ کی دھوم مچاتے رہیں جن کا اتنا فائدہ بھی نہیں کہ وہ دشمن کے کانوں تک پہنچیں اور اس کی رات کی نیند حرام کر دیں۔

ایک عام برائی

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو نسل چلی ، بعد کو اس کی دو شاخیں ہو گئیں ۔ ایک بنی اسرائیل ، دوسرے بنی اسماعیل ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جو پیغمبر آئے وہ سب بنی اسرائیل میں آئے ۔ اس کے بعد آخری پیغمبر محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت بنی اسماعیل میں ہوئی ۔ بنی اسرائیل (یہود) نے آخری پیغمبر کو ماننے سے انکار کر دیا ۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ فعل حسد کی وجہ سے ہے ۔ ان کو اس بات کی جلن ہے کہ اللہ نے بنی اسماعیل کو کیوں اپنے فضل سے نوازا (ام یحسدون الناس علیٰ ما آتاھم اللہ من فضلہ، النساء ۵۴) اس سے معلوم ہوا کہ وہ اخلاقی برائی جس کو حسد کہا جاتا ہے وہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ آدمی اپنے سوا دوسرے کی بڑائی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہو ۔

یہ ایک عام بات ہے کہ کسی چھوٹے آدمی کی برائی کی جائے تو سننے والوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ۔ اس کے برعکس کسی بڑے آدمی کی برائی کی جائے تو ہر آدمی اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے ۔ ایک شخص کو ماحول میں کوئی بڑائی حاصل ہو جائے تو اس کے خلاف ہر الٹی بات کو لوگ بلا تحقیق مان لیتے ہیں اور فوراً اس کا چرچا کرنے لگتے ہیں ۔ آپ ایک دولت مند کی برائی بیان کریں ۔ ایک عزت یافتہ شخص کو بے عزت کرنے والی باتیں کریں ۔ ایک صاحب اقتدار کے ظلم کی داستانیں لوگوں کو سنائیں ۔ آپ دیکھیں گے کہ لوگ فوراً آپ کی بات مان رہے ہیں ۔ بہت جلد آپ کے گرد لوگوں کی بھیڑ کی بھیڑ جمع ہو گئی ہے ۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ کسی کی بڑائی کو تسلیم نہیں کرتا ۔ وہ اپنے سوا کسی اور کو بلند مقام پر دیکھنا نہیں چاہتا ۔ اس نفسیات کا نتیجہ یہ ہے کہ جب بھی ماحول میں کسی شخص کو کسی اعتبار سے بڑائی کا مقام حاصل ہوتا ہے تو تمام لوگوں کے دل میں اس کے خلاف کھلا یا چھپا حسد پیدا ہو جاتا ہے ۔ ہر ایک اندر سے یہ چاہنے لگتا ہے کہ اس کو اس کی بڑائی کے مقام سے گرائے ۔ چنانچہ جب کوئی شخص ایسی بات کہتا ہے جس سے بڑے کی بڑائی مجروح ہوتی ہو تو فوراً لوگ اس کو اپنے دل کی بات سمجھ کر مان لیتے ہیں ، وہ فوراً ایسے آدمی کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں ۔

یہ مشغلہ آج لوگوں کو بڑا لذیذ مشغلہ معلوم ہوتا ہے ۔ مگر یہ یقینی طور پر ابلیس لعین کی سنت ہے ۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں انھیں ڈرنا چاہیے کہ ان کا وہی انجام ہو جو آدم کی بڑائی کو نہ ماننے کے نتیجہ میں ابلیس کا ہوا ۔

کمینہ پن

ایک اعلیٰ سرکاری افسر کو اپنے ماتحت ملازم سے ضد ہوگئی۔ ملازم کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ خوددار قسم کا آدمی تھا اور افسر صاحب کی متکبرانہ نفسیات کو غذا نہیں فراہم کرتا تھا۔ وہ اس کو ملازمت سے تو نہیں نکال سکتے تھے۔ البتہ انھوں نے کوشش کی کہ اس کو کسی قسم کی ترقی نہ ملنے پائے۔ جہاں کہیں دیکھتے کہ اس کے لئے ترقی اور کامیابی کی کوئی صورت پیدا ہورہی ہے وہ فوراً اس کے خلاف رکاوٹ بن کر کھڑے ہوجاتے۔ اس کو پروموشن کا موقع ملا جس سے اس کی تنخواہ میں تقریباً پانچ سو روپیہ مہینہ کا اضافہ ہوجاتا مگر انھوں نے زبردست سرگرمی دکھا کر اس کا پروموشن رکوادیا۔

اس ظلم کے باوجود افسر صاحب کی اپنی کوئی بات نہیں بگڑی۔ محکمہ کے بڑے بڑے لوگوں سے انھیں قدردانی ملتی رہی۔ ان کے عہدہ اور مرتبہ میں اضافہ ہوتا رہا۔ عالمی کانفرنسوں میں وہ اپنے محکمہ کی نمائندگی کے لئے بھیجے جاتے رہے وغیرہ

"اگر میں غلطی پر ہوتا تو مجھے یہ کامیابیاں کیسے ملتیں" انھوں نے سوچا۔ ماتحت ملازم کے خلاف ظالمانہ کارروائیوں کے باوجود چوں کہ ان کی اپنی کوئی بات نہیں بگڑی تھی اس لئے وہ یہی سمجھتے رہے کہ میں صحیح ہوں میرے اوپر خدا کا فضل ہو رہا ہے۔

مگر اس کی وجہ خدا کا فضل نہیں بلکہ صرف ان کا تضاد تھا۔ وہ اپنے ماتحت کے لئے کچھ تھے اور اپنے افسر کے لئے کچھ۔ اپنے ماتحت ملازم سے انھیں چوں کہ کسی نقصان کا اندیشہ نہیں تھا اس لئے اس کے مقابلہ میں تو وہ شیر بنے رہتے۔ مگر اوپر کے وہ لوگ جن سے خود ان کی قسمت وابستہ تھی ان کے آگے وہ اس طرح بچھ جاتے جیسے کہ وہ نرمی اور تواضع کے سوا کچھ اور جانتے ہی نہیں۔

یہی وہ کردار ہے جس کا نام کمینہ پن ہے۔ اور کمینہ پن بے کرداری کی بدترین قسم ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں کہ اپنے نیچے والوں کے لئے شیر بنے رہتے ہیں اور اپنے اوپر والوں کے لئے گیدڑ، وہ ایسا کرکے صرف اپنی پستی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ وہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ کیوں کہ انسان کو کیا ملے اور کیا نہ ملے، اس کا فیصلہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور خدا کے اوپر کسی کو اختیار نہیں۔

مزید یہ کہ دوسرے کے خلاف کیا ہوا ہر عمل خود اپنے خلاف عمل ہے۔ اپنی بارگاہ میں دوسرے کو ڈسکریڈٹ کرنے والا آدمی خدا کی بارگاہ میں اپنے آپ کو ڈسکریڈٹ کررہا ہوتا ہے۔ ایسا ہر سلوک خود اپنے ساتھ بدسلوکی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ خواہ اس کا ظہور موجودہ دنیا میں ہو یا بعد کو آنے والی دنیا میں۔

پردہ ڈالنا

سنگاپور سے انگریزی ناول کی ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے :

The Cry of the Halidon

اس کتاب کے آغاز میں کئی سطر کی ایک عبارت درج ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اس کتاب کے تمام حقوق محفوظ ہیں اور کسی بھی شکل سے اس کو دوبارہ استعمال نہیں کیا جا سکتا جب تک پبلشر کی پیشگی اجازت حاصل نہ کر لی جائے۔ اس عبارت کے الفاظ یہ ہیں :

All rights reserved. No part of this publication may be reproduced, stored in a retrieval system, or transmitted, in any from, or by any means electronic, mechanical, photocopying, recording, or otherwise, without the prior permission of the publishers.

کتاب پر بحیثیت مصنف کے رابرٹ لڈلم (Robert Ludlum) کا نام درج ہے۔ بظاہر مذکورہ عبارت سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ پبلشر نے مہنگی رائلٹی دے کر اس کے حقوق اشاعت حاصل کئے ہیں اور اب وہ چاہتا ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شخص اس میں شریک نہ ہو۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ پوری کتاب سرقہ ہے۔ کتاب کا اصل مصنف جناتھن رائڈر (Jonathan Ryder) ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۷۵ میں لندن سے چھپی تھی۔ عین اسی کتاب کو اسی نام کے ساتھ سنگاپور کے پبلشر نے چھاپ لیا ہے۔ اس کی واحد ترمیم یہ ہے کہ اس نے مصنف کا نام بدل دیا ہے (ہندستان ٹائمس ۲۱ ستمبر ۱۹۸۳)

بعض مرتبہ آدمی سچ صرف اس لئے بولتا ہے کہ اس کے ذریعہ اپنے جھوٹ پر پردہ ڈال سکے۔ وہ حق کا اعلان صرف اس لئے کرتا ہے کہ اپنے باطل کو اس کی آڑ میں چھپا سکے۔ وہ خوب صورت الفاظ کا استعمال صرف اس لئے کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ اپنی معنوی بدشکلی کو ڈھانک لے۔ وہ آگ بجھانے کے لئے اس لئے دوڑتا ہے کہ کوئی یہ نہ جانے کہ اسی نے آگ لگائی تھی۔

سنگاپور کے پبلشر نے خود تو سرقہ کیا ہے مگر وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی شخص سرقہ کا معاملہ نہ کرے۔ خود تو اس نے دوسرے کی چیز لے لی ہے مگر دوسرا کوئی اس سے اسے نہ لے۔ خود غرضی کی یہ قسم بھی کیسی عجیب ہے۔

تصویرِ ملّت

گاؤں کے چند لڑکے بے فکری کے ساتھ بیٹھے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک لڑکے نے کہا کہ آؤ، جھوٹ موٹ کی کھچڑی پکائیں۔ دوسرا لڑکا بولا: جب جھوٹ موٹ ہی پکانا ہے تو کھچڑی کیوں پکائیں، پھر تو پلاؤ پکائیں۔

یہی حال موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین کا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جھوٹے پکوان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔ ایک کے بعد ایک قائد اٹھتا ہے اور پہلے سے زیادہ بڑا لفظ بول کر عوام کی ایک بھیڑ کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ ایک شخص اگر جھوٹی کھچڑی پکار ہا تھا تو دوسرا شخص جھوٹا پلاؤ اور جھوٹی بریانی پکانا شروع کر دیتا ہے۔

ایک قائد نے کہا: ہمارا مقصد ملک کے اندر اسلامی قانون نافذ کرنا ہے۔

دوسرا قائد بولا ہم تو پورے کرۂ ارض پر اسلام کے کامل نظام عدل و قسط کو غالب و قائم کرنا چاہتے ہیں۔

تیسرے قائد نے کہا ہمارے دین کی حقیقت احتسابِ کائنات ہے۔ ہم کو ستاروں سے بھی آگے جانا چاہیے۔ کیا تم کو نہیں معلوم کہ ــــــ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں۔

آدمی عمل سے جتنا زیادہ خالی ہو اتنا ہی زیادہ بڑے الفاظ وہ بولتا ہے۔ ان قائدین کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے قدموں کے نیچے بھی اسلام کو قائم کرنے میں ناکام ہیں، اس کے باوجود وہ تقریروں میں ساری انسانیت کو خطاب کر رہے ہیں اور سارے عالم میں نظام عدل قائم کرنے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ بولنے والے صرف یہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ مردہ لوگ ہیں، وہ زندہ لوگ نہیں۔ مردہ لوگ بڑے بڑے الفاظ بولتے ہیں اور زندہ لوگ بڑے بڑے کام کرتے ہیں۔

اس عموم میں صرف تبلیغی جماعت کا ایک استثنار ہے۔ وہ احتساب خویش کے لیے اٹھی ہے نہ کہ دوسروں کی طرح احتسابِ عالم کے لیے۔ اور یقیناً احتساب خویش ہی وہ کام ہے جو کرنے والوں کو کرنا چاہیے، اور جس کے لیے اٹھنے والوں کو اٹھنا چاہیے۔

یہ اختلاف

ہفتہ وار انکشاف (جھانسی) ۲۱ دسمبر ۱۹۸۳ میں ایک مختصر مضمون نظر سے گذرا :

یہ سنیوں کی مسجد ہے ۔
یہ شیعوں کی مسجد ہے۔
یہ اہل حدیث کی مسجد ہے ۔
یہ بریلویوں کی مسجد ہے۔
یہ دیوبندیوں کی مسجد ہے۔
یہ مسجد بساطیان ہے ۔
یہ مسجد منصوریان ہے ۔
اس مسجد میں سلام پڑھنا منع ہے ۔
اس مسجد میں تبلیغی جماعت قیام نہیں کرسکتی۔

میں ایک نومسلم ہوں ۔قرآن کی تعلیمات سے متاثر ہوکر میں نے اسلام قبول کیا ہے ۔اب کوئی مجھے بتائے کہ میں کس مسجد میں نماز ادا کروں "

یہ ایک چھوٹی سی تصویر ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی حالت کیا ہے مسلمان ہر طرف چھوٹے نعروں میں الجھے ہوئے ہیں اور خود ساختہ مسائل کی بنیاد پر انھوں نے خدا کے ایک دین کو بہت سے دینوں میں بانٹ رکھا ہے۔

ایک شخص اپنے جسم کے کپڑے کو پھاڑ کر اس کے ۲ ے ٹکڑے کر ڈالے تو لوگ اس کو پاگل کہیں گے ۔ مگر جن لوگوں نے خدا کے دین کو متفرق کر کے اس کو ۲ ے ٹکڑوں میں بانٹ رکھا ہے وہ پاگل ہی نہیں بلکہ مجرم ہیں ۔ ایسے لوگ دینداری کا انعام نہیں پا سکتے ۔ البتہ یہ اندیشہ ہے کہ ان کو خدا کے دین کو بگاڑنے والا قرار دے کر ان پر مقدمہ چلایا جائے ۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا جو حال ہے وہ اس آیت کا مصداق ہے جو قرآن میں یہودیوں کے بارہ میں آئی تھی ـــــ انھوں نے دین کو اپنے درمیان ٹکڑے ٹکڑے کرلیا۔ ہر گروہ کے پاس جو ہے وہ اسی پر خوش ہے (فتقطعوا امرهم بينهم زبرا كل حزب بما لديهم فرحون ، المومنون ۵۳)

بے قیمت الفاظ

ہمارے قائدین اپنی تقریروں اور تحریروں میں ہر روز مسلمانوں کو بتاتے رہتے ہیں کہ مسلمان کیا کریں۔ وہ مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ :

مسلمان متحد ہو جائیں

مسلمان اس ملک کی اخلاقی قیادت کریں

مسلمان خیر امت کا کردار ادا کریں

یہ مشورے یقیناً بہت اچھے مشورے ہیں مگر وہ سادہ معنوں محض مشورے نہیں ہیں۔ وہ عظیم ترین قربانی کے مطالبے ہیں۔ آدمی قربانی کی قیمت پر ہی ان مشوروں پر قائم ہو سکتا ہے ــــــ متحد ہونے کی قیمت ہے اختلاف کے باوجود متحد ہونا۔ اخلاقی قیادت کی قیمت ہے تلخیوں کے باوجود اخلاق پر قائم رہنا۔ خیرامت کا کردار ادا کرنے کی قیمت ہے شکایتوں کے باوجود لوگوں کا خیر خواہ ہونا۔

یہ سب اعلیٰ ظرفی کی باتیں ہیں اور اعلیٰ ظرفی کا یہ معیار وہ ہے جس پر خود مشورہ دینے والے قائدین بھی پورے نہیں اترتے۔ پھر وہ عوام اعلیٰ ظرفی کے اس معیار پر کیسے پورے اتریں گے۔ جن کو تقریر و تحریر کی صورت میں یہ قیمتی مشورے دئے جارہے ہیں۔ ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ اسی طرح مشورے کی بھی ایک قیمت ہے۔ اور وہ ہے آدمی کا اول المسلمین ہونا یعنی مشورہ دینے والا خود اس اصول پر قائم ہو جس کا مشورہ وہ دوسروں کو دینے جارہا ہے۔ ایک ایسا مشورہ جس کی قیمت ادا نہ کی گئی ہو سراسر لاحاصل ہے۔ اس کا کوئی فائدہ نہ مشورہ دینے والے کے حصہ میں آتا ہے اور نہ اس کے حصہ میں جس کو مشورہ دیا گیا ہے۔

جو لوگ اختلاف کے وقت بے برداشت ہو جاتے ہیں۔ جو شکایت پیدا ہوتے ہی آدمی کے دشمن بن جاتے ہیں۔ جن کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے مداحوں کے لئے بااخلاق ہیں اور اپنے ناقدین کے لئے بے اخلاق۔ وہی لوگ دوسروں کو اتحاد اور اعلیٰ کردار کا مشورہ دے رہے ہیں۔

اس قسم کا مشورہ دینے والے قائدین پر حضرت مسیح کے وہ الفاظ صادق آتے ہیں جو آنجناب نے یہودی پیشواؤں کے بارہ میں فرمائے تھے :

" اے شرع کے عالمو، تم پر افسوس کہ تم ایسے بوجھ جن کو اٹھانا مشکل ہے۔ آدمیوں پر لادتے ہو اور آپ ایک انگلی بھی ان بوجھوں کو نہیں لگاتے (لوقا ١١ : ٤٦)

جھوٹی لیڈری

صبح اٹھ کر ہر روز جو آوازیں راقم الحروف کے کان میں آتی ہیں ان میں سے ایک آواز اس پھیری والے کی ہے جو روزانہ سڑک سے یہ آواز لگاتا ہوا گزرتا ہے:

کباڑی ۔۔۔ ردی والا ، کباڑی ۔۔۔ ردی والا

جب میں یہ آواز سنتا ہوں تو اکثر میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ یہ شخص بھی کس قدر حقیقت پسند ہے۔ وہ کباڑی والا ہے تو اپنے کو کباڑی والا ہی بتاتا ہے۔ وہ چاہے تو اپنی زبان سے "جوہری" اور "سونے چاندی والا" کی آواز بھی نکال سکتا ہے۔ مگر وہ جانتا ہے کہ وہ کباڑی ہے، جوہری نہیں ہے۔ اس لئے حقیقت کے بازار میں اس کو صرف کباڑی کی قیمت ملے گی، اس کو جوہری کی قیمت نہیں مل سکتی۔ اگر وہ سڑکوں پر جوہری، جوہری پکارے تو سارا دن گزر جائے گا اور وہ ایک پیسہ کا کاروبار بھی نہ کر سکے گا۔

یہی تمام کاموں کا معاملہ ہے۔ ہر کام میں آدمی اپنی اصل حیثیت کے مطابق قیمت پاتا ہے۔ مگر لیڈری کا کام اس سے مستثنیٰ ہے۔ لیڈری کی دنیا میں یہ ممکن ہے کہ آپ حقیقۃً کباڑی ہوں اور جوہری کی آواز لگائیں۔ پھر بھی آپ کو ایسے معتقدین مل جائیں جو آپ کو مفکر اسلام تصور کریں، جو آپ کو نجات دہندۂ قوم کا لقب دیدیں۔

لیڈری کی دنیا میں یہ ممکن ہے کہ آدمی کے اندر ایک معمولی اخبار چلانے کی طاقت نہ ہو اور وہ انسانیت بچاؤ کا جھنڈا بلند کرے۔ وہ ایک مدرسہ کا انتظام درست نہ کر سکتا ہو اور "سنو اے اہل عالم" کے عنوان پر تقریر کرے۔ ووٹ دینے والے عوام کے اندر اس کا کوئی مقام نہ ہو۔ اس کے باوجود وہ اسلامی حکومت قائم کرنے کا نعرہ لے کر الکشن کے میدان میں کود پڑے۔

بائبل میں "جھوٹے نبی" کا لفظ آتا ہے۔ اس سے مراد اسی قسم کے جھوٹے لیڈر ہیں۔ ایسے لوگ ممکن ہے کسی قسم کی وقتی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لیں۔ مگر حقیقت کی نظر میں وہ صرف مجرم ہیں۔ کیونکہ اپنی اصل حیثیت کے اعتبار سے وہ کباڑی تھے مگر انھوں نے اپنے آپ کو جوہری کے روپ میں پیش کیا۔ انھوں نے قوم کو صرف بے راہ کیا اور نعرہ یہ لگایا کہ وہ قوم کو راستہ دکھانے کے لیے اٹھے ہیں۔

جھوٹا فخر

عبدالواحد ایک ادھیڑ عمر کے چپراسی ہیں جو دہلی کے ایک اردو اخبار میں کام کرتے ہیں۔ ان کی تعلیم برائے نام ہے تاہم باتیں بہت دلچسپ کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے پوچھا کہ مسلمان اتنا زیادہ لڑتے جھگڑتے کیوں ہیں۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا:

مسلمان اپنے رعب میں رہتا ہے

یہ چھوٹا سا جملہ مسلمانوں کی نفسیات کی بہترین ترجمانی ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنے آپ کو سب سے اونچا سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی بڑائی میں گم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسروں کی رعایت نہیں کر پاتے۔ وہ اس طرح عمل کرتے ہیں جیسے کہ دنیا میں صرف ان کا وجود ہے۔ ان کے سوا کسی اور کا کوئی وجود نہیں۔

اس نفسیات کے لیے دوسرا لفظ جھوٹا فخر ہے۔ یہی مسلمانوں کی اصل بیماری ہے۔ ان کے تمام مسائل جن میں وہ آج مبتلا ہیں اسی ایک چیز سے پیدا ہوئے ہیں۔

موجودہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں کوئی آدمی اپنی اہلیت کے بقدر اپنی قیمت پاتا ہے۔ ایسی دنیا میں جھوٹے فخر سے زیادہ قاتل کوئی چیز نہیں۔

جھوٹا فخر آدمی کو غیر حقیقت پسند بنا دیتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر سے عمل کا جذبہ چھین لیتا ہے جس شخص یا قوم کے اندر جھوٹا فخر پیدا ہو جائے اس کے اندر یہ صلاحیت باقی نہیں رہتی کہ وہ دوسرے کے ہُنر کا اعتراف کرے یا دوسروں کے ساتھ موافقت کر کے رہ سکے۔ ایسا آدمی "پدرم سلطان بود" اور " ہم چو من دیگرے نیست" کی نفسیات میں مبتلا رہتا ہے اور موجودہ دنیا میں بلاشبہ اس سے زیادہ ہلاکت خیز نفسیات اور کوئی نہیں۔

ایسے لوگوں کے لیے موجودہ دنیا میں صرف یہ مقدر ہے کہ وہ ہمیشہ دوسروں سے لڑتے رہیں۔ وہ احتجاج اور شکایت کی فضا سے کبھی باہر نہ آسکیں۔ اپنی ہر ناکامی کے لیے وہ صرف دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرائیں۔ وہ انھیں بے فائدہ مشغلوں میں مبتلا رہیں یہاں تک کہ مر کر قبر میں چلے جائیں۔

نفسیاتی کمزوری

پٹرونیس آربٹر (Petronius Arbiter) رومی بادشاہ نیرو (Nero) کا ایک قریبی دوست تھا۔ اس کی غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر اس کو روم کا مجسٹریٹ مقرر کیا گیا۔ اس نے ۶۶ء میں وفات پائی۔ اس کا ایک قول انگریزی میں اس طرح نقل کیا گیا ہے —— انسانی دماغ ہمیشہ اس چیز کی تمنا میں رہتا ہے جس کو اس نے کھو دیا ہے :

The mind longs for what it has missed.

یہ بات حال کے لیے بھی اتنی ہی صحیح ہے جتنی وہ ماضی کے لیے صحیح تھی۔ نیز یہ کہ یہ نفسیاتی کمزوری اتنی عام ہے کہ افراد اور اقوام دونوں اس میں یکساں طور پر مبتلا رہتے ہیں۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کھوئی ہوئی چیز اگرچہ ماضی میں لامعلوم تھی مگر حال میں وہ پوری طرح معلوم چیز بن چکی ہوتی ہے۔ ماضی میں وہ پوری طرح معلوم اور واضح نہ ہونے کی وجہ سے آدمی کی توجہ کا مرکز نہ بن سکی۔ مگر بعد کو وہ مکمل طور پر علم کے دائرہ میں آجاتی ہے۔ اس لیے انسان اس کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیتا ہے۔ مگر یہ نادانی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اسی انسانی کمزوری کی بنا پر قوموں کے اندر سطحی قیادتیں جنم لیتی ہیں۔ سطحی قیادت ہمیشہ "معلوم محرومیوں" پر اٹھتی ہے۔ کیوں کہ معلوم محرومیوں پر قوموں کو ابھارنا بے حد آسان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان میں اگر ایک لیڈر یہ نعرہ لگائے کہ "لینا ہے کشمیر" تو اس کو فوراً عوام کے درمیان مقبولیت حاصل ہو جائے گی۔ کروروں روپیہ کا چندہ وہ نہایت آسانی کے ساتھ جمع کر لے گا۔ کیوں کہ کشمیر کا کھویا جانا پاکستانیوں کے لیے ایک معلوم واقعہ بن چکا ہے۔

اس کے برعکس اگر پاکستان کا ایک مسلم رہنما کہے کہ ہم کو داعی گروہ کی حیثیت سے اٹھنا ہے تو ایسی پکار پر کبھی عوام کی بھیڑ جمع نہیں ہوگی۔ کیوں کہ داعیانہ حیثیت کا کھونا عوام کے لیے کوئی معلوم واقعہ نہیں۔ جھوٹی قیادت ہمیشہ معلوم محرومیوں کی بنیاد پر اٹھتی ہے اور سچی قیادت ہمیشہ نامعلوم محرومی کی بنیاد پر۔ یعلمون ظاهرا من الحياة الدنيا وهم عن الآخرة هم غافلون

(الروم ۷)

آہ یہ مسلمان

ہندستان ۱۹۴۷ میں آزاد ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ملک میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوگیے۔ جن کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اندازہ ہے کہ پچھلے ۴۰ سال میں یہاں تقریباً دس ہزار فسادات ہو چکے ہیں۔

ہندستان کا تقریباً ہر فرقہ وارانہ فساد مسلمانوں کی بے صبری سے شروع ہوتا ہے۔ مسلمان اپنی مخصوص نفسیات کی بنا پر چھوٹی سی خلاف مزاج بات پر مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد معلوم اسباب کے تحت وہ دو قوموں کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ دونوں کے درمیان ٹکراؤ شروع ہوتا ہے جس میں نقصان ہمیشہ مسلمانوں کے حصہ میں آتا ہے۔

ان فسادات کو ابھارنے کی سب سے زیادہ ذمہ داری مسلم قائدین پر ہے۔ مسلمانوں میں جتنے بھی لکھنے اور بولنے والے ہیں سب متفقہ طور پر جہاد کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے اندر برابر لڑنے کا مزاج بناتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی نہیں معلوم کہ قرآن میں صبر کی بھی آیتیں ہیں۔ تاہم دوسروں کو اپنی زبان وقلم سے جہاد پر ابھارنے والے یہ لوگ خود ہمیشہ جہاد کے میدان سے دور رہتے ہیں۔ ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات میں اب تک بے شمار مسلمان مارے جا چکے ہیں مگر ان میں سے کسی فساد میں کوئی مسلمان قائد اب تک مارا نہیں گیا نہ کوئی چھوٹا قائد اور نہ کوئی بڑا قائد۔

مسلم قائدین صرف دوسروں کو للکارنے کے لیے بہادر ہیں، وہ خود لڑنے اور مرنے کے لیے بہادر نہیں۔

دوسری طرف مسلم عوام کا حال یہ ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر مخالف فرقہ کے ساتھ ہنگامہ آرائی شروع کر دیتے ہیں۔ ان سے صبر اور اعراض کی بات کیجیے تو وہ فوراً جواب دیں گے کہ اگر ہم نے صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کیا تو مخالف طاقتیں دلیر ہو جائیں گی۔ مگر عملاً کیا ہوتا ہے۔ عملاً صرف یہ ہوتا ہے کہ مسلمان ابتدائی مرحلہ میں بے صبر ہو کر لڑ جاتے ہیں۔ اس کے بعد جب وہ جلائے پھونکے جاتے ہیں اور پولیس آکر وحشیانہ طور پر انھیں کچلنے لگتی ہے تو وہی مسلمان بالکل دوسرے مسلمان بن جاتے ہیں۔ فساد کے آغاز میں مسلمان چپ ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے مگر فساد کے خاتمہ پر ہر مسلمان نہایت بزدلانہ طور پر عین اسی مقام پر خاموش ہو جاتا ہے جہاں اس سے پہلے وہ کاغذ اور مائک کا شیر بنا ہوا تھا ـــــــ کاش مسلمان جانتے کہ بزدلی دکھا کر چپ ہونے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی بزدلی دکھائے بغیر چپ ہو جائے۔

دو قسم کے لیڈر

ہندستان کے مشہور قانون داں مسٹر نانی پالکی والا نے لکھا ہے کہ ہندستان کی مصیبت یہ ہے کہ یہاں سیاسی لیڈروں کی بھرمار ہے۔ اور سیاسی مدبرین کی کمی:

The bane of India is the plethora of politicians
and the paucity of statesmen.
Nani Palkhivala in *WE THE PEOPLE*

سیاسی لیڈر (پالی ٹیشین) اور سیاسی مدبر (اسٹیٹسمین) میں کیا فرق ہے، اس کا جواب ہندستان کے نائب صدر جمہوریہ مسٹر وینکٹارمن نے حسب ذیل الفاظ میں دیا ہے:

A politician thinks of the next election while
a statesman thinks of the next generation.

یعنی ایک سیاسی لیڈر اگلے الکشن کے بارہ میں سوچتا ہے جب کہ ایک سیاسی مدبر اگلی نسل کے بارہ میں سوچتا ہے (ٹائمس آف انڈیا، ۷ استمبر ۱۹۸۴) اس بات کو دوسرے لفظوں میں کہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ رہنما دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک سچا رہنما دوسرا جھوٹا رہنما۔ سچا رہنما قوم کے مفاد میں سوچتا ہے اور جھوٹا رہنما اپنی قیادت کے مفاد میں۔ سچے رہنما کو قوم کے مستقبل کی فکر ہوتی ہے۔ اور جھوٹے رہنما کو اپنے ذاتی مستقبل کی۔

جھوٹا رہنما ایک روایت کو توڑ کر کامیابی حاصل کر سکتا ہو تو وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر روایت کو توڑ ڈالے گا اور پھر ذاتی کامیابی حاصل کر کے خوشی کا جشن منائے گا، مگر سچا رہنما ایسے موقع پر رک جائے گا، وہ سوچے گا کہ ایک روایت کو توڑنا بہت آسان ہے مگر دوبارہ ایک مفید روایت قائم کرنا انتہائی مشکل ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ روایت کو باقی رکھا جائے خواہ اس کی وجہ سے ذاتی نقصان اٹھانا پڑے۔

جھوٹا رہنما اگر دیکھے گا کہ ایک جذباتی نعرہ لگا کر وہ کامیاب ہو سکتا ہے تو وہ فوراً اپنی کامیابی کے لئے جذباتی نعرہ لگا دے گا۔ مگر سچا رہنما ایسے موقع پر رک جائے گا، وہ سوچے گا کہ جذباتی نعرہ لگانا دوسرے لفظوں میں قوم کو جذباتی راہوں پر دوڑانا ہے۔ اس لئے قوم کو جذباتی خندق میں گرانے سے بہتر ہے کہ اپنے لئے سیاسی موت کو برداشت کر لیا جائے۔ لیڈر کی موت میں قوم کی زندگی ہے۔ خوش قسمت ہے وہ قوم جس کو ایسے باحوصلہ لیڈر مل جائیں۔

اخلاقی قیادت

کچھ مسلم رہنما اپنی تقریروں میں پرجوش طور پر کہتے ہیں : مسلمانوں کو آگے بڑھ کر اس ملک کی اخلاقی قیادت اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے۔ مگر موجودہ حالت میں یہ لفظی بازیگری کے سوا اور کچھ نہیں۔

" اخلاقی قیادت " کوئی تقریری اجلاس کی صدارت نہیں جو ایک شامیانہ پھیلا کر اس کے نیچے حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ ایک عظیم قربانی کے ذریعہ حاصل ہونے والا عظیم نتیجہ ہے۔ اخلاقی قیادت سب سے بڑا انسانی شرف ہے جو سب سے بڑی انسانیت کا ثبوت دینے کے بعد ملتا ہے۔ اخلاقی قیادت کسی کو شاعری اور خطابت کی قیمت پر نہیں ملتی۔ وہ عمل اور کردار کی اعلیٰ ترین متاع دے کر حاصل ہوتی ہے۔

اخلاقی قیادت حاصل کرنے کا سب سے بڑا راز یک طرفہ حسن اخلاق ہے۔ جس کو قرآن میں خلق عظیم کہا گیا ہے۔ یہ عمل کی اس نادر قسم کا ثبوت دینے کے بعد حاصل ہوتی ہے جب کہ آدمی اپنے آپ کو اتنا اونچا اٹھالے کہ وہ تنقید کے باوجود برہم نہ ہو، وہ نفرت کرنے والوں کے ساتھ محبت کرے۔ وہ ظلم کرنے والوں کے ساتھ انصاف کرے۔ وہ چھیننے والوں کو بھی دینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ وہ اپنے دشمن کو بھی دوست کی طرح سینہ سے لگا سکے۔ حقوق کی چیخ پکار کرنے والوں کو کبھی اخلاقی قیادت نہیں ملتی۔ اس دنیا میں اخلاقی قیادت صرف ان بلند انسانوں کو ملتی ہے جو اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے حقوق کو پامال ہوتے ہوئے دیکھیں پھر بھی اس کے خلاف فریاد و ماتم نہ کریں۔

اخلاقی قیادت دراصل بلند اخلاقی کے ذریعہ حاصل ہونے والے نتیجہ کا دوسرا نام ہے۔ آدمی جب اس حد تک اوپر اٹھے کہ وہ یک طرفہ طور پر اپنے حقوق سے دست بردار ہو جائے۔ اس کی مسلسل قربانیوں سے جب لوگوں کے اوپر کھل جائے کہ وہ دوسروں سے مختلف ہے۔ لوگ مادی سطح پر جی رہے ہیں اور وہ غیر مادی سطح پر۔ اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی فریق ثانی کے دل کو جیت سکے جس کا دوسرا نام اخلاقی قیادت ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، اخلاقی قیادت صبر کی زمین پر ابھرتی ہے نہ کہ چیخ پکار کی زمین پر۔ (السجدہ ۲۴) ایک طرف احتجاج اور مطالبہ کی بات کرنا اور دوسری طرف اخلاقی قیادت کا نعرہ لگانا صرف ایک فکری تضاد ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے خدا کی دنیا میں صرف اخلاقی پستی کا مقام مقدر ہے نہ کہ اخلاقی قیادت کا۔

ایک ملّی ضرورت

مجھے اکثر یہ تجربہ پیش آتا ہے کہ میری ملاقات ایسے مسلمانوں سے ہوتی ہے جو تعمیری باتیں کرتے ہیں، جو مثبت سرگرمیوں میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ پورے معنی میں انسانیت دوست ہیں، ان کو کسی بھی طرح تنگ نظر یا فرقہ پرست نہیں کہا جاسکتا۔ دوسری طرف جب مجھے یہ جاننے کا موقع ملتا ہے کہ برادرانِ وطن کے احساسات مسلمانوں کے بارے میں کیا ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں مسلمانوں کی جو تصویر بنی ہے وہ بالکل منفی تصویر ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان اس ملک کا اثاثہ نہیں۔ مسلمان اس ملک کے لیے صرف بوجھ ہیں۔ وہ اس ملک میں دینے والے لوگ نہیں ہیں بلکہ صرف مانگنے والے لوگ ہیں۔ ان کی سیاست احتجاجی سیاست ہے۔ حقوق طلبی کے سوا کوئی اور زبان انھیں معلوم نہیں۔

داخلی حالت اور بیرونی تصویر میں یہ فرق کیوں ہے۔ اگرچہ مسلمانوں میں کثرت سے صحت مند ذہن کے لوگ ہیں، اس کے باوجود کیوں ایسا ہے کہ ملک میں مسلمانوں کی تصویر صحت مند تصویر نہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اخباروں کے صفحات میں اور جلسوں اور تقریروں میں ایسے مسلمان نمایاں ہو رہے ہیں جو ملت کی صحیح نمائندگی نہیں کرتے۔

موجودہ زمانہ پریس کا زمانہ ہے۔ لوگ اپنے شہر کی بات کو بھی اخباروں میں پڑھ کر جانتے ہیں۔ مسلمانوں کے بارے میں بھی عام لوگوں کو اتنی ہی بات معلوم ہے جو اخباروں میں چھپتی ہے۔ بدقسمتی سے اخبارات میں مسلمانوں کی نمائندگی ایسے لوگ کر رہے ہیں جو مسلمانوں کی نمائندگی کے اہل نہیں۔ ان کی سوچ منفی سوچ ہے۔ اس لیے ان کی نمائندگی بھی منفی نمائندگی ہوتی ہے۔ یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر مسلمانوں کی تصویر عمومی طور پر ایک غیر واقعی تصویر بن گئی ہے۔

ایسی حالت میں ایک اہم ملّی ضرورت یہ ہے کہ صحت مند سوچ رکھنے والے مسلمانوں کا ایک فورم بنایا جائے۔ یہ فورم ہر موقع پر سامنے آئے۔ وہ شکایتی زبان کو چھوڑ کر تعمیری زبان بولے۔ وہ جذباتی اندازِ کلام کے بجائے حقیقت پسندانہ اندازِ کلام اختیار کرے۔ میڈیا میں اگر اس قسم کے ایک فورم کی طرف سے مسلمانوں کی نمائندگی ہونے لگے تو ملت کی بگڑی ہوئی تصویر اپنے آپ درست ہو جائے گی۔

آہ یہ مسلمان

کوئی آدمی اسی وقت تک مسلمان نظر آتا ہے جب تک وہ کسی آزمائش میں نہ پڑا ہو۔ آزمائش میں پڑتے ہی ہر آدمی نامسلمان بن جاتا ہے۔ آپ جس شخص کا چاہیں جائزہ لے کر دیکھ لیں۔ آپ اس میں کوئی استثنار نہ پائیں گے

ایک شخص اپنے گھر میں سیدھی سادی زندگی گزارتا ہے۔ بظاہر وہ ایک سادہ مسلمان ہے۔ مگر جب اس کی لڑکی کی شادی آتی ہے تو اچانک وہ دوسرا انسان بن جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے گھر میں وہی سب ہوتا ہے جو ایک عام دنیا دار کے گھر میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی لڑکی کو تمام رسوم اور تمام جاہلی آداب کے ساتھ رخصت کر کے خوش ہوتا ہے مگر خدا کے فرشتے لکھ رہے ہوتے ہیں کہ یہ ایک گھر ہے جس سے اسلام کا جنازہ نکالا گیا۔

ایک شخص لوگوں کو دیکھنے میں معقول نظر آتا ہے۔ وہ دین اور اخلاق کی باتیں کرتا ہے۔ لیکن کسی واقعہ سے اگر اس کے دل پر چوٹ پڑ جائے تو اس کے بعد اس کے معقول خول سے ایک اور انسان برآمد ہوتا ہے جو ویسا ہی نامعقول ہوتا ہے جیسا کوئی ایسا شخص جو اپنی نامعقولیت کے لیے بدنام ہو۔ دنیا کے رجسٹر میں اب بھی اس کا نام مسلمانوں کے خانہ میں لکھا ہوا ہوتا ہے۔ مگر خدا کے نزدیک وہ ایسا شخص ہوتا ہے جس کا اسلام بغض اور حسد اور بے انصافی کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

ایک شخص دینی خدمت کے لیے اٹھتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلامی اصلاح کا کام کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر اس کا ایک شاندار ادارہ بن جائے، اس کو کچھ پیسے ہاتھ آ جائیں، اس کے گرد عوام کی بھیڑ اکٹھا ہو جائے، اس کو کوئی بڑا رتبہ مل جائے تو اس کے بعد وہ ایک اور ہی انسان کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ اب اس کا اسلام نمائشی اسلام بن جاتا ہے۔ اس کی تواضع گھمنڈ کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ دینی خدمت کا جذبہ اپنا مقام بنانے کے شوق میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مگر حقیقت کی نگاہ میں وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو اسلام کے راستہ پر چلا مگر وہ کچھ دور آگے بڑھا تھا کہ شیطان اس کو اچک لے گیا۔

خواب منتشر ہوگیا

سرسیّد نے ۲ فروری ۱۸۸۴ کو لاہور میں ایک تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے کہا کہ ہم نے علی گڑھ میں جو تعلیمی ادارہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (موجودہ مسلم یونی ورسٹی) قائم کیا ہے، اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہندؤوں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز قائم کیا جائے۔ میں ہندو اور مسلمان دونوں کو برابر کا درجہ دیتا ہوں۔ میں ہندؤوں کو اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھ کے سمجھتا ہوں (لیکچروں کا مجموعہ، صفحہ ۱۹۸)

سوامی ویویکانند نے ۱۰ جون ۱۸۹۸ کو اپنے ایک خط میں لکھا کہ ہندوازم کا خلاصہ وحدت (oneness) ہے، اور اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے انسانی اخوت اور انسانی برابری کا ایسا پریکٹیکل نمونہ قائم کیا جیسا نمونہ انسانی تاریخ میں دوسرا کوئی موجود نہیں۔ دونوں کو انڈیا کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کرنا ہے۔ انڈیا میں ایک اچھے مستقبل کی تعمیر ہندؤوں اور مسلمانوں کے اشتراک سے ہوگی (لیٹرس آف سوامی ویویکانند، صفحہ ۸۰ - ۳۷۹)

۱۹۴۷ میں ہندستان آزاد ہوا۔ اب موقع تھا کہ دونوں گروہ مل کر نئے ہندستان کی تعمیر کریں۔ دونوں فرقوں کے دو اعلیٰ رہنماؤں (اور اسی طرح دوسرے لیڈروں) نے بھرپور طور پر لوگوں کو اس ضرورت کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے باوجود یہ مشورہ عملی صورت اختیار نہ کر سکا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر تجویز کی ایک قیمت ہے۔ اگر آپ یہ مطلوبہ قیمت ادا کریں تو تجویز واقعہ بنے گی۔ اور اگر قیمت ادا نہ کی جائے تو تجویز صرف الفاظ کا ایک مجموعہ بن کر رہ جائے گی، وہ عملی واقعہ کی صورت اختیار نہیں کر سکتی۔

یہ قیمت، ایک لفظ میں، صبر ہے۔ مختلف انسان جب باہم مل کر رہیں تو لازماً ایک کو دوسرے سے شکایت ہوتی ہے۔ ایک کو دوسرے سے ناخوش گواری کا تجربہ ہوتا ہے۔ اب قیمت یہ ہے کہ اس شکایت یا اس ناگواری کو برداشت کر لیا جائے۔ بدقسمتی سے دونوں فرقوں میں سے کسی نے بھی یہ قیمت ادا نہ کی۔ اس لیے سرسید اور ویویکانند جیسے لوگوں کے الفاظ ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ وہ ملک کی سماجی زندگی کی تشکیل میں کامیاب نہ ہو سکے۔

سب سے بڑا مسئلہ

ملک کی تقسیم (۱۹۴۷) سے پہلے ہندستانی مسلمانوں کے درمیان دو قسم کی قیادتیں ابھریں۔ ایک بارِیش قیادت اور دوسری بے ریش قیادت۔ بظاہر دونوں کے درمیان زبردست اختلافات تھے۔ ایک متحدہ ہندستان کی حامی تھی، اور دوسری منقسم ہندستان کی حامی۔ مگر اس اعتبار سے دونوں یکساں تھے کہ دونوں نفرت کی زمین پر کھڑے ہوئے تھے۔ ایک کا سرمایہ نفرتِ انگریز تھا، اور دوسرے کا سرمایہ نفرتِ ہندو۔

بارِیش قیادت کی نفرت کا نشانہ انگریز تھا۔ اگر مسلمانوں نے بارِیش قیادت کا ساتھ دیا ہوتا تو انگریز کے ہندستان سے چلے جانے کے بعد شاید نفرت کی آگ ٹھنڈی پڑجاتی اور مسلمان دوبارہ معتدل زندگی گزارنا شروع کردیتے۔ مگر مخصوص اسباب کے تحت بے ریش قیادت کو کامیابی حاصل ہوئی۔ مسلمانوں کی بیشتر تعداد بے ریش قیادت کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئی۔ چونکہ بے ریش قیادت کی نفرت کا نشانہ ہندو تھا، اور ہندو تقسیم کے بعد بدستور اپنی حالت پر باقی رہا، ہندستانی مسلمانوں کے لیے اندرونی حریف کے طور پر، اور پاکستانی مسلمانوں کے لیے سرحدی حریف کے طور پر، نتیجہ یہ ہوا کہ نفرت والی سیاست کا تسلسل بدستور سرحد کے دونوں طرف جاری رہا۔

یہ بات خواہ کتنی ہی زیادہ تلخ ہو، مگر یہ حقیقت ہے کہ موجودہ مسلمانوں کا واحد سرمایہ جس پر وہ جی رہے ہیں وہ محبت نہیں بلکہ نفرت ہے۔ اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ ان کے درمیان وہی اخبارات سب سے زیادہ پڑھے جاتے ہیں جو انھیں نفرت کی شراب پلائیں۔ ان کے درمیان وہی افراد قائد بن کر ابھرتے ہیں جو نفرت کے لہجہ میں بات کریں۔ وہ انھیں نعروں پر سب سے زیادہ متحرک ہوتے ہیں جن کے اندر نفرت کی چاشنی موجود ہو۔

مسلمانوں کی نجات کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو نفرت کے اس گڑھے سے نکالیں اور محبت کی زمین پر کھڑے ہونے کی کوشش کریں۔ ورنہ یقینی ہے کہ وہ خدا کی پکڑ میں آجائیں گے، اور انھیں کے ساتھ ان کے وہ اکابر بھی جو مسلمانوں کو اس خلافِ اسلام مشغلہ میں دیکھتے ہیں، پھر بھی وہ انھیں نہیں ٹوکتے۔

ایک مثال

ایک خبر پڑھیے : برطانیہ کے شہر لیسسٹر میں پچھلے کچھ عرصہ سے مسلمانوں اور مقامی آبادی کے درمیان مساجد میں لاوڈ اسپیکر پر اذان کے سوال پر کچھ ناخوش گواری چلی آرہی تھی۔ مقامی عیسائی آبادی اور محکمہ حفظان صحت کا کہنا ہے کہ لاوڈ اسپیکروں اور امپلی فائروں کی آواز ایک خاص حد میں رہنی چاہیے۔ جیسا کہ چرچوں کی گھنٹیوں کی آواز رہتی ہے۔ اور یہ کہ کم سے کم فجر کی اذان کے لیے لاوڈ اسپیکر کے استعمال سے احتراز کیا جائے۔ اب لندن کے اخبار ٹائمز کی اطلاع سے معلوم ہوا کہ یہ معاملہ خوش اسلوبی سے سلجھ گیا ہے۔ مسلم رہنماؤں اور مقامی حکام نے مل بیٹھ کر طے کرلیا کہ اذان لاوڈ اسپیکر پر بدستور ہوتی رہے گی لیکن محدود آواز میں۔ مسلمان فجر کی اذان میں یہ آلہ استعمال نہیں کریں گے۔ اب صرف عشاء کی اذان کے وقت کا معاملہ ہے۔ حکام کہتے ہیں کہ یہ اذان زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے دے دی جائے۔ جبکہ ائمہ کا اصرار ہے کہ اس کا وقت نو سے ساڑھے نو بجے تک ہونا چاہیے۔ اخبار کا کہنا ہے کہ یہ معاملہ بھی سلجھ جائے گا (سہ روزہ دعوت ۲۵ جولائی ۱۹۹۰)

مذکورہ واقعہ میں برطانیہ کے مسلمانوں نے جو طریقہ اختیار کیا اس کا نام ایڈجسٹمنٹ ہے۔ الرسالہ اسی ایڈجسٹمنٹ کی دعوت دیتا ہے، مگر وہی مسلمان جو برطانیہ میں ایڈجسٹمنٹ پر راضی ہو جاتے ہیں، انھیں سے جب ہندستان میں ایڈجسٹمنٹ کی بات کہی جائے تو وہ اس کو "بزدلی" کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔

یہی ہندستان کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہے۔ یہ مسلمان باہر کے ملکوں میں جا کر جس طرح رہتے ہیں، اگر اسی طرح وہ ہندستان میں بھی رہنے لگیں تو یہاں کے فرقہ وارانہ مسائل اس طرح ختم ہو جائیں گے جیسے کہ وہ تھے ہی نہیں۔

ایڈجسٹمنٹ بزدلی نہیں، ایڈجسٹمنٹ زندگی کا اصول ہے۔ اس کی ضرورت ہر جگہ اور ہر ملک کے لیے ہے، خواہ وہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک۔ اس کی صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں مگر اس کی ضرورت اور اہمیت ہر جگہ یکساں طور پر باقی رہتی ہے۔ ایڈجسٹمنٹ کے بغیر اس دنیا میں زندگی کی تعمیر ممکن نہیں۔

مزید یہ کہ یہ انداز مدعو کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ دعوت کے بارہ میں ہمدردانہ غور کر سکے۔ اس اعتبار سے یہ طریقہ سراسر حکمت ہے نہ کہ عام معنوں میں صرف ایک مصلحت۔

آسان حل

ایک قائد فرقہ وارانہ فساد کے موضوع پر بول رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں جو فسادات کے خلاف تحریک چلا رہا ہوں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مجھے ذاتی طور پر کوئی خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ میرے لیے دولت مند عرب ملکوں میں قیمتی پیش کشیں موجود ہیں اور میں وہاں جاکر آرام اور عافیت کی زندگی گزار سکتا ہوں۔

یہ آدھی سچائی ہے۔ کسی مسلمان کے لیے عرب ملکوں میں قیمتی جگہ صرف اس شرط پر ہے کہ وہ وہاں کے نظام سے مکمل موافقت کرے۔ اگر وہ وہاں جاکر اس قسم کی مخالفِ نظام تقریر کرنے لگے جیسی تقریریں ہمارے قائدین یہاں کرتے رہتے ہیں تو عرب ملکوں میں اس کی کم سے کم سزا یہ ہوگی کہ اس کو فوراً وہاں سے "ڈی پورٹ" کر دیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں اصاغر اور اکابر کی بہت بڑی تعداد عرب ملکوں سے قیمتی فوائد حاصل کر رہی ہے۔ کچھ لوگ وہاں مستقل طور پر آباد ہیں۔ کچھ لوگ تقریبات اور کانفرنسوں میں شریک ہوکر اپنی شہرت اور اعزاز میں اضافہ کر رہے ہیں۔ مگر ان فوائد کا حصول صرف اس قیمت پر ممکن ہوا ہے کہ ہر ایک وہاں کے سیاسی نظام کے بارہ میں مکمل طور پر خاموش رہتا ہے۔ وہ وہاں کی ان خرابیوں کے خلاف کبھی نہیں بولتا جن کے خلاف بولنا حکومتی نظام سے ٹکرانے کے ہم معنی ہو۔ حتی کہ اگر وہاں لاؤڈ اسپیکر کے عمومی استعمال پر پابندی ہو تو وہ یہ مطالبہ لے کر نہیں کھڑے ہوتے کہ ہم کو لاؤڈ اسپیکر کے عام استعمال کی اجازت دی جائے۔ یہی وہ واحد قیمت ہے جس کی ادائیگی نے انھیں یہ موقع دیا ہے کہ وہ عرب ملکوں کے قیمتی فوائد اپنے لیے سمیٹ سکیں۔

ایسی حالت میں کہنے والوں کو یہ کہنا چاہیے کہ جس طرح عرب ملکوں میں جاکر ہم لوگ وہاں کے نظام سے موافقت کرکے رہتے ہیں اسی طرح ہم کو یہاں بھی نظام سے موافقت کرکے رہنا چاہیے۔ اس کے بعد ہم کو یہاں بھی اسی طرح آرام اور عافیت کی زندگی مل جائے گی جس طرح ہم کو عرب ملکوں میں آرام اور عافیت کی زندگی ملی ہوئی ہے۔ یہ صرف قیمت کی ادائیگی کا مسئلہ ہے نہ کہ ایک ملک اور دوسرے ملک میں فرق کا۔

صرف ہندستان نہیں

ڈاکٹر رفیق زکریا کی ایک انگریزی کتاب ۱۹۸۸ میں نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ اس کا نام ہے داخلی کش مکش اسلام میں (The Struggle within Islam) مصنف نے اس کتاب میں جو باتیں لکھی ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جس کا تعلق ہندستانی مسلمانوں سے ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اچھا ہوگا اگر وہ یہاں دھیما انداز اختیار کریں، کیوں کہ پُرشور انداز والا اسلام ہندستان میں صرف ٹکراؤ پیدا کرنے کا باعث ہوگا:

It would be better if the community kept a low-profile because high-profile Islam in India can only provoke confrontation.

مسٹر جی جیب اللہ نے اس نظریہ پر تنقید کی ہے جو ٹائمس آف انڈیا (۱۸ جون ۱۹۸۹) میں شائع ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام، دوسرے مذہبوں کی طرح نرمی اور مصالحت کو گوارا نہیں کر سکتا۔ مسیح کے متعلق بےہودہ اور کافرانہ فلم لاسٹ ٹمپٹیشن آف کرائسٹ پر عیسائیوں کے نرم ردعمل کا مقابلہ سٹنک ورسز پر مسلمانوں کے شدید ردعمل سے کیجئے۔ اسلام ایسا نہیں کر سکتا کہ بس اپنا سر نیچا کر لے اور مصلحت اندیشانہ اور شریفانہ انداز اختیار کرے:

Compare the bland Christian reaction to the vulgar and blasphemous film, The Last Temptation of Christ, and the vigorous Muslim reaction to The Satanic Verses. Islam is just not going to keep its head down and behave in a prudently gentlemanly fashion.

"لو پروفائل" اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک اصول ہے نہ کہ سرافگندگی۔ خواہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک، ہر جگہ اسی طریقہ پر چل کر کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ حتی کہ جو لوگ لو پروفائل کے مسلک پر پرجوش لفظی تنقید کرتے ہیں، وہ خود بھی اپنے ذاتی معاملات کو ہمیشہ اسی ڈھنگ پر درست کرتے ہیں۔

مسلمانوں کو لو پروفائل کا طریقہ بطور اصول اختیار کرنا چاہیے، نہ صرف ہندستان میں بلکہ ساری دنیا میں۔ موجودہ زمانہ میں اس کے سوا زندگی کا کوئی اور طریقہ نہیں۔

احتساب غیر

ڈاکٹر ذاکر حسین (۱۹۶۹ - ۱۸۹۷) نے ایک بار بتایا کہ جب وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں وائس چانسلر بن کر آئے تو یونیورسٹی کے کچھ لوگ ان سے ملے اور کہا کہ یونیورسٹی میں کئی اسٹاف ممبر رجعت پسند اور فرقہ پرست ہیں۔ ان کی وجہ سے یونیورسٹی بدنام اور تباہ ہورہی ہے۔ اگر ان سب لوگوں کو نکال دیا جائے تو اس کے بعد یونیورسٹی کی فضا بالکل درست ہوجائے گی۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ آپ ایسے لوگوں کی فہرست بناکر مجھے دیدیجئے۔

پھر کچھ دوسرے لوگ ذاکر صاحب سے ملے۔ انھوں نے دوبارہ کہا کہ یونیورسٹی کے کئی استاد کمیونسٹ اور دہریہ ہیں۔ ان کو آپ یہاں سے نکال دیں تو اس کے بعد یونیورسٹی کی فضا بالکل صحیح ہو جائے گی۔ ذاکر صاحب نے ان سے بھی کہا کہ آپ مذکورہ افراد کی فہرست بناکر مجھے دیدیں۔

دونوں صاحبان کی طرف سے فہرستیں بن کر آگئیں۔ اس زمانہ میں مسلم یونیورسٹی میں تقریباً تین سو آدمیوں کا ٹیچنگ اسٹاف تھا۔ جب کہ دونوں فہرستوں میں دو دو سو نام درج تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا: "میں حیران ہوں کہ آخر تین سو آدمیوں میں سے چار سو آدمیوں کو کیسے نکال دوں"

دونوں فہرستوں کو ملاکر جانچا گیا تو معلوم ہوا کہ تقریباً پچاس نام ایسے ہیں جو دونوں فہرستوں میں مشترک طور پر موجود ہیں۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ بتائیے، اگر میں ان سب کو نکال دوں تو پھر یونیورسٹی میں کون رہ جائے گا جو یہاں بچوں کو پڑھائے (الجمعیتہ، دہلی، ۲۸ جون ۱۹۸۰)

یہ واقعہ قوم کی اخلاقی حالت کو بتا رہا ہے۔ آج مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہر ایک دوسروں کے بارہ میں سوچنے کا بادشاہ ہے۔ کوئی شخص اپنے بارہ میں سوچنے کے لیے تیار نہیں۔ ہر ایک کے پاس بیرونی غلط کاروں کی لمبی لمبی فہرستیں ہیں۔ مگر خود اپنی غلط کاری کی فہرست کسی کے پاس بھی نہیں۔

کسی قوم کے افراد میں احتساب خویش کا مزاج ہو تو اس کے تمام معاملات درست رہتے ہیں۔ اور جس قوم کے افراد میں احتساب غیر کا مزاج پیدا ہو جائے، اس کے تمام معاملات بگڑجاتے ہیں۔ احتساب خویش کے مزاج سے دنیا بھی درست ہوتی ہے اور آخرت بھی۔ احتساب غیر کا مزاج دنیا کو بھی بگاڑ دیتا ہے اور آخرت کو بھی۔

دانش کے بغیر

سسرو (Cicero) ۱۰۶ قبل مسیح میں اٹلی میں پیدا ہوا، ۴۳ ق م میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ رومی دور کا مشہور عالم اور مفکر اور خطیب شخص سمجھا جاتا ہے۔ اس کے ایک قول کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے کہ ایک فوج کی قیمت میدان جنگ میں صرف اس وقت ہے جب کہ میدان جنگ کے پیچھے بہت سے دانش مند مشیر موجود ہوں:

An army is of little value in the field unless
there are wise councels at home.

یہ ایک بے حد اہم حقیقت ہے۔ فوج یا ہتھیار کی حیثیت طاقت کی ہے۔ طاقت سے مطلوب فائدہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو دماغ کی رہنمائی میں استعمال کیا جائے۔ جس طاقت کو استعمال کرنے کے لیے دماغ کی صلاحیت موجود نہ ہو، وہ طاقت صرف تخریب برپا کرے گی، ایسی طاقت کبھی تعمیری نتائج ظاہر نہیں کرسکتی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان اس تاریخی حقیقت کی بدترین مثال ہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے بار بار اپنی ہتھیار بند فوج بنائی ہے اور بار بار مفروضہ دشمنوں کے ساتھ ٹکراؤ کیا ہے۔ مگر ہر بار صرف ایک ہی نتیجہ سامنے آیا، اور وہ تخریب تھا، موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے متشددانہ اقدامات نے تخریب اور بربادی کی تاریخ تو ضرور بنائی ہے، مگر ان کا کوئی ایک اقدام بھی ایسا نہیں جس نے حقیقی معنوں میں مسلمانوں کے لیے یا وسیع انسانیت کے لیے تعمیر اور فلاح کی تاریخ بنائی ہو۔ اور اس کی وجہ یہی تھی کہ انھوں نے فوج تو کسی نہ کسی طرح بنالی مگر اس کی رہنمائی کے لیے دانش مند ذہن انھیں حاصل نہ ہوسکا۔

متشددانہ کارروائی نفرت کے جذبہ کے تحت کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس مجاہدانہ کارروائی کا سرچشمہ محبت ہوتا ہے۔ مجاہد سب سے پہلے اپنے آپ کو ہلاک کرتا ہے، اس کے بعد وہ دوسرے کے خلاف اقدام کرنے کے لیے اٹھتا ہے۔ موجودہ مسلمان نفرت کے جذبہ کے تحت اٹھے، اس لیے ان کی یہ کارروائیاں نفسانی عمل کے خانہ میں جاتی ہیں نہ کہ مجاہدانہ عمل کے خانہ میں۔ اگر وہ اپنی ان کارروائیوں کو جہاد کہیں تو یہ غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہوگا۔ اس طرح وہ خدا کی نظر میں بھی مجرم ٹھہریں گے اور بندوں کی نظر میں بھی۔

فرق کا سبب

راجہ مہندر پرتاپ (۱۹۷۹ - ۱۸۸۶) نے ۱۹۰۷ میں اپنی اہلیہ کے ساتھ دنیا کا سفر کیا تھا۔ اس سفر میں انھوں نے چار مہینے گزارے اور یورپ، امریکہ، کناڈا، جاپان وغیرہ جاکر نئی دنیا کو اپنی آنکھ سے دیکھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس طرح مجھے عالمی نگاہ حاصل ہوئی۔ میرے سفر نے مجھے مطمئن کر دیا کہ یورپ اور امریکہ کی ترقی کی وجہ جدید مشینوں اور صنعتوں کے سبب سے ہے۔ میں نے اپنا یہ ذہن بنایا کہ مجھے ہندستان میں ٹکنکل تعلیم کا آغاز کرنا ہے :

Thus I received World Vision. My tour convinced me that the progress of Europe and America was due to modern machines and industries. I made up my mind to start technical education.

چنانچہ سفر سے واپسی کے بعد راجہ مہندر پرتاپ نے ٹکنکل اسکول اور ٹکنکل کالج قائم کیا جس کا نام ابتداءً پریم مہاودیالیہ تھا۔ انھوں نے اپنی ریاست کے پانچ گاؤں اور ورندابن میں اپنا ایک بہت بڑا مکان اس کام کے لیے وقف کر دیا۔ ان پانچ گاؤں کی آمدنی تقریباً ۳۰ ہزار روپیہ سالانہ تھی۔ موجودہ صدی کے آغاز میں یہ آمدنی بہت بڑی رقم کے برابر تھی۔ 1911 میں راجہ مہندر پرتاپ نے دوبارہ مغربی دنیا کا سفر کیا اور انگلینڈ، جرمنی، سوئزرلینڈ اور پیرس کے ٹکنکل کالجوں کو دیکھا تاکہ اس کے مطابق اپنے یہاں کی ٹکنکل تعلیم کے اداروں کو مزید ترقی دے سکیں۔ (ڈے آفٹر، اگست ۱۹۸۷)

اکثریتی فرقہ میں راجہ مہندر پرتاپ جیسے بہت سے لوگ ہیں جنھوں نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں مغربی دنیا کا سفر کیا۔ اور ہندستان واپس آکر اس قسم کا تعمیری کام کیا جس کی ایک مثال اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔ جب کہ مسلمانوں میں ایسی کوئی بھی مثال موجود نہیں۔

ماضی کا یہی فرق ہے جو دونوں فرقوں کے حال کے فرق کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ یہ پچھڑے پن کا کیس ہے نہ کہ تعصب کا کیس۔

یہ لیڈر

مسٹر جناح اور پاکستان کے بارہ میں حال میں لندن سے ایک کتاب چھپی ہے۔ مصنف کا نام اور کتاب کا نام حسب ذیل ہے:

Jinnah of Pakistan, by Stanley Wolpert

اس کتاب میں آزادی سے قبل کی ہندستانی سیاست پر بہت سی دل چسپ باتیں درج ہیں۔ اس کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے:

Congress leaders had different views from Jinnah regarding the political set-up in the country. Before the demand of Pakistan, Jinnah was asking for a loose federation with the Centre having limited powers and residue powers resting with the states. On the other hand, the whole thrust of the nationalist politics of the Congress was in the direction of a strong Centre. Jinnah could not have gone along with Congress leaders.

ملک کے سیاسی ڈھانچہ کے بارہ میں کانگرسی لیڈروں کا نقطۂ نظر جناح کے نقطۂ نظر سے مختلف تھا۔ پاکستان کے مطالبہ سے پہلے جناح کا مطالبہ ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق کا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مرکز کے اختیارات محدود ہوں اور بقیہ اختیارات ریاستوں کو حاصل رہیں۔ دوسری طرف کانگرس کی قومی سیاست کا پورا زور اس رخ پر تھا کہ مرکز مضبوط ہو۔ جناح کانگرسی لیڈروں کے ساتھ نہیں چل سکتے تھے (ٹائمس آف انڈیا ۱۱ نومبر ۱۹۸۴)

مسٹر جناح کیوں آزاد ہندستان میں ایک کمزور سیاسی مرکز چاہتے تھے۔ اور کانگرسی لیڈر کیوں طاقتور مرکز پر زور دیتے تھے۔ اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ ان لیڈروں کی نگاہ سیاسی پارٹیوں کے رزولیوشن کے الفاظ پر تو خوب تھی مگر ان میں سے کوئی لیڈر ان تاریخی حقیقتوں کو نہ دیکھ سکا جو کسی ملک کی تشکیل میں اصلاً فیصلہ کن ہوا کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں یہود کے دین کو برابر کے درجہ میں تسلیم کر لیا (للیہود دینھم وللمسلین دینھم) اسی طرح صلح حدیبیہ کے وقت آپ ایسی دفعات پر راضی ہوگئے جو مکہ کے اوپر منکرین اسلام کی بالادستی کے اعتراف کے ہم معنی تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی نظر حال پر نہیں تھی بلکہ مستقبل پر تھی۔ آپ جانتے تھے کہ وقتی معاہدہ میں خواہ جو لفظ بھی لکھ دیا جائے، بالآخر مکہ اور مدینہ کا فیصلہ وہ تاریخ کرے گی جو اسلامی دعوت کے نتیجہ میں عرب میں بننا شروع ہوئی ہے۔ اسی پیغمبر کے ماننے والوں کا حال آج یہ ہے کہ وہ سامنے کی باتوں کے سوا کوئی اور بات جانتے ہی نہیں۔

جو اس لئے عمل کرتے ہیں کہ انھیں کہا جائے

ایک "ظالم" حکمراں کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے پُرشور جہاد شروع ہو تو بہت سے لوگ اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں ایسے بھی ہیں جو حکومت کی گولیاں کھا کر جان دے دیتے ہیں۔ لیکن ایک معمولی آدمی جوان مجاہدین میں سے کسی مجاہد کے ظلم کا شکار ہو رہا ہو اور وہ اس مجاہد سے مل کر کہے کہ میرے اوپر اپنا یہ ظلم ختم کر دو تو مجاہد اسلام کو اس معاملہ سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "ظالم حکمراں" کو گدی سے ہٹانا ایک ایسا کام ہے جو اخبارات میں چھپتا ہے۔ اس میں لیڈری ملتی ہے۔ اس سے آدمی کا نام چمکتا ہے۔ اس کے برعکس ایک انفرادی معاملہ کو نپٹانا اپنے اندر کوئی اخباری اہمیت نہیں رکھتا۔ مزید یہ کہ اس میں اپنے نفس کو دبانا ہے جو ہمیشہ انسان کے لئے مشکل ترین کام رہا ہے۔ اجتماعی خطاب میں الفاظ بولنا کافی ہو جاتا ہے جب کہ انفرادی شکایت کو دور کرنے میں عمل کے تقاضے پورے کرنے ہوتے ہیں۔ پہلی صورت میں آدمی کی شان بڑھتی ہے، دوسری صورت میں اس کی شان گھٹتی ہے۔ پہلی صورت میں آدمی کا درجہ بلند ہوتا ہے اور دوسری صورت میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلہ میں نیچا کرنا پڑے گا۔

اسی طرح تقریر و تحریر کے اسٹیج پر دین کی علم برداری کرنی ہو تو بہت سے سورما مل جائیں گے جو اسلامی موضوعات پر الفاظ کے دریا بہا دیں۔ مگر اسلامی تعمیر کے لئے خاموش جدوجہد کرنا ہو تو اس میں اپنا حصہ ادا کرنے کا شوق کسی میں پیدا نہیں ہوگا۔ کسی شہر میں فساد ہو جائے تو رہنماؤں کا قافلہ امدادی چندہ جمع کرنے کے لئے نکل پڑے گا۔ لیکن اگر ایک مصیبت کا مارا آدمی ان کے پاس پہنچے اور ان سے اپنی امداد کے لئے کہے تو اس کی مدد کے لئے کوئی تڑپ ان کے اندر نہ پیدا ہوگی۔ مسلمانوں کی کسی آبادی پر آفت نازل ہو تو وہ اخباری بیان کے ذریعہ لوگوں سے "یوم دعا" منانے کی اپیل کریں گے۔ مگر ان کی اپنی ایک رات بھی ایسی نہ گزرے گی جب کہ ستم رسیدہ مسلمانوں کے غم میں ان کی نیند اڑ گئی ہو اور وہ رو رو کر اپنی تنہائیوں میں اللہ سے دعائیں مانگ رہے ہوں۔ وہ خود اپنا منصب یہ بتائیں گے کہ خدا نے ان کو احتساب کائنات کا کام سپرد کیا ہے لیکن اگر ان کی اپنی ذات میں کسی غلطی کی نشان دہی کیجئے تو بپھر اٹھیں گے اور چاہیں گے کہ ایسے گستاخ انسان کی جڑ کھود ڈالیں۔

کیوں ایسا ہے کہ پہلی قسم کے کام کا موقع ہو تو سارے رہنما اس کی طرف دوڑتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرے قسم کے کام کے لئے ان کے اندر کوئی اکساہٹ پیدا نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ پہلے کام میں شہرت و عزت ملتی ہے۔ جب کہ دوسرے کام میں آدمی کو اس قسم کا کوئی دنیوی کریڈٹ نہیں ملتا۔ وہ اسلام سے یہ قیمت لینا چاہتے ہیں کہ ان کو "کہا جائے"۔ اس لئے جہاں کہے جانے کی امید ہو وہاں وہ لپکتے ہیں اور جہاں یہ امید نہ ہو اس سے بے رغبت ہو جاتے ہیں۔ یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ رہنماؤں میں جس اسلام کی دھوم ہے وہ اشتہاری اسلام ہے نہ کہ حقیقی اسلام۔ وہ دنیوی قیادت کا ایک بازار لگاتے ہیں اور اس کو مقدس ظاہر کرنے کے لئے اس کو اسلام کا نام دے دیتے ہیں۔ ان کو اس اسلام سے دلچسپی ہے جس میں اخباری اہمیت (نیوز ویلیو) ہو جس سے ان کی قائدانہ امیج بنتی ہو، جس کے ذریعہ دنیا کا کوئی نفع حاصل ہوتا ہو۔ ان کو

اُس اسلام سے کوئی دل چسپی نہیں جس سے خدا خوش ہوتا ہو۔ جس سے آخرت کا انعام ملنے والا ہو۔ ایسے لوگوں کی ظاہری کامیابیاں اکثر انھیں دھوکے میں ڈال دیتی ہے۔ مگر انھیں اس حدیث رسول کو نہ بھولنا چاہیے جس کو بیان کرتے ہوئے رسول اللہ کے صحابی بے ہوش ہو گئے تھے :

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ان اول الناس یقضی یوم القیامۃ علیہ رجل اُستشھد فأتی بہ نعرفہ نعمتہ فعرفھا، قال : فما عملت فیھا؟ قال : قاتلت فیک حتی استشھدت، قال : کذبت و لکنک قاتلت لأن یقال جریئ فقد قیل، ثم اُمر بہ فسحب علی وجھہ حتی القی فی النار، ورجل تعلم العلم وعلمہ وقرأ القرآن، فأتی بہ فعرفہ نعمہ فعرفھا، قال: فما عملت فیھا؟ قال: تعلمت العلم وعلمتہ، وقرأت فیک القرآن، قال: کذبت ولکنک تعلمت لیقال عالم، وقرأت القرآن لیقال قاریٔ فقد قیل، ثم امر بہ فسحب علی وجھہ حتی القی فی النار، ورجل وسع اللہ علیہ وأعطاہ من اصناف المال فأتی بہ فعرفہ نعمہ فعرفھا، قال: فما عملت فیھا؟ قال: ماترکت من سبیل تحب ان ینفق فیھا الا أنفقت فیھا لک، قال : کذبت ولکنک فعلت لیقال ھو جواد فقد قیل، ثم اُمر بہ فسحب علی وجھہ ثم القی فی النار" (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا : قیامت کے دن سب سے پہلے جس کا فیصلہ کیا جائے گا وہ وہ شخص ہے جو شہید ہوا۔ اس کو لایا جائے گا۔ اللہ اس کو اپنی نعمتیں بتائے گا۔ وہ ان کا اقرار کرے گا۔ اللہ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے ساتھ کیا عمل کیا۔ وہ کہے گا میں نے تیری راہ میں جنگ کی یہاں تک کہ میں شہید ہو گیا۔ اللہ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا۔ بلکہ تو نے اس لئے جنگ کی تاکہ کہا جائے کہ تو بہادر ہے۔ سو کہا جاچکا۔ پھر حکم ہوگا اور اس کو منھ کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ اس کے بعد اس شخص کو بلایا جائے گا جس نے علم دین سیکھا اور اس کی تعلیم دی اور قرآن کو پڑھا۔ اللہ اس کو اپنی نعمتیں بتائے گا وہ ان کا اقرار کرے گا۔ اللہ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے ساتھ کیا عمل کیا۔ وہ کہے گا میں نے علم دین سیکھا اور سکھایا اور تیری راہ میں قرآن پڑھا۔ اللہ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا۔ بلکہ تو نے علم اس لئے سیکھا تاکہ تو عالم کہا جائے اور قرآن اس لئے پڑھا تاکہ تجھ کو قرآن پڑھنے والا کہا جائے۔ سو کہا جاچکا۔ پھر حکم ہوگا اور اس کو منھ کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ اس کے بعد اس شخص کو بلایا جائے گا جس کو اللہ نے وسعت دی تھی اور مال عطا کیا تھا۔ اللہ اس کو اپنی نعمتیں بتائے گا۔ وہ ان کا اقرار کرے گا۔ اللہ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے ساتھ کیا عمل کیا۔ وہ کہے گا میں نے ان کو تیرے پسندیدہ راستوں میں خرچ کیا۔ اللہ فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا۔ بلکہ تو نے اس لئے خرچ کیا کہ تجھ کو سخی کہا جائے۔ سو کہا جاچکا۔ پھر حکم ہوگا اور اس کو منھ کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

یہ ان لوگوں کا حال ہے جنھوں نے دین کے نام پر جان دی، دین کی خدمت میں اپنی زندگیاں لگائیں۔ دین کے نام پر اپنے مال کو خرچ کیا۔ مگر یہ سب کچھ انھوں نے نمائش کے جذبہ کے تحت کیا۔ اس لئے وہ خدا کے یہاں غیر مقبول ٹھہرے اور جہنم میں داخل کر دیئے گئے۔ پھر ان لوگوں کا قیامت کے دن کیا حال ہوگا جنھوں نے دین کو تجارت بنایا جنھوں نے دین کے نام پر دنیا کمائی۔ جو دین کو دینے کے بجائے صرف دین سے لیتے رہے۔

زور والے بے زور ہوں گے

دیا سلائی بنانے والے نے جب دیا سلائی بنائی تو اس نے جاننا چاہا کہ اس کی دیا سلائی کس حد تک جلانے کی طاقت رکھتی ہے۔ اس نے کچھ لکڑی جمع کی اور اس کو جلاکر اس کا تجربہ کیا۔ اس کے بعد وہ وقت آیا جب جانوروں پر طرح طرح کے تجربے کئے جانے لگے۔ جانوروں کو زہریلی چیزیں کھلانا، جانوروں کے جسم کے کسی حصہ کو بیکار کرنا، جانوروں کو مار کر ان کا جائزہ لینا، وغیرہ۔ اب تجربات کا یہ سلسلہ اپنے تیسرے دور میں داخل ہوگیا ہے۔ یہ انسانوں پر تجربہ ہے۔ دنیا کی کچھ قومیں جنھوں نے "بڑی طاقت" کا مقام حاصل کر لیا ہے۔ وہ ہلاکت خیز ہتھیار بناتی ہیں اور ان کی ہلاکت خیزی کا تجربہ کرنے کے لئے ان کو کمزور قوموں پر استعمال کرتی ہیں۔ نیٹو (NATO) کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اسپین کی سول وار میں ہٹلر نے اپنے ٹینک اور بمبار ہوائی جہازوں کو بے تکلف استعمال کیا۔ اس کے نتیجہ میں ہزاروں لوگ ہلاک یا معذور ہوگئے۔ تاہم ہٹلر نے فتح کی خوشی منائی۔ کیوں کہ اس کا مقصد اپنے ہتھیاروں کی ہلاکت خیزی کو جاننا تھا اور وہ حاصل ہوگیا۔ اسی طرح ویٹ نام کی جنگ میں امریکہ نے اپنے ہیلی کوپٹر اتنی زیادہ تعداد میں اڑائے کہ زمین پر ان کے سایہ سے اندھیرا چھا گیا۔ یہ تاریخ کی پہلی جنگ تھی جس میں جنگی ہیلی کوپٹر استعمال کئے گئے۔ ویٹ نام کا چھوٹا سا ملک تباہ ہوگیا۔ تاہم امریکہ اپنے مقصد میں کامیاب تھا۔ وہ اپنے ہیلی کوپٹروں کی جنگی قوت کا اندازہ کرنا چاہتا تھا اور ویٹ نام کو قبرستان بنا کر اس نے یہ اندازہ کرلیا۔ اب روس یہی کام افغانستان میں کر رہا ہے۔

روس نے بھاری قسم کے جنگی ہیلی کوپٹر بنائے ہیں۔ وہ ان کی مار کا اندازہ کرنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اس کو کمزور افغانستان کی سرزمین حاصل ہوگئی ہے۔ اس نے افغانستان کو اپنے جدید ترین جنگی ہتھیاروں کی تجربہ گاہ بنادیا ہے۔ لاکھوں لوگ قتل اور برباد ہو رہے ہیں۔ بے شمار لوگ اپنے وطن کو چھوڑ کر پڑوسی ملک میں پناہ لے رہے ہیں۔ تاہم روس کا مقصد حاصل ہے۔ افغانوں کی زمین کو قبرستان بنا کر وہ اپنے جنگی ہتھیاروں کا تجربہ کر رہا ہے (ہندستان ٹائمس یکم اپریل ۱۹۸۰)

یہ دنیا کیا اندھیر نگری ہے۔ کیا خدا نے یہاں کچھ لوگوں کو طاقت ور بنا کر بھیج دیا کہ وہ اپنے طاقت ور ہونے کا انعام پائیں۔ اور کچھ لوگوں کو کمزور بنا کر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے کمزور ہونے کی سزا

بھگتیں۔ اس قسم کا خیال کرنا خدا کی خدائی کو باطل کرنے کے ہم معنی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بیکار نہیں بنایا۔ یہ ان لوگوں کا گمان ہے جو منکر ہیں۔ ایسے منکرین کے لئے بربادی ہے جہنم کی آگ سے۔ کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کیا اور ان کو جو زمین میں فساد کرتے ہیں یکساں کر دیں گے۔ کیا متقیوں کو ہم فاجروں جیسا کر دیں گے (ص)

جو لوگ اپنے ان ظالمانہ مشغلوں میں لطف رہے ہیں ان کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ اس دنیا کے مالک وہ نہ تھے بلکہ اس دنیا کا مالک خدا تھا۔ موت کا فرشتہ جب ان کو پچھاڑے گا تو وہ دیکھیں گے کہ وہ چیونٹی سے بھی زیادہ بے حقیقت تھے۔ وہ چیزیں جن کے بل پر وہ اپنے کو طاقت ور سمجھے ہوئے تھے وہ ان کے کچھ کام نہ آئیں گے وہ اوندھے منہ اپنے کو آخرت کی خندق میں گرا ہوا پائیں گے وہ پکاریں گے مگر وہاں کوئی نہ ہوگا جو ان کی پکار کو سنے، وہ مدد چاہیں گے مگر وہاں کوئی نہ ہوگا جو ان کی مدد کے لئے دوڑے۔

اسراف کا نتیجہ

مصر کا حکمراں خدیو اسماعیل پاشا (۱۸۹۵ - ۱۸۳۰) اعلےٰ صلاحیت کا مالک تھا۔ اس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ مصر کو عملی طور پر ترکی کی عثمانی خلافت سے آزاد کر لیا۔ بحر احمر اور بحر روم کو ملانے کے لئے نہر سوئز نکالنے کا منصوبہ (۱۸۶۶) اسی کے زمانہ میں بنا۔ اسماعیل پاشا نے اس منصوبہ کی اہمیت کو سمجھا اور اس کو فوراً منظوری دے دی۔

خدیو اسماعیل پاشا عوام کو خوش کرنا بھی جانتا تھا۔ چنانچہ وہ مصر کا پہلا حکمراں ہے جس نے ملک میں ۱۸۶۷ میں منتخب اسمبلی کے طریقہ کو رائج کیا۔ اس کی زندگی میں اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جو اس کی اعلیٰ صلاحیت کو ثابت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود خدیو اسماعیل پاشا کا آخری انجام یہ ہوا کہ وہ نالائق حکمراں قرار پایا۔ اور اپنے بیٹے توفیق پاشا کے حق میں اس کو تخت و تاج چھوڑنا پڑا۔

اس ناکامی کی وجہ خدیو اسماعیل پاشا کی ایک غلطی تھی۔ اور وہ اس کا حد سے بڑھا ہوا اسراف تھا۔ مصر میں وہ ایک فضول خرچ حکمراں کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اس کے علاوہ جب وہ مصر سے باہر (ترکی فرانس وغیرہ) جاتا تو وہاں وہ اور بھی زیادہ بے دردی کے ساتھ دولت خرچ کرتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے زمانہ میں مصر کے قرضہ کی مقدار ۱۰۰ ملین پونڈ تک پہنچ گئی تھی۔

خدیو اسماعیل پاشا کی فضول خرچیوں کو پورا کرنے کے لئے مصر کا خزانہ ناکافی تھا۔ چنانچہ اس نے ملک کے بیت المال، خیراتی اوقاف اور یتیموں اور بیواؤں کے فنڈ سے بھی قرض لے رکھا تھا جو تقریباً ۵۳۷۰۰۰ پونڈ کے برابر تھا۔

ان قرضوں کی ادائیگی کے لئے اس نے مصری عوام کے اوپر ٹیکسوں کا بوجھ لاد دیا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس کے زمانہ میں تقریباً چالیس قسم کے ٹیکس ملک میں نافذ تھے۔ عبدالرحمٰن الرافعی کی کتاب "اسماعیل" اور یوسف نحاس کی کتاب "الفلاح" میں اس کے ٹیکسوں کی جو تفصیل درج ہے وہ انتہائی دہشت ناک ہے۔ مثلاً قدیم مصری کسان ایک لباس پہنتے تھے جس کو زعبوط کہا جاتا تھا۔ اسماعیل پاشا کی حکومت نے اس کپڑے پر بھی ٹیکس لگا دیا۔

ایک زعبوط پر ایک ریال ٹیکس تھا۔ ادائیگی کے وقت زعبوط کی آستین پر ایک خاص قسم کی مہر ڈال دی جاتی تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ اس کا ٹیکس ادا ہو چکا ہے۔ بدقسمتی یہ تھی کہ یہ مہر پانی لگنے سے

چھوٹ جاتی تھی۔ اس لئے کسان اپنے زعبوط کو دھوتے ہوئے اس کے مہر کے حصہ کو چھوڑ دیتا۔ کیوں کہ معلوم تھا کہ ٹیکس وصول کرنے والے جو ہر وقت بازاروں میں گھومتے رہتے تھے مہر کا نشان مٹتے ہی اس کے اوپر دوسرا ریال لگادیں گے۔ ٹیکسوں کی اس کثرت کے باوجود یہ حال تھا کہ دوسال تک سرکاری ملازموں اور فوجیوں کی تنخواہیں نہ دی جاسکیں۔

مگر قرض کی ادائیگی کے لئے یہ سارے ٹیکس بھی ناکافی ثابت ہوئے۔ کیوں کہ اسماعیل پاشا کا اسراف بھی اسی کے ساتھ برابر جاری تھا۔ آخر وہ اندوہناک واقعہ ہوا جس نے مصر کی تاریخ بدل ڈالی۔

اسماعیل پاشا نے قرضوں کی ادائگی کے لئے نہر سوئز میں حکومت مصر کے حصہ کو ۱۸۷۶ میں انگلستان کے ہاتھ فروخت کردیا۔ جب اس سے بھی قرضوں کا بوجھ ختم نہ ہوا تو اس نے فرانس کے قرضوں کے معاوضہ میں فرانس کو انگلستان کے ساتھ سوئز میں شریک قرار دے دیا۔ اور سوئز کے اوپر جہاں پہلے انگلستان اور مصر کا کنٹرول تھا، اب فرانس اور انگلستان کا کنٹرول قائم ہوگیا۔ اور اسی کے ساتھ مصر میں ان کی سیاست کے داخلہ کا دروازہ بھی کھل گیا۔

جمال عبدالناصر کا ۱۹۵۶ میں سوئز کو نیشنلائز کرنا گویا اسماعیل پاشا کی اسی غلطی کی اصلاح تھا۔ مگر صدر ناصر نے یہ دوسری غلطی کی کہ اسراف کی اصلاح ناعاقبت اندیشانہ اقدام سے کرنی چاہی جو مصر کے حق میں پہلے سے بھی زیادہ مہنگی ثابت ہوئی۔

زندگی خواہ افراد کی ہو یا قوموں کی، نہایت نازک امتحان ہے۔ یہاں ہر ایک کے حوصلہ اور ہوش مندی کی جانچ ہورہی ہے۔ ہمیں ہر وقت چوکنا رہنا ہے۔ کیونکہ کوئی ایک غلطی بھی اتنی فیصلہ کن ہوسکتی ہے کہ ہماری ساری امیدوں پر پانی پھیر دے اور ہمارے لئے بالآخر حسرت کے سوا اور کچھ نہ چھوڑے۔

الفاظ مل گیے

اچاریہ رَج نیش اپنے آپ کو دولت مندوں کا گرو (Guru of the rich) کہتے ہیں۔ انھوں نے ساری دنیا میں اپنے لاکھوں معتقد پیدا کر لیے۔ مغرب کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں ان کی مقبولیت کا خاص راز یہ ہے کہ وہ آزاد جنسی تعلق (Free sex) کے لیے خوبصورت نظریاتی جواز فراہم کرتے ہیں۔ وہ آزاد جنسی تعلق کے نہ صرف مبلغ ہیں بلکہ خود بھی اس پر باقاعدہ عامل ہیں۔

اپنے ایک انٹرویو (السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا ۲۹ ستمبر ۱۹۸۵) میں رَج نیش نے فخر کے ساتھ کہا کہ میں سب سے زیادہ عورتوں سے محبت کرتا ہوں۔ اس معاملہ میں میں پاک باز نہیں ہوں۔ آپ میری داڑھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ اتنی جلد سفید ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے بہت سرگرم جنسی زندگی گزاری ہے۔ میں نے ۵۰ سال کے اندر ۲۰۰ سال کو نچوڑا ہے:

> You can see my beard. It has become grey so quickly. Because I have lived so intensely. That I have compressed in 50 years almost 200 years.

اچاریہ رَج نیش نے امریکہ میں بہت بڑا مرکز قائم کیا تھا۔ مگر نومبر ۱۹۸۵ میں وہ گرفتار کر لیے گیے اور پھر وہاں سے نکال دیئے۔ اس کے بعد وہ ہندستان آئے۔ پھر نیپال گیے۔ اس کے بعد وہ اچانک یونان چلے گیے۔ یونان کے آرتھوڈاکس چرچ نے ان کو عوام کے لیے خطرہ (A public menace) بتایا۔ اور ان کے شاگردوں کو جنسی بدمستیوں (Sex orgies) کا مجرم قرار دیا۔ چرچ نے اعلان کیا کہ اگر ان لوگوں نے ملک نہ چھوڑا تو ان کو سنگسار کیا جائے گا۔

چنانچہ ۵ مارچ ۱۹۸۶ کو یونان کی پولیس نے ان کو ملک بدر کر دیا۔ اس کے بعد رَج نیش اپنے امیر ساتھیوں کے ہمراہ ایک خصوصی جہاز پر سوار ہو کر اسپین پہونچ گیے:

> The Bhagwan said at Athens airport, that Greeks had learned nothing since Socrates was executed in 399 BC for corrupting Greek youth and preaching false gods.

بھگوان رَج نیش نے ایتھنز ائرپورٹ پر کہا کہ یونان کا فلسفی سقراط ۳۹۹ ق م میں اس جرم میں ہلاک کر دیا گیا تھا کہ وہ نوجوانوں کو بگاڑتا ہے اور جھوٹے مذہب کی تبلیغ کرتا ہے۔ اس کے بعد

سے اب تک یونانیوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ (ٹائمس آف انڈیا ۶- ، مارچ ۱۹۸۶)

رج نیش نے یونان سے نکالے جانے کے وقت سقراط کا حوالہ اس طرح دیا ہے گویا کہ ان کا معاملہ بھی وہی ہے جو قدیم یونانی فلسفی سقراط کا معاملہ تھا۔ حالاں کہ سراسر دھاندلی ہے ، دونوں کا معاملہ اتنا مختلف ہے کہ ایک کو دوسرے سے کوئی نسبت نہیں۔

سقراط (۳۹۹-۴۷۰ ق م) قدیم یونان کے تین بڑے فلسفیوں (سقراط ، افلاطون، ارسطو) میں سے ایک تھا۔ اس کو حکومت کے فیصلہ کے تحت زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ مگر یہ سراسر ظلم کا فیصلہ تھا، سقراط مسلّمہ طور پر ایک بے قصور آدمی تھا۔

سقراط ، تاریخی ریکارڈ کے مطابق ، نہایت پاکباز آدمی تھا۔ اس کے شاگرد افلاطون نے اس کی بابت لکھا ہے کہ وہ اپنے وقت کا سب سے زیادہ صالح اور بے غرض آدمی تھا، رج نیش کا جرم خود غلط ہونا ہے۔ جب کہ سقراط کا معاملہ یہ تھا کہ وہ خود نہایت صحیح آدمی تھا ، اس کو صرف اس لیے مجرم قرار دیا گیا کہ وہ مجرم لوگوں کو مجرم کہتا تھا۔

سقراط کے زمانہ میں یونان کا سماج بہت بگڑا ہوا تھا۔ سقراط اس کے خلاف تبلیغ کرتا تھا۔ وہ ظاہری نمائش کے اندر چھپے ہوئے فاسد اخلاق کی پردہ دری کرتا تھا۔ سقراط خدا پر گہرا عقیدہ رکھتا تھا۔ مگر وہ یونانیوں کے مشرکانہ اوہام پر سخت تنقید کرتا تھا، سقراط کی ان باتوں کی زد وہاں کے بڑے لوگوں پر پڑتی تھی۔ چنانچہ وہ لوگ سقراط پر بگڑ گیے اور انھوں نے اس پر جھوٹے الزام لگاکر اس کو مجبور کیا کہ وہ اپنے ہاتھ سے زہر کا پیالہ پیئے۔ برٹانیکا (۱۹۸۴) کے الفاظ میں ، اس کے خلاف فرد جرم دو چیزوں پر مشتمل تھی ـــــــ نوجوانوں کو بگاڑنا۔ اور جن دیوتاؤں کو شہر کے لوگ پوجتے ہیں ان کو نظر انداز کرنا :

There were two accounts in the accusation: corruption of the young, and neglect of the gods whom the city worships (16/1001-1002).

حقیقت یہ ہے کہ سقراط کے برعکس ، رج نیش مسلّمہ طور پر ایک غلط آدمی ہے ، اس کے باوجود اس کو اپنی صفائی کے لیے الفاظ مل گیے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کو اسی طرح اپنی صفائی کے لیے الفاظ ملتے رہیں گے ، خواہ باعتبار حقیقت وہ کیسا ہی مجرم کیوں نہ ہو۔ قیامت کے بھونچال سے پہلے کسی شخص سے اس کی یہ آزادی چھننے والی نہیں۔

مفت کا کریڈٹ

لاہور (پاکستان) کی ایک خاتون کینسر اور ذیابیطس کے مرض میں مبتلا تھی۔ اس کے بھائی نے بی بی سی ریڈیو پر سنا کہ ہندستانی وزیر اعظم مسٹر مرارجی ڈیسائی نے اس قسم کے مریضوں کا مجرب قدرتی علاج یہ بتایا ہے کہ وہ کثرت سے انگور کھائیں۔ مذکورہ پاکستانی کو یہ نسخہ پسند آگیا۔ تاہم چند باتیں اس کو وضاحت طلب معلوم ہوئیں: تازہ انگور نہ ملنے کی صورت میں کیا خشک انگور کھایا جاسکتا ہے، کیا انگور کے طریق علاج پر عمل کرتے ہوئے انسولین (دوا) بھی مریضہ کو دی جاسکتی ہے۔ مذکورہ پاکستانی نے مسٹر مرارجی ڈیسائی کو خط لکھا کہ وہ ان امور کے بارے میں اس کو ہدایات دیں۔ چند دن بعد ہندوستانی وزیر اعظم کی میز پر جو ڈاک رکھی گئی اس میں مذکورہ خط بھی شامل تھا۔ وزیر اعظم اس کو پڑھ کر فوراً حرکت میں آگئے۔ مگر خط کے مطابق پاکستانی خاتون کی حالت بہت نازک تھی۔ اس کو فی الفور "امداد" پہنچانا ضروری تھا۔ اگر خط کے ذریعہ جواب بھیجا جاتا ہے تو اس کو منزل مقصود تک پہنچنے میں کئی دن لگ جائیں گے۔ مذکورہ پاکستانی کے لیٹر ہیڈ نے اس مسئلہ کو حل کر دیا جس پر اس کا لاہور کا ٹیلی فون نمبر درج تھا۔ وزیر اعظم نے فیصلہ کیا کہ وہ خط کے بجائے ٹیلی فون سے اپنا جواب پہنچائیں گے۔

عام حالات میں ہندوستان سے پاکستان ٹیلی فون ملانے میں کئی روز لگ جاتے ہیں۔ مگر اس وقت صورت حال مختلف ہوتی ہے جب کہ وزیر اعظم ہندستان خود ٹیلی فون کر رہا ہو۔ اگلے ہی لمحہ لاہور میں مذکورہ شخص کے ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ ہندستان کے وزیر اعظم نے بسرعت اپنا قیمتی مشورہ پڑوسی ملک کے شہری تک پہنچا دیا تھا۔ تاہم یہ تیز رفتار امداد کام نہ آئی۔ پاکستانی خاتون اس سے پہلے دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔

پاکستانی مریضہ کے بھائی کو ہندستانی وزیر اعظم کی اس عنایت نے بہت متاثر کیا۔ اس نے وزیر اعظم کو شکریہ کا خط لکھا۔ خط میں درج تھا:

> I am much obliged and overwhelmed by your nobility. You are every inch a gentleman. The members of my family and I are all appreciation for you. I do not tire of telling my friends; here is the finest specimen of humanity and humanism
>
> The Times of India, May 22, 1979

"میں آپ کی شرافت سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں اور آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ آپ ایک ایک انچ ایک اعلیٰ انسان ہیں۔ میں اور میرے گھر کے سب لوگ آپ کے بے حد قدر داں ہیں۔ میں اپنے دوستوں کو یہ بتاتے ہوئے نہیں تھکتا: یہ انسان اور انسانیت کی ایک اعلیٰ ترین مثال ہے۔" (ٹائمس آف انڈیا ۲۲ مئی ۱۹۷۹)

ایک وزیر اعظم کے اپنے ملک میں انتہائی وحشیانہ طور پر بے گناہ مردوں اور عورتوں کو قتل کیا جاتا ہے۔ ان کی معاشیات کو منظم طور پر برباد کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کو دوسرے درجہ کا شہری بنا دیا جاتا ہے مگر وزیر اعظم کو ان امور میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ باہر کے ایک شخص کی مصیبت کو سن کر وہ بے تاب ہو جاتا ہے

اور "بجلی کی سرعت"، کے ساتھ اس کو اپنی امداد پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک کے اندر ہونے والے ظلم کو مٹانے کے لئے اٹھنا بہت زیادہ محنت اور قربانی مانگتا ہے۔ جب کہ باہر کے ایک شخص کی مدد کرنے کے لئے چند لفظ بول دینے کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔

اسی واقعہ میں آپ مسلم قائدین کی تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ آج ہمارے تمام قائدین کا یہ حال ہے کہ اگر ان کے قریب کا ایک آدمی اپنا ایک حقیقی مسئلہ لے کر ان کے پاس جائے تو اس کو حل کرنے سے انھیں کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ کیونکہ اس قسم کے ایک عملی مسئلہ کو حل کرنے میں طرح طرح کی قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسئلہ کو گہرائی کے ساتھ سمجھنا، اس کی تمام نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسلسل عملی جدوجہد کرنا، ان تمام لوگوں کی دشمنی مول لینا جنھوں نے مذکورہ شخص کو مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ حتیٰ کہ خود اپنے نفس پر لگام لگانا، کیونکہ اکثر اوقات مسئلہ پیدا کرنے میں خود یہ مسلم قائد بھی براہ راست یا بالواسطہ طور پر شریک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا قائد اس قسم کے مسئلہ پر کبھی دھیان نہیں دیتا۔ البتہ "دور" پیدا ہونے والے مسئلہ پر وہ فوراً حرکت میں آجاتا ہے۔ کیوں کہ یہاں لفظوں کے ذریعہ اس کو وہ کریڈٹ مل رہا ہے جو مذکورہ مثال میں عمل اور قربانی کے ذریعہ ملتا۔ اس کی یہ انسانی ہمدردی فوراً ایک شاندار بیان کی صورت میں اخبار کے صفحہ اول کی زینت بنتی ہے۔ اس کو موقع ملتا ہے کہ وہ بڑے بڑے لوگوں سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کرے۔ وہ ہوائی جہاز میں اڑ کر جائے واردات پر پہنچے۔ وہ ایک شاندار کانفرنس کر کے اس کے اسٹیج پر ہیرو کے روپ میں نمایاں ہو۔ وہ ریلیف فنڈ کھولے اور دوسروں کی جیب سے پیسے نکال کر اس کا کچھ حصہ اپنی شان قیادت قائم کرنے میں خرچ کرے اور کچھ حصہ کو تقسیم کر کے اعانت مظلومین کا کریڈٹ لے۔ مزید یہ کہ ان کارناموں میں لیڈر کو اپنے پاس سے کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا۔ ٹیلی فون اور ٹیرول اور ہوائی سفر سے لے کر پرتکلف دعوتوں اور عالی شان کانفرنسوں تک سارا بل قوم کی جیب سے ادا ہوتا ہے۔ شاید پوری انسانی تاریخ میں سستی قیادت کا اتنا کامیاب نسخہ کبھی کسی نے دریافت نہیں کیا تھا جو ہمارے قائدین کو خوش قسمتی سے موجودہ زمانہ میں ہاتھ آگیا ہے۔

یہ کیفیت جب مزید ترقی کرتی ہے تو حال یہ ہو جاتا ہے کہ اخلاقی دیوالیہ پن میں مبتلا ہونے والے لوگ "طاقتور اخلاقی قیادت"، کا نعرہ لگاتے ہیں جن کے دل کے دروازے حق کو قبول کرنے کے لئے بند ہو چکے ہوتے ہیں وہ عوام کے دلوں پر دستک دینے کے لئے دوروں اور تقریروں کا طوفان برپا کرتے ہیں، جو اپنے دائرہ اختیار میں بدترین ظلم کو جائز کئے ہوئے ہوتے ہیں وہ خدا کی زمین کو ظلم سے پاک کرنے کا جھنڈا لے کر کھڑے ہوتے ہیں۔ جن کی روحیں شرپسندی سے معمور ہوتی ہیں وہ خیر پسندوں کو منظم کر کے ملک کی کایا پلٹ دینے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ جن کے سینے اپنے مخالفین کے خلاف نفرت اور انتقام سے بھرے ہوتے ہیں وہ دوسروں کو یہ پیغام دینے کے لئے قافلہ در قافلہ نکلتے ہیں کہ اپنے مخالفین کے ساتھ انصاف اور انسانیت کا برتاؤ کرو۔

یہ جھوٹی قیادت صرف اس وقت تک ہے جب تک دنیا کی بساط الٹی نہیں جاتی۔ جب صور پھونکا جائے گا اور موجودہ دنیا کی بساط الٹ دی جائے گی تو تمام جھوٹی رونقیں اس طرح باطل ہو جائیں گی جیسے کہ ان کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

قیادت کا المیہ

دہلی میں قانون کے ایک طالب علم سے پوچھا گیا کہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد تم کیا کرو گے۔ اس نے جواب دیا۔

''چل گئی تو موتی لال، نہیں چلی تو جواہر لال''

ہندستان کی سیاست میں جو لوگ ''جواہر لال'' بنے وہ وہی تھے جن کی ''نہیں چلی تھی''، پریکٹس یا کاروبار میں ناکام ہونے والے لوگ سیاست کے میدان میں داخل ہوگئے۔ یہاں عمل کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ تقریریں اور بیانات کافی تھے۔ چنانچہ بہت جلد وہ کامیاب لیڈر بن گئے۔

یہ بات مسلم قیادت کے لئے اور بھی زیادہ صحیح ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلم قیادت سب سے زیادہ ناکام قیادت ثابت ہوئی ہے۔ اس کی غالباً سب سے بڑی وجہ وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔ حقیقی زندگی میں ناکام رہنے والے لوگ قیادت کے میدان میں داخل ہوگئے۔ حقیقی زندگی میں حقیقی لیاقت درکار تھی مگر قیادت کے میدان میں صرف تقریریں اور تحریریں کافی تھیں۔ اور یہ دوسرا سرمایہ ان لوگوں کے پاس کافی مقدار میں موجود تھا۔ عمل کے میدان میں ناکام رہنے والے لوگ الفاظ کے میدان میں آفتاب اور ماہتاب بن کر چمک اٹھے۔

ان لوگوں کے پاس ملّت کو دینے کے لئے کوئی حقیقی عمل نہ تھا۔ ان کے پاس صرف الفاظ تھے جن کے سہارے وہ اپنا مقام پیدا کرسکیں، چنانچہ انھوں نے یہی کیا۔ انھوں نے رومانی شاعری، جذباتی تقریریں مبالغہ آمیز بیانات اور وقتی نعروں اور ہنگاموں پر اپنی قیادت کی عمارت کھڑی کی۔ اس طرح انھیں ذاتی عظمت تو حاصل ہوگئی مگر ملّت کو عظمت کی منزل تک پہنچانے میں وہ سراسر ناکام رہے۔

ایک مثال لیجئے۔ ہندستان کی مسلم قیادت کا ایک اہم اشو انگریزی اخبار رہا ہے ''ہندستان کے انگریزی اخبارات مسلم خبروں کی صحیح رپورٹنگ نہیں کرتے''، یہ بات تقریباً ہمارے ہر لیڈر کی زبان ہے۔ اس عنوان پر ہمارے لیڈروں نے مسلمانوں کے جذبات اس قدر زیادہ بھڑکائے ہیں کہ حال میں ایک صاحب نے ماہنامہ الرسالہ کے بارے میں کہا کہ الرسالہ میں ٹائمس آف انڈیا کے اقتباسات ہوتے ہیں، جب کہ ٹائمس آف انڈیا مسلمانوں کا دشمن نمبر ایک ہے۔ ان کے نزدیک چوں کہ الرسالہ میں دشمن اخبار کے اقتباسات چھپتے ہیں اس لئے الرسالہ مسلمانوں کو پڑھنا نہیں چاہئے۔

اس قسم کی لایعنی باتوں کی ذمہ داری تمام تر ہماری مسلم قیادت پر ہے۔ وہ ہندستان کے موجودہ

انگریزی اخبارات کے خلاف جوشیلے بیانات دیتے ہیں۔ وہ "مسلمانوں کے انگریزی اخبار" کے نام پر بڑے بڑے چندے وصول کرتے ہیں مگر یہ سب کچھ محض لفظی پہلوانی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج تک مسلمانوں کا انگریزی اخبار وجود میں نہ آسکا۔ نہ یہی ممکن ہوا کہ موجودہ انگریزی اخبارات میں مسلمانوں کی کوئی قابل ذکر نمائندگی ہوسکے۔

دوسری طرف اس معاملہ میں ہمسایہ قوموں کا حال دیکھئے۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ہندستان کی آزادی سے پہلے ہندستان کی انگریزی صحافت انگریزوں یا انگریزوں کے تربیت یافتہ افراد کے ہاتھ میں تھی یہی لوگ اس وقت ملک کی انگریزی صحافت پر چھائے ہوئے تھے۔ آزادی کے بعد یہ سوال تھا کہ اب اس ملک میں انگریزی صحافت پر کس کا قبضہ ہو۔

اس وقت حالت یہ تھی کہ سارے ہندستان میں صرف بمبئی یونی ورسٹی میں جرنلزم کا ڈپلوما کورس تھا۔ ڈگری کے درجہ کی تعلیم کے لئے آدمی کو انگلینڈ جانا پڑتا تھا۔ اس وقت ایک سردار پروفیسر نے پنجاب یونی ورسٹی (چنڈی گڑھ) میں جرنلزم کا ڈگری کورس شروع کیا۔ تاہم ابتداءً اس شعبہ کو کوئی اہمیت حاصل نہ ہوسکی۔ بہت کم طلبہ اس میں داخلہ لینا پسند کرتے تھے۔ جب طلبہ کا پہلا دستہ نظری تعلیم مکمل کرچکا تو اس کی عملی تربیت کی ضرورت پیش آئی۔ مذکورہ پروفیسر ان کو لے کر دہلی آئے تاکہ یہاں کے بڑے بڑے اخبارات اور نیوز ایجنسیوں میں ان کو عملی تربیت کے لئے رکھ سکیں۔ مگر بمشکل کچھ لوگ ان کو اپنے یہاں لینے کے لئے تیار ہوئے۔ تاہم پروفیسر نے اپنی کوشش جاری رکھی یہاں تک کہ ان کے پڑھائے ہوئے طلبہ عملی تربیت پاکر اخباری اداروں میں داخل ہونے لگے۔ دھیرے دھیرے یہ تناسب بڑھتا رہا۔ بالآخر یہ حال ہوا کہ یہ طلبہ اکثر اخباری اداروں میں نظر آنے لگے۔ پروفیسر موصوف نے اپنی روداد بیان کرتے ہوئے ایک بار کہا —— پہلی بار جب میں دہلی آیا تھا تو یہاں کسی نے مجھ کو لفٹ نہ دی۔ مگر اب یہ حال ہے کہ میں انھیں اخباری دفتروں میں آتا ہوں تو آدھے آدمی میرے استقبال کے لئے کھڑے ہوجاتے ہیں کیونکہ وہ میرے شاگرد ہیں۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں کام کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ یہ ہے کسان کی طرح خاموشی کے ساتھ اپنے آپ کو نتیجہ خیز کام میں لگانا۔ مذکورہ واقعہ میں ایک شخص نے اپنے آپ کو ملک کی سو یونیورسٹیوں میں سے ایک یونیورسٹی کے ایک شعبہ میں وقف کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی انگریزی صحافت پر اس کی قوم کا غلبہ ہوگیا۔ اس کے برعکس جو لوگ احتجاج اور مطالبہ کررہے ہیں وہ اسی مدت میں کوئی بھی صحافتی مقام پیدا نہ کرسکے۔

ایک سفر

۱۵ مئی ۱۹۸۳ کو میں مرادآباد میں تھا۔ وہاں میری دو تقریریں ہوئیں۔ ایک کا موضوع تھا، دینی تقاضے۔ اور دوسری کا موضوع تھا، تعمیر ملت۔ تعمیر ملت کے موضوع پر جب تقریر ختم ہوئی تو ایک صاحب اٹھے جو نہایت سنجیدہ اور پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے دو سوالات کئے۔

پہلا یہ کہ آپ نے تعمیر ملت کے موضوع پر جو کچھ کہا ہے وہ سب اسباب کی باتیں ہیں مگر مرادآباد کا تجربہ اس سے مختلف ہے۔ مرادآباد کے فساد (۱۹۸۰) کے آخری مرحلہ میں مسلمان اس طرح گھر گئے کہ ان کے سامنے کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ انھوں نے سوچا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ دعا کی جائے۔ چنانچہ مسلمانوں نے مل کر دعا کی اور اس کے بعد اچانک صورت حال بدل گئی اور شہر میں امن قائم ہوگیا۔ دوسرا سوال یہ کہ اگر سارا معاملہ اسباب کا ہے تو اس میں مسلمان اور غیر مسلمان سب برابر ہیں، پھر مسلمان کا وہ امتیاز کیا ہے جو خیر امت کی حیثیت سے انھیں دیا گیا ہے۔

پہلے سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ میں نے جو بات کہی اس کا تعلق قانون عام (الرعد ۱۱) سے ہے اور آپ نے جو بات کہی اس کا تعلق قانون اضطرار (النمل ۶۲) سے۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی شخص یا کوئی گروہ جب ایسے حالات میں گھر جائے جہاں بظاہر اس کے لئے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو اور وہ دل سے خدا کو پکارے تو خدا اس کی مدد کرتا ہے (یونس ۲۳-۲۲) مگر جیسا کہ قرآن میں صراحت ہے، حالت اضطرار میں مدد کا تعلق ہر ایک سے ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلمان۔ کسی اضطراری واقعہ سے عمومی قانون اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے جو بات کہی وہ فساد سے پہلے کی ہے۔ اور آپ جو بات کہہ رہے ہیں وہ فساد کے بعد کی ہے۔ فساد کے بعد جب ہنگامی حالت پیدا ہو چکی ہو، اس وقت کیا کرنا ہے، یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ مگر فساد ہونے سے پہلے حالات کو معتدل رکھنے کے لئے کیا کیا جائے، یہ بالکل مختلف مسئلہ ہے۔

مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں برداشت کو کھو دیا ہے۔ وہ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ یہی عدم برداشت کا مزاج تمام فسادات کا اصل سبب ہے۔ جب تک کہ اس مزاج کو دور نہ کیا جائے، کسی بھی دوسری تدبیر سے فسادات کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمان پچھلے ۲۵ سال

سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو اقلیتی کردار دینے کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ یہ لڑائی حکومت اور حکمراں پارٹی سے تھی۔ بالآخر ۱۹۸۲ میں ان کو نئے ایکٹ کے تحت اقلیتی کردار دے دیا گیا۔ مگر مسلمانوں کی لڑائی بدستور جاری ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے اس لڑائی کا نشانہ نئی دہلی تھا، اب اس لڑائی کا نشانہ خود ان کا مسلمان وائس چانسلر ہے

اس سے پہلے ہندستان کے بیشتر مسلمانوں نے تقسیم ملک کی مانگ کی۔ اس مانگ کے لئے ان کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ مشترک ہندستان میں ملک کا اکثریتی فرقہ ان کے ساتھ امتیازی سلوک کرتا ہے۔ اس مطالبہ کے مطابق ان کو پاکستان دے دیا گیا۔ مگر ان کے شکایتی ذہن نے اپنی شکایت کے لئے نیا نشانہ تلاش کر لیا۔ اب مشرقی پاکستان کو یہ شکایت ہوگئی کہ مغربی پاکستان اس کے ساتھ امتیازی سلوک کرتا ہے۔ دوبارہ خود اپنے درمیان ایک بھیانک لڑائی ہوئی جو اس پر ختم ہوئی کہ مشرقی پاکستان نے مغربی پاکستان سے علیحدگی اختیار کر لی۔ تاہم ۱۹۸۳ کے واقعات بتاتے ہیں کہ اصل مسئلہ بدستور باقی ہے۔ اب سندھ کے مسلمانوں کو پنجاب کے مسلمانوں سے شکایت ہے کہ وہ ان کے ساتھ امتیازی سلوک کرتے ہیں۔ یہ لڑائی جاری ہے اور کچھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں جاکر ختم ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہر بات میں ان کا بے برداشت ہوجانا ہے۔ جب تک وہ اپنے اس مزاج کو ختم نہ کریں، ان کے لئے زمین تنگ رہے گی، خواہ وہ ایک ملک کا معاملہ ہو یا دوسرے ملک کا۔

دوسرے سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ مسلمان اپنے تقرر کے اعتبار سے بلاشبہ خیر امت ہیں اور اس حیثیت سے ان کے ساتھ خدا کا ایک امتیازی معاملہ ہے۔ خدا نے مسلمانوں کے لئے اپنی ایک خصوصی مدد مقدر کی ہے جو اس نے دوسروں کے لئے مقدر نہیں کی۔ مگر اس خصوصی مدد کا استحقاق خیر امت کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری انجام دینے پر ہے نہ کہ صرف نسلی مسلم نسل سے متعلق ہونے کی بنا پر۔

یہ ذمہ داری دعوت وتبلیغ کی ذمہ داری ہے۔ دعوت وتبلیغ سے مراد مسلمانوں کے درمیان اصلاحی کام نہیں ہے۔ بلکہ غیر مسلموں تک خدا کا سچا دین پہنچانا ہے۔ مسلمانوں کی اصلاح بھی ایک کرنے کا کام ہے اور اس کو ضرور کیا جانا چاہیے۔ مگر غیر مسلموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مدد کا وعدہ کبھی بھی مسلمانوں کے درمیان اصلاحی کام کرنے سے پورا نہیں ہوسکتا۔ یہ وعدہ صرف اس وقت پورا ہوگا جب کہ غیر مسلموں کے درمیان دعوت الی اللہ کا کام کیا جائے اور اس کو اس کے تمام آداب وشرائط کے ساتھ انجام دیتے ہوئے اتمام حجت کی حد تک پہنچایا جائے۔

فخر نہیں

۵ مئی ۱۹۸۹ کو جمعہ کا دن تھا۔ میں نے دہلی کی ایک بڑی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ امام صاحب نے خطبہ سے پہلے تقریباً ۲۰ منٹ تک ایک پرجوش تقریر کی۔ اس میں انھوں نے کہا :

ہم کو فخر ہونا چاہیے کہ ہم ایک اللہ کو ماننے والے ہیں

یہ جملہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی نفسیات کی نہایت صحیح ترجمانی کر رہا ہے۔ آج کل کے مسلمان، خاص طور پر ان کا رہنما طبقہ، تقریباً سب کا سب اسی نفسیات میں مبتلا ہے۔ وہ اسلام کو اپنے لیے فخر کی چیز سمجھتا ہے۔ یہ بلا شبہ گمراہی ہے۔ بلکہ یہی موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام خرابیوں کی اصل جڑ ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس نے موجودہ زمانہ میں ان کو خدا کی مدد سے محروم کر رکھا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے درمیان انتہائی بڑی بڑی تحریکیں اٹھتی ہیں۔ مگر وہ ان کی بربادی کے سوا کسی اور چیز میں اضافہ نہیں کرتیں۔

مذکورہ جملہ میں کیا غلطی ہے، اس کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ کچھ لوگ چل رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہاں ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ اطمینان کے ساتھ چلے جا رہے ہیں کہ ان میں سے ایک شخص کی نظر اچانک قریب کی ایک جھاڑی پر پڑتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ وہاں ایک زندہ شیر کھڑا ہوا ہے۔ اس وقت آدمی کی زبان سے کیا الفاظ نکلیں گے۔ کیا وہ کہے گا کہ :

ہم کو فخر ہونا چاہیے کہ ہم اس وقت ایک زندہ شیر کے سامنے ہیں

ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ شیر کو دیکھ کر آدمی کے اوپر ہیبت طاری ہوتی ہے۔ اور جو چیز ہیبت طاری کرے، اس کے بارہ میں اس کے اندر عجز کا احساس جاگے گا نہ کہ فخر کا احساس۔ یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر اللہ کا ہے جو شیر کا خالق ہے۔ اللہ ایک ایسی ہستی ہے جو سب کے اوپر ہے، جو سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ ایسی ایک ہستی کا یقین آدمی کے اندر عجز اور تواضع کا جذبہ پیدا کرے گا نہ کہ فخر اور ناز کا جذبہ۔

قرآن اللہ تعالیٰ کا تعارف ہے۔ اللہ کی ہستی کیا ہے، سارا قرآن اس کے بیان سے بھرا ہوا ہے۔

یہاں اس سلسلہ میں قرآن سے چند آیتیں نقل کی جاتی ہیں۔

اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ ہے۔ سب کو تھامے ہوئے ہے۔ اس کو نہ اونگھ لگتی اور نہ نیند آتی۔ زمین میں اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کے سامنے بغیر اس کی اجازت کے سفارش کرسکے۔ جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے سب کا اسے علم ہے۔ اس کے علم کے کسی گوشہ پر بھی کوئی شخص حاوی نہیں ہوسکتا مگر جو وہ چاہے۔ اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین پر چھایا ہوا ہے۔ ان کی نگہبانی اس کے لیے تھکا دینے والا کام نہیں۔ وہی سب سے اوپر ہے، وہی سب سے بڑا ہے (البقرہ ۲۵۵)

تم لوگ اللہ سے ڈرو اور آپس کے معاملات درست رکھو، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔ ایمان والے تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں (الانفال ۱-۲)

اور لوگوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔ اور زمین ساری اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور تمام آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔ وہ پاک اور برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں (الزمر ۶۷)

اس طرح کی کتنی ہی آیتیں قرآن میں شروع سے آخر تک موجود ہیں جو اللہ کا تعارف ایسے انداز میں کراتی ہیں کہ ان کو پڑھ کر آدمی لرز اٹھے، اللہ کے عظمت وجلال سے اس پر ہیبت طاری ہوجائے۔ قرآن میں یہ بات تو کثرت سے مذکور ہے کہ اللہ پر ایمان والے اللہ کی یاد سے کانپ اٹھتے ہیں، اس کے ذکر سے ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مگر یہ بات سارے قرآن میں کہیں نہیں کہ اللہ پر ایمان لانے والوں کو اللہ پر فخر ہونا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کے ماننے والوں نے ابھی خدا کو نہیں مانا۔ اگر وہ خدا کو ماننے والے ہوتے تو خدا کا تصور ان کے اندر عجز اور تواضع کی کیفیت پیدا کرتا۔ خدا کا نام لیتے ہوئے ان کی زبان کانپ اٹھتی، نہ کہ خدا کا نام لے کر وہ فخر و ناز کی باتیں کرنے لگیں۔

فخر کا نقصان

ایک مسلم رہنما نے اسلامی تعلیمات پر ایک کتاب لکھی ہے ۔ اس کا آغاز وہ ان الفاظ سے کرتے ہیں ـــــ " دنیا میں جتنے مذاہب ہیں ان میں سے ہر ایک کا نام یا تو کسی خاص شخص کے نام پر رکھا گیا ہے یا اس قوم کے نام پر جس میں وہ مذہب پیدا ہوا ۔ مثلاً عیسائیت کا نام اس لیے عیسائیت ہے کہ اس کی نسبت حضرت عیسیٰ کی طرف ہے ۔ بودھ مت کا نام اس لیے بودھ مت ہے کہ اس کے بانی مہاتما بدھ تھے ۔ زردشتی مذہب کا نام اپنے بانی زردشت کے نام پر ہے ۔ یہودی مذہب ایک خاص قبیلہ میں پیدا ہوا جس کا نام یہوداہ تھا ۔ ایسا ہی حال دوسرے مذاہب کے ناموں کا بھی ہے ۔ مگر اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی شخص یا قوم کی طرف منسوب نہیں ہے ۔ بلکہ اس کا نام ایک خاص صفت کو ظاہر کرتا ہے جو لفظ اسلام کے معنی میں پائی جاتی ہے ۔ یہ نام خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ کسی ایک شخص کی ایجاد نہیں ہے ۔ نہ کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص ہے ۔ اس کو شخص یا ملک یا قوم سے کوئی علاقہ نہیں ۔ صرف اسلام کی صفت لوگوں میں پیدا کرنا اس کا مقصد ہے "

مگر انھیں مسلم رہنما نے بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں اپنے ملک میں اسلامی نظام کے قیام کی تحریک اٹھائی تو اس کا نام انھوں نے " نظامِ مصطفیٰ " رکھا ۔ یعنی محمدی نظام نہ کہ اسلامی نظام ۔ جس مذہب کی شان انھوں نے یہ بیان کی تھی کہ اس کا نام کسی شخص کے نام پر نہیں ہے ، اسی مذہب کو شخص کے نام پر منسوب کر کے اپنی پوری تحریک چلادی ۔ یہ تضاد کیوں پیش آیا ۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے ۔ انھوں نے کتاب میں جو کچھ لکھا ، وہ اپنے فخر کا اظہار تھا ۔ جو چیز فخر کے اظہار کے طور پر ہو وہ آدمی کی نفسیات کا جزء نہیں بنتی اور اسی لیے وہ اس کے حقیقی عمل میں شامل نہیں ہوتی ۔

فخر ہمیشہ دوسروں کے سامنے کیا جاتا ہے ۔ کوئی آدمی کسی جزیرہ میں بالکل تنہا ہو تو وہاں فخریہ کلام اس کی زبان پر جاری نہیں ہوگا ۔ جب وہاں اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تو وہ فخر کرے گا تو کس کے لیے کرے گا ۔ وہ کس کے مقابلہ میں اپنے کو اونچا دکھائے گا ۔

بالفاظِ دیگر، فخریہ کلام دوسروں کے لیے نکلتا ہے نہ کہ خود اپنے لیے۔ اور جو کلام دوسروں کے لیے نکلے وہ اپنی اصلاح کا ذریعہ کیوں کر بن سکتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں ظہور میں آنے والی تقریروں اور تحریروں کو کسی ایک خانہ میں رکھنا ہو تو وہ یقینی طور پر فخر کا خانہ ہوگا۔ "ہمارا نبی سب سے افضل، ہمارا دین سب سے کامل، ہماری تاریخ سب سے شاندار" یہی وہ نفسیات ہے جو موجودہ زمانہ کے لکھنے اور بولنے والوں کے کلام میں رچی بسی ہوئی ہے۔ شعراء نظم کے اسلوب میں اور مصنفین نثر کے اسلوب میں اسی کے نغمے گا رہے ہیں۔ اس نفسیات نے موجودہ زمانہ میں ہماری تمام کوششوں کو "اندر رخی" کے بجائے "باہر رخی" بنادیا ہے۔

ہم اس لیے لکھتے اور بولتے ہیں کہ دوسروں کے مقابلہ میں اپنے فخر کا اظہار کریں، دوسروں کے درمیان اپنی بڑائی ثابت کرکے خوش ہوں۔ اس طرح ہمارا کلام اپنے آغاز ہی میں دوسروں کے لیے ہوجاتا ہے۔ وہ ہمارے اپنے لیے نہیں رہتا۔ جس کلام کا مقصد پُرفخر جذبات کی تسکین ہو اس کا نشانہ بالکل فطری طور پر دوسرے ہوجاتے ہیں۔ آدمی کی اپنی ذات اس کی زد میں نہیں آتی۔ آدمی اپنی برتری کے جذبات کی تسکین حاصل کرکے مطمئن ہوجاتا ہے کہ جو مطلوب تھا وہ اس کو مل گیا۔ اس کے بعد خود اپنی ذات کو اس کی میزان پر کھڑا کرنے کا خیال اسے کبھی نہیں آتا۔ کیونکہ وہ اس کا مقصود ہی نہ تھا۔

الٹی خوراک

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کے لئے سارے عالم اسلام میں کوششیں کی گئی ہیں۔ یہ کوششیں ماضی کی تمام احیائی کوششوں کی مجموعی مقدار سے بھی زیادہ ہیں۔ اس کے باوجود نتیجہ بالکل صفر ہے۔ شاندار کوششوں کے بے شان انجام کی یہ ایسی مثال ہے جس کی کوئی دوسری نظیر ساری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اس عظیم ناکامی کی وجہ اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو وہ ہوگی " الٹی خوراک" یعنی مسلمانوں کو دوبارہ متحرک کرنے کے لئے ان کے اندر جو مزاج بنانا تھا، اس کے برعکس دوسرا مزاج ان کے اندر بنایا گیا۔ چنانچہ مصلحین کی تمام کوششیں اور قربانیاں اصل مقصد کے اعتبار سے رائیگاں ہو کر رہ گئیں۔

موجودہ زمانہ کے مصلحین نے ملت کی اصلاح کے لئے جو طریقے اختیار کئے وہ ظاہری طور پر اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف تھے مگر ان سب کا خلاصہ صرف ایک تھا۔ انھوں نے ملت کے احساس فخر کو ابھارا۔

ہمارے مصلحین نے ماضی کی عظمت کو یاد دلا کر حال میں دوبارہ عظیم بننے کا پیغام دیا ــــ ہمارا دین سب سے زیادہ کامل ہے، ہمارا رسول سب سے زیادہ افضل ہے، ہماری تاریخ سب سے زیادہ شاندار ہے۔ ہماری شریعت سب سے زیادہ اعلیٰ ہے، ہمارے اکابر سب سے زیادہ باکمال ہیں۔ ہماری امت تمام امتوں میں خیر الامم ہے۔ یہی وہ فکری غذا ہے جو موجودہ زمانہ کے تمام مصلحین نے ایک انداز سے یا دوسرے انداز سے دی ہے۔ اس میں غالباً کسی مصلح کا کوئی استثنار نہیں۔

اس قسم کی باتوں کا نتیجہ موجودہ حالات میں صرف ایک ہی ہو سکتا تھا اور وہی ہوا۔ اور وہ ہے جھوٹا احساس فخر۔ ایک زوال یافتہ قوم کے لئے جھوٹے فخر کی غذا ہمیشہ سب سے زیادہ مرغوب غذا ہوتی ہے۔ چنانچہ قوم کی قوم ان رہنماؤں کے پیچھے دوڑ پڑی۔ مگر قوم کی موجودہ حالت میں یہ خوراک اس کے لئے الٹی خوراک ثابت ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف ہمارے شاعروں اور خطیبوں کے

الفاظ سے زمین و آسمان بھر رہے ہیں، دوسری طرف قوم جہاں تھی وہیں بدستور پڑی ہوئی ہے۔ وہ ایک قدم آگے نہ بڑھ سکی۔

حقیقت واقعہ تو یہ تھا کہ قوم زندگی کے دوڑ میں پچھڑ گئی تھی۔ وہ ہر میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے ہوگئی تھی۔ ایسی حالت میں اصل ضرورت یہ تھی کہ کھونے کا احساس دلا کر اس کے اندر پانے کا جذبہ بیدار کیا جائے۔ اس کے برعکس مذکورہ قسم کی باتوں نے یہ کیا کہ جن چیزوں کو ہم نے واقعہ میں کھو دیا تھا ان سے وراثتی رشتہ جوڑ کر ان کو اپنے خانہ میں لکھ لیا۔ جو چیز واقعاتی اعتبار سے اپنی نہ تھی اس کو وراثتی اعتبار سے اپنی بنا لیا۔ یہی وہ چیز ہے جس کو کسی نے "پدرم سلطان بود" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اور حقائق کی اس دنیا میں پدرم سلطان بود سے زیادہ بری نفسیات اور کوئی نہیں۔

انسان کا اصل سرمایہ عجز ہے نہ کہ بڑائی۔ فخر اور بڑائی کی نفسیات پیدا کرنا گویا انسان کو خدا دالی خوراک دینا ہے۔ خدائی غذا پر انسان کی تعمیر کرنا ہے۔ اس قسم کی الٹی خوراک صرف ایسے انسان پیدا کر سکتی تھی جو جھوٹے جنون عظمت (Paranoia) میں مبتلا ہوں۔ اور جھوٹا جنون عظمت ذلت اور بربادی کے سوا اور کہیں آدمی کو نہیں پہنچاتا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی اصل بیماری، ایک لفظ میں، جھوٹا فخر ہے۔ یہ عین وہی بیماری ہے جو بعد کے زمانہ میں یہود کے اندر پیدا ہوئی۔ اور اب وہ مسلمانوں میں پوری شدت کے ساتھ پیدا ہو چکی ہے۔

فخر کی نفسیات دینی لحاظ سے بھی غلط ہے اور دنیاوی لحاظ سے بھی۔ دینی لحاظ سے اس کی غلطی یہ ہے کہ خدائے ذوالجلال پر ایمان آدمی کے اندر تواضع کا مزاج پیدا کرتا ہے اور فخر کا مزاج عین اس کا ضد ہے۔

دنیا کے لحاظ سے اس کی غلطی یہ ہے کہ یہ دنیا اسباب کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کو اس کے عمل کے بقدر حصہ ملتا ہے۔ مگر فخر کی نفسیات عمل اور جدوجہد کی قاتل ہے۔ ایسا آدمی کبھی عمل کے تقاضے پورے نہیں کرتا اور جب قانون قدرت کے مطابق ناکام ہوتا ہے تو دوسروں کی شکایت کرتا ہے۔ وہ پانے سے بھی محروم رہتا ہے اور جاننے سے بھی۔

ردِّعمل کے تحت

مشہور اخبار زمیندار کے اڈیٹر مولانا ظفر علی خاں (۱۹۵۶ - ۱۸۷۳) سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور اپنے وطن کرم آباد (پنجاب) میں انتقال کیا۔ نوائے وقت (۲۷ نومبر ۱۹۸۹) میں ان کی بابت مفصل معلومات شائع ہوئی ہیں۔ ایک اقتباس یہ ہے :

" ظفر علی خاں کے والد مولانا سراج الدین کشمیر کے محکمۂ ڈاک میں ملازم تھے۔ اوائل عمر میں مولانا ظفر علی خاں کو کشمیر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان کی قومی غیرت کو تڑپا دیا۔ مولانا ظفر علی خاں کے سوانح نگار محمد اشرف خاں عطا لکھتے ہیں کہ میٹرک پاس کر لینے کے بعد مولانا ظفر علی خاں اپنے والد سے ملنے گلمرگ (کشمیر) گئے۔ وہاں ایک دن وہ ڈاک خانہ کے باہر بیٹھے تھے۔ اسی اثنا میں ایک انگریز فوجی افسر گھوڑے پر وہاں آگیا۔ اس نے بڑی تمکنت سے ظفر علی خاں کو بلایا اور کہا کہ اے لڑکے، جب تک میں اندر سے واپس نہیں آتا، تم میرے گھوڑے کی لگام پکڑے یہاں کھڑے رہو۔ نوجوان ظفر علی خاں کو اس فرنگی کی بات سخت ناگوار گزری۔ انھوں نے اس کو دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ اس کو سن کر انگریز سکتہ میں آگیا۔ اس نے اس گستاخی کی شکایت حکام بالا سے کردی۔ نتیجۃً ظفر علی خاں کو اپنے والد کے کہنے پر واپس پنجاب آنا پڑا۔ یہ بات عمر کے ساتھ ساتھ شعوری طور پر مولانا ظفر علی خاں کی شخصیت کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کر گئی"

اخبار مذکور نے لکھا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کا شمار فرنگی حکومت کے صف اول کے مخالفوں میں ہوتا تھا۔ انھوں نے دنیائے اسلام کی ہر اس تحریک میں حصہ لیا جو کسی بھی ملک میں کسی بھی قیادت کے تحت انگریزوں کے خلاف اٹھی۔ مثلاً تحریک خلافت، تحریک مسجد کانپور، تحریک آزادی ہند، وغیرہ۔ اخبار کے الفاظ میں : " ان کی نظروں کے سامنے سلطنت عثمانیہ کا سقوط ہوا۔ خود ان کا خمیر مغلیہ سلطنت کے عظیم کھنڈروں کی راکھ سے اٹھا جس میں امت مرحومہ کی چنگاری ابھی سلگ رہی تھی۔ انھوں نے نیل کے ساحل سے لیکر کاشغر کی حدوں تک پھیلی ہوئی مسلم سلطنت کو پارہ پارہ ہوتے دیکھا۔ ان کے سامنے ہی شیراز کا بلبل بغداد کی تباہی پر نالہ کش ہوا۔ اور داغ دہلی کی بربادی پر رویا اور ابن بدرون غرناطہ کے زوال پر نوحہ کناں ہوا"

ان حادثات (صحیح تر لفظ میں، مسلمانوں کی غفلت سے پیش آنے والے واقعات) نے مولانا ظفر علی خاں کو تڑپا دیا۔ وہ اپنی تڑپ کو نظم و نثر میں انڈیلتے رہے۔ یہاں تک کہ ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ کو اس دنیا سے چلے گئے۔

مولانا ظفر علی خاں یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی یہ منفی چیخ پکار مثبت نتیجہ پیدا کرے گی۔ انھوں نے پر جوش طور پر کہا تھا :

عنقریب اسلام کی فصل بہار آنے کو ہے

مگر یہ سراسر خوش خیالی تھی جو کبھی پوری نہیں ہوئی۔ یہ ایک مولانا ظفر علی خاں کی بات نہیں۔ یہی موجودہ زمانہ کے تمام رہنماؤں کا حال ہے۔ وہ اپنی منفی کاشت سے مثبت فصل کی امید کرتے رہے۔ وہ دوسروں کی تخریب میں اپنی تعمیر کا خواب دیکھتے رہے۔ یہ سلسلہ آج بھی اسی جوش کے ساتھ جاری ہے۔ مگر یہ یقینی ہے کہ اس قسم کی کوششوں سے نہ ماضی کے لیڈر کوئی نتیجہ برآمد کر سکتے تھے اور نہ حال کے لیڈر کوئی نتیجہ برآمد کر سکیں گے۔ اس قسم کی تمام سرگرمیاں ضیاع وقت کے خانہ میں جانے والی ہیں نہ کہ تعمیر قوم کے خانہ میں۔

عبرت ناک

مریم جمیلہ ایک امریکی نومسلمہ ہیں۔ وہ آج کل پاکستان میں رہتی ہیں۔ انھوں نے اسلام کے بارے میں انگریزی میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام یہ ہے :

Islam in Theory and Practice

اس کتاب کا اردو ترجمہ "اسلام ایک نظریہ، ایک تحریک" کے نام سے پاکستان سے شائع ہوا ہے اس کتاب کا ایک باب "اسلام اور صفائی پسندی" کے بارے میں ہے۔ اس باب کے آغاز میں وہ لکھتی ہیں :

" آج مسلمان ممالک میں بے حد گندگی اور غلاظت پائی جاتی ہے۔ باہر سے آنے والے لوگ مسلمانوں سے جو نفرت کرتے ہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہ گندگی اور غلاظت بھی ہے۔ یہ چیز مسلمانوں کی ساری شہرت اور ساکھ پر پانی پھیر دیتی ہے۔ کسی بھی یوروپی سیاح سے پوچھئے۔ دنیائے اسلام کے ملکوں اور عوام کے متعلق اس کا کیا خیال ہے ؛ آپ کو ہمیشہ ایک جواب ملے گا :"وہ کتنے غلیظ ہیں !" افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ ان کی یہ نکتہ چینی بسا اوقات اس قدر صحیح ہوتی ہے کہ خود یورپی نژاد نومسلم محض اسی وجہ سے ارتداد کے کنارے پہونچ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر میری ایک بہت اچھی دوست ایک جرمن نومسلم ـــــ بیگم فاطمہ ہیرن سرکا ہیں۔ وہ اور ان کے شوہر اُن دنوں ایک مسلمان ملک میں اسلامی زندگی بسر کرنے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ ۱۱ اگست ۱۹۶۴ کو بیگم فاطمہ نے مجھے ایک خط میں لکھا :

" میرے شوہر اس ملک میں پھیلی ہوئی گندگی سے بے حد متنفر ہو چکے ہیں۔ ان کے دفتر کی دیواریں خصوصاً سیڑھیاں پان کی پیک سے لال سیاہ ہو رہی ہیں۔ لوگ اپنی پتلون کے بٹن باتھ روم میں نہیں، اپنے میز کی طرف واپس آتے ہوئے لگاتے ہیں۔ جس ٹونٹی پر میرے شوہر نماز کے لیے وضو کرتے ہیں دوسرے لوگ وہاں اپنے مصنوعی دانت صاف کرنے بیٹھ جاتے ہیں اور پان کی سرخی سے ارد گرد کی ہر چیز کو لال کر دیتے ہیں۔ اسی دوران میں نوکر جا کر پینے کا پانی بھرتے رہتے ہیں۔ جمعہ کے روز نہا دھو کر اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر مسجد میں آنے

کے بجائے گندے اور بدبو دار کپڑوں میں جمع ہو جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پاکستان میں جس قسم کے حالات ہیں ان کے پیش نظر میرے شوہر کی رائے یہ ہے کہ ہمیں اپنے ایمان کی سلامتی مطلوب ہے تو جلد سے جلد مسلمانوں سے الگ ہو جانا چاہیے ۔ جرمنی میں وہ اپنی تبلیغی جدوجہد کے لیے کہیں زیادہ مفید ثابت ہو سکیں گے ۔"

انھوں نے پاکستان کے مسلمان معاشرہ میں بودوباش اختیار کرنے کی سرتوڑ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے اور اگلے سال دونوں میاں بیوی اپنی آبائی سرزمین کو لوٹ گیے ۔ کس قدر اندوہناک بات ہے ۔ آج کے مسلمان ممالک اپنی گندگی کی وجہ سے دنیا بھر میں بدنام ہیں ۔ حالانکہ اسلام سے زیادہ کوئی دوسرا مذہب جسم اور ماحول کے پاک صاف ہونے کی ضرورت واہمیت پر زور نہیں دیتا ۔" (صفحہ ۸۴-۸۳)

پاکستان اور دوسرے مسلم ملکوں میں تقریباً نصف صدی سے " اسلامی نظام قائم کرو " کا غلغلہ مچا ہوا ہے ۔ اس کے باوجود یہ حال ہے کہ آج ایک نومسلم اپنے اسلام کو بچانے کے لیے " اسلام پسندوں " کے ملک کو چھوڑ کر " کفر پسندوں " کے ملک میں پناہ لے رہا ہے ۔

اس صورت حال کی ذمہ داری تمام تر ان نام نہاد اسلامی قائدین پر ہے جنھوں نے دین میں " لازم " کو " متعدی " کرنے کا مجرمانہ فعل انجام دیا ۔ قرآن میں اَقِیمُوا الدِّینَ کا حکم اس معنی میں تھا کہ ہر مسلمان دین پر قائم ہو جائے ۔ مگر جھوٹی تعبیرات کے ذریعہ اس کا مفہوم یہ بنا دیا گیا کہ حکمرانوں کے اوپر دین کو قائم کرو ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر آدمی دوسروں کے خلاف دین کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہے ، خود اپنی زندگی میں اس کو دین پر کاربند ہونے کی کوئی فکر نہیں ۔

اسی طرح تمام اسلامی احکام کو فعلِ لازم سے فعلِ متعدی کر دیا گیا ہے ۔ اس معنوی تحریف کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ حکمرانوں کے اوپر دین کو نافذ کرنے کے لیے تو قتال اور مسلح اقدام تک جانے کی تقریریں کر رہے ہیں ، اور خود اپنی زندگی میں معمولی اخلاقی آداب کا اہتمام کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے ۔

ایک تضاد

مارچ ۱۹۸۴ میں میں ایک عرب ملک میں تھا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں ہندستان کی ایک جماعت کے ذمہ دار بھی وہاں موجود تھے۔ ہندستان سے وہ عربی زبان میں ایک رپورٹ تیار کرکے لے گئے تھے جس میں ان کی جماعت کے وہ کارنامے تحریر کیے گئے تھے جو اس نے تقسیم ہند کے بعد سے اب تک انجام دیے ہیں۔ اس رپورٹ کی ایک کاپی انھوں نے ازراہ عنایت مجھ کو بھی عطا فرمائی۔

اگلے دن ایک شیخ کے یہاں شام کا کھانا تھا۔ یہاں صرف میں اور مذکورہ بزرگ دو آدمی تھے جو ہندستان سے تعلق رکھتے تھے۔ بقیہ تمام کے تمام شیوخ عرب تھے۔ کھانے سے پہلے ایک بڑے کمرہ میں غیر رسمی نشست تھی۔ اس مجلس میں گفتگو کرتے ہوئے مذکورہ بزرگ نے فرمایا : ہندستان میں تو مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہاں ان کو مسجد میں بھی سجدہ کرنے کی اجازت نہیں۔

اس مجلس میں میری نشست ان کے قریب ہی تھی۔ میں نے ان کے کان میں کہا کہ حضرت، آپ یہ کس ملک کی بات کر رہے ہیں۔ کیا یہ اسی ہندستان کا قصہ ہے جس سے نکل کر میں یہاں آیا ہوں۔ انھوں نے کہا : کیا آپ کو صفدر جنگ کی مسجد کا حال معلوم نہیں۔ اس مسجد کے اندر نماز پر حکومت نے پابندی لگا رکھی ہے۔ میں نے کہا استغفر اللہ۔ پھر آپ کو یوں کہنا چاہیے کہ ہندستان کی تین لاکھ مسجدوں میں ہمیں اذان اور نماز کی کھلی اجازت ہے۔ البتہ صفدر جنگ کی مسجد جو آثار قدیمہ کے تحت ہے، وہاں آثار قدیمہ کے قانون کے مطابق تالا لگا دیا گیا ہے۔

یہ ایک علامتی مثال ہے جو بتاتی ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ کس طرح ایک عجیب و غریب تضاد میں مبتلا ہے۔ ہندستان کی مسلم جماعتوں اور یہاں کے مسلم اداروں کا حال یہ ہے کہ جب وہ "ہندستان میں ہمارا کام" کے موضوع پر لکھیں گے یا بولیں گے تو ان کے پاس عظیم کارناموں کی لمبی فہرست ہوگی۔ ان کی رپورٹ پڑھ کر ایسا محسوس ہوگا جیسے کہ اس ملک میں وہ ہمالیہ پہاڑ کے برابر بڑے بڑے کام انجام دے رہے ہیں۔

مگر انھیں جماعتوں اور اداروں کے ذمہ دار جب "ہندستان میں مسلمان" کے موضوع پر لکھیں گے یا بولیں گے تو ان کی کہانی بالکل مختلف ہو جائے گی۔ اب ان کے بیان کو پڑھ کر یا سن کر ایسا محسوس ہوگا جیسے اس ملک میں مسلمان صرف قتل و غارت گری کا شکار ہو رہے ہیں۔ ترقی تو درکنار، یہاں ان کو زندہ رہنے کے مواقع بھی حاصل نہیں۔

یہ کیسا عجیب تضاد ہے۔ لوگوں کو جب خود اپنا کارنامہ بیان کرنا ہو تو اسی ہندستان میں ان کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ بڑے بڑے کارنامے انجام دیں اور پُر فخر طور پر اس کی شاندار رپورٹ تیار کرکے اسے ساری دنیا میں پھیلائیں۔ مگر جب ان کو ہندستان میں مسلم قوم کی حالت بیان کرنا ہو تو اچانک یہی ملک مسلمانوں کے لیے محرومی اور بربادی کی آماج گاہ بن جاتا ہے۔ عام مسلمانوں کو تو اس ملک میں جینے تک کا موقع حاصل نہیں۔ مگر خود ان مسلم رہناؤں کو ناقابل قیاس حد تک یہ مواقع حاصل ہیں کہ وہ یہاں بڑے بڑے پُر فخر کارنامے انجام دے سکیں۔

کسی ملک میں بیک وقت یہ دونوں حالتیں پائی نہیں جاسکتیں۔ اگر ملک میں بسنے والے مسلمان تعصب اور ظلم کا شکار ہوں، ان کو ہر اعتبار سے برباد کیا جا رہا ہو تو یہ ناممکن ہے کہ اسی ملک کے رہنما خود اپنے کارناموں کے عالی شان گنبد تعمیر کرسکیں۔ اور اگر رہناؤں کے لیے یہ ممکن ہو کہ وہ شاندار طور پر بڑے بڑے کارنامے انجام دیں تو ایسی حالت میں اسی ملک کے اندر ان کی قوم برباد اور خستہ حال نہیں ہوسکتی۔

مسائل انسانی سماج کا خاصہ ہیں۔ اس لیے وہ ہمیشہ اور ہر سماج میں موجود رہیں گے۔ اس فطری حقیقت کو نظر انداز کرکے دیکھا جائے تو ہندستان میں مسلمانوں کے لیے وہ سب کچھ موجود ہے جو انفرادی یا ملّی سطح پر انھیں درکار ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ حکمت اور دانش مندی کے ساتھ انھیں استعمال کیا جائے۔

توہینِ رسولؐ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذوالقعدہ ۶ھ میں مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے تاکہ وہاں پہونچ کر عمرہ کریں۔ آپ کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہ بھی تھے۔ آپ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہونچے تو معلوم ہوا کہ مکہ کے لوگ، جو اس وقت مشرک تھے، انھوں نے طے کیا ہے کہ آپ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں۔ آپ حدیبیہ میں ٹھہر گیے۔

اس کے بعد اہل مکہ سے بات چیت شروع ہوئی۔ اس دوران اہل مکہ طرح طرح کی اشتعال انگیزی کرتے رہے۔ مگر آپ قطعاً اس سے مشتعل نہیں ہوئے اور صبر و برداشت کے ساتھ ان سے بات چیت جاری رکھی۔ آخر کار دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ یہ معاہدہ بھی تقریباً یک طرفہ تھا۔ اس میں بظاہر وہ تمام باتیں مان لی گئی تھیں جن کا مطالبہ اس وقت اہل مکہ کر رہے تھے۔ اس معاہدہ کے تحت آپ کو پابند کیا گیا تھا کہ : آپ مکہ میں داخل نہ ہوں اور اس سال عمرہ کیے بغیر واپس چلے جائیں۔ مکہ کا کوئی آدمی مسلمان ہو کر مدینہ جائے تو اس کو دوبارہ مکہ واپس کر دیں۔ معاہدہ میں " محمد رسول اللہ " کا لفظ مٹائیں اور اس کے بجائے محمد بن عبد اللہ کا لفظ لکھیں، وغیرہ۔

اب ایک صورت یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سوچتے کہ اہل مکہ کی ان باتوں کو ہرگز نہیں ماننا ہے۔ کیوں کہ اس وقت اگر ان کی بات مان لی گئی تو آیندہ وہ اور زیادہ جری ہو جائیں گے۔ آج عمرہ کے لیے روک رہے ہیں، کل حج کے لیے روکیں گے۔ آج مکہ میں داخل ہونے پر پابندی لگا رہے ہیں، کل مدینہ میں داخلہ پر پابندی لگائیں گے۔ آج نئے مسلمانوں کو واپس کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں، کل پرانے مسلمانوں کو واپس کرنے کے لیے کہیں گے۔ آج رسول اللہ کا لفظ مٹانے کے لیے کہہ رہے ہیں، کل خدا کا لفظ مٹانے کا مطالبہ شروع کر دیں گے۔ وغیرہ، وغیرہ۔

مگر اہل مکہ کی ہٹ دھرمی کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح نہیں سوچا۔ آپ نے اس قسم کے تمام اندیشوں کو شیطانی وسوسہ قرار دیتے ہوئے انھیں بالکل نظر انداز کر دیا۔ اور اہل مکہ کی تمام شرطوں کو مان کر مدینہ واپس چلے آئے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ آپ کی یہ " واپسی " عظیم " اقدام " کے ہم معنی بن گئی۔ اس کے بعد اللہ کی مدد آئی اور صرف ۲ سال کے اندر مکہ بھی آپ کے قبضہ میں آگیا

اور مکہ والے بھی ۔

موجودہ زمانہ میں بھی مسلمانوں کے سامنے اس قسم کے معاملات پیش آرہے ہیں۔ غیر مسلم طبقہ کی طرف سے بعض اوقات ایسے مطالبے کیے جاتے ہیں جو مذکورہ بالامطالبات کے مشابہ ہیں۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ اپنی سنت کی زبان میں مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ میں تمہارے لیے خدائی نمونہ ہوں۔ تم وہی کرو جو میں نے کیا۔ مگر مسلمان ہر بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کہنے کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ وہ جھوٹے لیڈروں کے کہنے پر چل رہے ہیں نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے پر ۔

جب بھی مذکورہ نوعیت کا کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو نام نہاد لیڈر مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ دیکھو، ذرا بھی نرم نہ پڑنا ۔ اگر تم نرم پڑے تو اغیار اور زیادہ کڑے ہو جائیں گے ۔ دیکھو ، ذرا بھی ان لوگوں کے ساتھ رعایت نہ کرنا ۔ اگر تم نے رعایت کا معاملہ کیا تو وہ اور زیادہ دلیر ہو جائیں گے اور تمہارے ساتھ مزید سختی کا معاملہ کریں گے ۔ ایسے مواقع پر مسلمان اپنے رسول کی سنت کو چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے لیڈروں کے کہے کی طرف دوڑ پڑتے ہیں ۔

یہ بلاشبہ سب سے بڑی توہین رسول ہے ۔ جب ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے پکار رہے ہوں ، اور دوسری طرف جھوٹے لیڈر اپنی جھوٹی آوازیں لگا رہے ہوں ، ایسی حالت میں خدا کے رسول کی شان میں اس سے بڑی گستاخی اور کیا ہو سکتی ہے کہ مسلمان خدا کے رسول کی پکار کو نظر انداز کر دیں اور لیڈروں کی پکار کی طرف دوڑ پڑیں ۔

یہ توہین رسول کا سب سے زیادہ بڑا واقعہ ہے جو آج خدا کی زمین پر پیش آرہا ہے۔ اور اس توہین رسول کا ارتکاب کرنے والے وہ لوگ ہیں جو دوسروں کو توہین رسول سے روکنے کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں ۔

مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ موجودہ حالت میں ان کا یہ فعل غفلت پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ اور جو لوگ غفلت پر سرکشی کا اضافہ کریں وہ اللہ کے نزدیک صرف اپنے جرم کو بڑھاتے ہیں، وہ کسی درجہ میں بھی اس کو کم نہیں کرتے ۔

عبرت ناک

ہندستان کی آزادی کے ذیل میں ہندستانی علمار کی تقریریں سنیے یا ان کی تحریریں پڑھیے تو اس میں ہمیشہ علمار کی زبردست قربانیوں کا تذکرہ ہوگا۔ اور پُرجوش طور پر یہ کہا جائے گا کہ ہندستان کو آزادی ہم نے دلائی۔ علمار اور مسلم عوام لاکھوں کی تعداد میں قربان نہ ہو گیے ہوتے تو انگریز ہندستان کے مطالبۂ آزادی کو تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔

یہ بات اگرچہ کلی طور پر نہیں تاہم جزئی طور پر یقیناً صحیح ہے۔ مگر حیرت ناک بات یہ ہے کہ علمار کے دعوٰں کے باہر اس کا اعتراف کہیں موجود نہیں۔ ہندستان میں قومی سطح پر آزادی کی جو تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں علمارِ ہند کا یہ "شاندار باب" بالکل حذف ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہندستان سے باہر عالمی سطح پر ہندستان کی آزادی کی تاریخ کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس میں بھی اس کا تذکرہ موجود نہیں۔

اس کی ایک مثال انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کا وہ مضمون ہے جو سبھاش چندر بوس (۱۸۹۷–۱۹۴۵) کے عنوان کے تحت درج کیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ دوسری جنگ عظیم میں جب جاپانیوں نے سنگاپور پر قبضہ کر لیا تو سبھاش چندر بوس جاپان پہونچے۔ وہاں انھوں نے اکتوبر ۱۹۴۳ میں "آزاد ہند حکومت" کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کے تحت ایک آزاد ہند فوج (Indian National Army) بنائی۔ اس فوج کے افراد زیادہ تر وہ ہندستانی فوجی تھے جو انگریزی فوج میں شامل تھے اور جنھوں نے جاپان کی فتح کے بعد ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

سبھاش چندر بوس اس فوج کو لے کر رنگون پہونچے تاکہ وہاں سے ہندستان کی طرف مارچ کر سکیں۔ یہاں ان کا مقابلہ انگریزی فوج سے ہوا جس میں انھیں شکست ہوئی۔ اس کے بعد ان کا دل ٹوٹ گیا۔ ایک حادثہ کا شکار ہو کر وہ کچھ دن جاپان کے اسپتال میں رہے اور وہیں ۱۹ اگست ۱۹۴۵ کو انتقال کر گیے۔

سبھاش چندر بوس کے تذکرے کے تحت انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں لکھا گیا ہے کہ سبھاش چندر بوس نے اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ برطانی فوج کے ہندستانی سپاہیوں میں بھی حب وطن کا جوش پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اپنے اس عمل سے انھوں نے وہ اثرات ڈالے جو بالآخر ہندستان

کی آزادی تک پہونچے :

By his actions, Bose proved that Indians in the British Indian army could also be inspired by patriotic fervour, and by his work he influenced the conference that led to Indian independence (3/53).

اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد میں نے سوچا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ جس واقعہ کو ہندستانی علماء اپنے خانہ میں درج کیے ہوئے ہیں وہ عالمی ریکارڈ میں "سبھاش چندر بوس" کے خانہ میں لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سوال کا جواب مجھے اس وقت ملا جب کہ میں نے انسائیکلوپیڈیا میں سبھاش چندر بوس کے مذکورہ مضمون کے نیچے اس کی کتابیات (Bibliography) دیکھی۔ اس کتابیات میں انگریزی کتابوں کی ایک لمبی فہرست ہے جو سبھاش چندر بوس کی زندگی اور ان کی جدوجہد کے بارے میں لکھی گئی ہیں اور جن سے معلومات اخذ کرتے ہوئے یہ مضمون تیار کیا گیا ہے۔ ہمارے علماء دنیا کو اس قسم کی "کتابیات" نہ دے سکے۔ اس لیے دنیا نے نہ ان کو جانا اور نہ ان کا تذکرہ کیا۔

موجودہ زمانہ میں جو مسلم علماء قیادت کے لیے اٹھے ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ انگریزی زبان یا اور کسی مغربی زبان سے ناواقف تھے۔ مزید یہ کہ انھوں نے انگریزی تعلیم کا مسلسل اس طرح استخفاف کیا کہ قوم کے دوسرے لوگ بھی بہت کم انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہو سکے۔ اور جو شخص انگریزی تعلیم کی طرف گیا وہ بھی یہ سمجھ کر گیا کہ وہ علماء سے اور ان کے مذہب سے باغی ہو کر انگریزی تعلیم کی طرف جا رہا ہے۔ اس انحراف کے بعد وہ علماء کے کام نہیں آسکتا تھا اور نہ وہ ان کے کام آیا۔

انسائیکلوپیڈیا یا دوسری مغربی کتابوں کے مذکورہ بیانات کو عام مسلمان اور خود ہمارے علماء "مستشرقین کے تعصب" کے خانہ میں ڈالتے ہیں۔ مگر میں اس کو خود علماء اور مسلمانوں کی اپنی کمی کے خانہ میں ڈالتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی کمی کو دور کر کے ہی اس تاریخی صورت حال کو بدل سکتے ہیں، تعصب اور سازش کا الزام لگانے سے نہ اب تک کوئی فائدہ ہمیں ملا ہے اور نہ آئندہ اس سے کوئی فائدہ ہمیں مل سکتا ہے۔

مسلم صحافت

دور اوّل کے مسلمان اس احساس کے تحت ابھرے تھے کہ انھوں نے پایا ہے۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمان اس احساس پر کھڑے ہوئے ہیں کہ انھوں نے کھو دیا ہے۔ یہی فرق ان تمام علمی اور اخلاقی فرقوں کا اصل سبب ہے جو موجودہ زمانہ کے مسلمان اور دور اول کے مسلمانوں کے درمیان دکھائی دیتے ہیں۔

دور اول میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا، ان کے لئے اسلام سب سے بڑی نعمت تھا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے پاس جو چیز ہے وہ صرف یہ احساس ہے کہ اسلام کی تاریخ نے ان کو جو سیاسی اور قومی حیثیت دی تھی اس کو دوسری قوموں نے ان سے چھین لیا۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان ساری دنیا میں احساس مظلومی (Persecution Complex) میں مبتلا ہیں۔ وہ دوسری قوموں کو ظالم اور اپنے کو مظلوم سمجھے ہوئے ہیں۔ کہیں امریکی، کہیں روسی، کہیں ہندو، کہیں یہودی اور کہیں کوئی اور قوم انھیں اپنے موجودہ مسائل کا ذمہ دار نظر آتی ہے۔ اس نفسیات کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانہ میں ان کی تمام سرگرمیاں محض بے فائدہ احتجاج بن کر رہ گئیں۔

اس کا اثر مسلمانوں کی صحافت پر بھی ہے۔ موجودہ زمانہ کی مسلم صحافت کا کوئی ایک مشترک نام دینا ہو تو وہ یقینی طور پر احتجاج ہوگا۔ آج مسلمانوں کا ہر اخبار اور رسالہ ایک قسم کا احتجاج نامہ بن کر رہ گیا ہے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی صحافت کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے قومی کیس کی وکالت کرے۔ جب کہ صحیح مسلم صحافت وہ ہے جو اسلام کی وکالت کرنے والی ہو۔ جو اصولی بنیادوں پر چلائی جائے نہ کہ قومی بنیادوں پر۔

قومی وکالت میں قومی مسائل توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کی وکالت یہ ہے کہ خدا کے دین کو خدا کے بندوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے پچھلے زمانوں میں بے شمار رسول بھیجے اور ان کے ساتھ کتابیں اتاریں۔ مگر یہ کتابیں اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہ رہ سکیں۔ اس کے بعد پیغمبر آخر الزمان صلے اللہ علیہ وسلم آئے۔ ان پر جو کتاب اتری اس کو خدا نے کامل طور پر محفوظ کر دیا۔ اب ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ اس صحیح آسمانی ہدایت (قرآن) کو تمام انسانوں اور تمام قوموں تک پہنچائیں۔ مسلم صحافت حقیقۃً وہی ہے جو اس طرز کی اسلامی دعوت کی نمائندہ ہو۔

مسلم صحافت اور اسلامی صحافت، دونوں میں بظاہر بہت معمولی فرق نظر آتا ہے۔ مگر

حقیقت کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ایک قومی صحافت ہے اور دوسری اصولی صحافت۔ ایک انسان کی نمائندہ ہے اور دوسری خدا کی نمائندہ۔ ایک کا مرکز توجہ دنیا کے مسائل ہوتے ہیں اور دوسری کا مرکز توجہ آخرت کے مسائل۔

مسلم قومی صحافت دوسری قوموں کو حریف کے روپ میں دیکھتی ہے۔ جب کہ اصولی اسلامی صحافت کے لئے دوسری قومیں مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مسلم قومی صحافت کے نزدیک دوسری قومیں ہم سے ہمارا اثاثہ چھینے ہوئے ہیں۔ جب کہ اسلامی صحافت کے نزدیک اصل واقعہ یہ ہے کہ ہمارے پاس دوسری قوموں کے لئے خدا کی ایک امانت ہے جس کو ہمیں ان قوموں تک پہنچانا ہے۔ پہلی صورت میں ہمارے اندر دوسری قوموں کے لئے نفرت کے جذبات ابھرتے ہیں، جب کہ دوسری صورت میں تمام قومیں ہمارے لئے محبت کا موضوع بن جاتی ہیں۔

یہ موجودہ زمانہ کی سب سے بڑی فکری غلطی ہے جس میں تمام دنیا کے مسلمان مبتلا ہیں۔ اس وقت مسلمانوں پر دوسری قوموں کی طرف سے جو کچھ بیت رہا ہے وہ حقیقۃً ہماری اسی کوتاہی کی خدائی سزا ہے جب تک مسلمان اپنی اس غلطی کی اصلاح نہ کریں گے وہ اسی طرح دنیا میں بے قیمت بنے رہیں گے۔

مسلم قیادت موجودہ زمانہ میں سب سے زیادہ ناکام قیادت ثابت ہوئی ہے۔ اس کی وجہ قیادت کی یہ غلطی ہے کہ اس نے مسلمانوں کے مستقبل کو تعمیر کے بجائے سیاست میں تلاش کیا۔ سیاست کا مطلب عملی طور پر یہ ہے کہ اپنے مسائل کے لئے دوسروں کے خلاف مہم چلائی جائے۔ جب کہ تعمیر یہ ہے کہ اپنے مسائل کے لئے خود اپنے اوپر بھروسہ کیا جائے۔

کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ قوم کو اس حیثیت سے تیار کیا جائے کہ لوگوں کا شعور بیدار ہو۔ ان کے اندر کردار کی طاقت پیدا ہو۔ وہ تعلیم میں اونچے ہوں۔ وہ باہم ایک ہو کر رہنا جانیں۔ اقتصادی شعبوں میں انھوں نے اپنی جگہ بنائی ہو۔ صحافت اور ابلاغ عامہ میں وہ دوسروں سے پیچھے نہ ہوں۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمانوں کو یہ فکر دیا جائے کہ وہ صاحب نظریہ افراد ہیں اور انھیں با مقصد انسان کی حیثیت سے لوگوں کے درمیان رہنا ہے۔

انھیں چیزوں کے اوپر کسی قوم کی زندگی کا دار و مدار ہے۔ مگر مسلم قیادت نے موجودہ زمانہ میں یہ کیا کہ اپنی تیسرے درجہ کی صحافت میں صرف دوسروں کے خلاف احتجاج اور مطالبہ کی مہم چلائی۔ اس نے خود اپنی تعمیر کے لئے وقت کے تقاضوں کے مطابق کوئی کام نہیں کیا۔

مسلم پریس

مسلم دنیا میں پریس کا دور انیسویں صدی میں مغربی فاتحین کے ذریعہ آیا۔ مسلمانوں کو ایک طرف غیر مسلم اقوام سے مغلوبیت کا تجربہ ہو رہا تھا۔ دوسری طرف عین اسی زمانہ میں وہ پریس کے دور میں بھی داخل ہو رہے تھے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم پریس اپنے آغاز ہی میں احتجاجی پریس بن کر رہ گیا۔ پریس کا کام صرف یہ رہ گیا کہ وہ اس ردعمل کی ترجمانی کرتا رہے جو مسلمانوں کے اندر سیاسی اور تہذیبی شکست کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔

بیسویں صدی کے آخر میں پہونچ کر بھی مسلم پریس کا یہ احتجاجی مزاج پوری شدت کے ساتھ باقی ہے۔ آج مسلم دنیا میں جتنے بھی اخبار یا رسالے نکلتے ہیں ان سب کا ایک مشترک نام رکھنا ہو تو یقیناً وہ احتجاج (Protest) ہوگا۔

مزید یہ کہ یہ احتجاج بھی عملاً صرف جھوٹے الفاظ کی بے اثر نمائش بن کر رہ گیا ہے۔ احتجاج کی قیمت اس وقت ہے جب کہ وہ واقعات کے درست جائزہ پر مبنی ہو۔ مگر مسلم صحافت کا حال سراسر اس کے خلاف ہے۔ آج تقریباً ہر مسلم پرچے میں دنیا کے مسلمانوں کے احوال پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ مگر یہ تبصرے ہمیشہ یک طرفہ، مبالغہ آمیز اور حقائق سے زیادہ لفاظی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس معاملہ میں غالباً کسی بھی مسلم اخبار یا رسالہ کا کوئی استثنار نہیں۔

یہ بات مسلم صحافت میں اتنی زیادہ عام ہے کہ کسی بھی ملکی یا غیر ملکی زبان کے پرچے سے اس کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ یہاں ہم اپنی بات کی وضاحت کے لیے صرف ایک مثال نقل کرتے ہیں۔

ترجمان القرآن (لاہور) مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کا قائم کردہ ماہنامہ ہے جو نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ سے نکل رہا ہے۔ اس کی اشاعت (ستمبر ۱۹۸۵) کے ۲۰ صفحات کے اداریہ میں دنیا بھر کے مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لیا گیا ہے اس اداریہ کا آغاز اس جملہ سے ہوتا ہے ــــــ "اس مرتبہ ہم احوال عالم پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ

یہ اندازہ ہو سکے کہ اسلام اور مسلمانوں کو کیا درپیش ہے " (صفحہ ۲)

اس مفصل اداریہ میں ہندستان کے مسلمانوں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اداریہ کا ایک جز حسب ذیل ہے:

(بھارت میں) پچھلے دنوں بڑا خوفناک واقعہ یہ ہوا کہ قرآن کو خلاف قانون قرار دلوانے کے لیے عدالت عالیہ میں استغاثہ لے جایا گیا۔ عدالت نے بھی کوئی باقاعدہ فیصلہ دینے کے بجائے معاملہ کو گول مول چھوڑ کر استغاثہ کو اپنے ریمارکس کے ساتھ محض روک دیا۔ گویا شرارت کا دروازہ اب بھی بند نہیں ہے۔ اس استغاثہ کے سلسلہ میں کم سے کم بنگلہ دیش میں بڑا بھاری مظاہرہ ہوا۔ البتہ پاکستان خاموش رہا۔ (صفحہ ۸)

"ترجمان القرآن" مسلم دنیا کا ایک مشہور اور ذمہ دار ماہنامہ ہے۔ مگر اس نے اپنے اداریہ میں ہندستانی مسلمانوں کے مذکورہ مسئلہ کے بارے میں جو الفاظ لکھے ہیں وہ سراسر خلافِ واقعہ ہیں۔ یہ ماہنامہ اپنے آپ کو جس قرآن کا ترجمان بتاتا ہے اس میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب تم کو کوئی خبر ملے تو اس کی مکمل تحقیق کرو (اذا جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا) اور یہ کہ درست بات کہو (قولوا قولاً سدیدا)۔ مگر حال یہ ہے کہ جس مقدمہ کو ہندستانی ہائی کورٹ نے قطعی خارج کر دیا اس کی بابت یہ الفاظ لکھے گیے ہیں کہ عدالت نے اس کو گول مول چھوڑ دیا۔

مذکورہ قرآنی حکم کا تقاضا تھا کہ یہ ماہنامہ اس معاملہ پر رائے زنی کرنے سے پہلے اس کی پوری تحقیق کرتا اور چوں کہ یہ معاملہ ایک عدالتی معاملہ تھا اس لیے اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس عدالتی فیصلہ کو حاصل کر کے پڑھے جس کی روشنی میں وہ اپنی رائے دے رہا ہے۔ مگر ماہنامہ کے مذکورہ الفاظ تقریباً یقینی طور پر بتاتے ہیں کہ وہ عدالت کے فیصلہ کو پڑھے بغیر لکھے گیے ہیں

راقم الحروف کی یہی رائے عام مسلم تبصرہ نگاروں کے بارے میں ہے۔ تقریباً ہر قابلِ ذکر مسلمان نے اس معاملہ میں رائے زنی کی ہے۔ مگر میری معلومات کے مطابق شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس نے مذکورہ قرآنی احکام پر باقاعدہ عمل کیا ہو۔

راقم الحروف کو جب اخبارات سے کلکتہ ہائی کورٹ کے مذکورہ فیصلہ کا علم ہوا تو اس

نے سب سے پہلے یہ کوشش کی کہ وہ اس عدالتی فیصلہ کو حاصل کرے۔ میں نے اپنے کلکتہ کے ایک رفیق جناب قاری محمد اسماعیل ظفر ایم اے کو خط لکھا کہ وہ عدالت سے اس کی مکمل نقل حاصل کرکے روانہ کریں۔ انھوں نے فوراً اس کی کوشش شروع کر دی۔ یہاں تک کہ انھوں نے فیصلہ کی مکمل نقل حاصل کرکے مجھے روانہ کی جو ۱۴ اگست ۱۹۸۵ کو مجھے دہلی میں مل گئی۔

جسٹس بمل چندر باسک (کلکتہ ہائی کورٹ) نے اپنا یہ فیصلہ ۷ مئی ۱۹۸۵ کو دیا ہے اور وہ ۱۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس فیصلہ کے ۴۱ پیراگراف ہیں۔ جسٹس باسک تفصیلی جائزہ کے بعد اپنے فیصلہ کے پیراگراف نمبر ۳۹ میں کہتے ہیں کہ مذکورہ اسباب کے تحت یہ بات واضح ہے کہ اس عدالت کے حدود اختیار سے باہر ہے کہ وہ قرآن پر پابندی لگانے کا حکم جاری کرے جس کی کہ درخواست میں اپیل کی گئی ہے۔

اس کے بعد پیرگراف نمبر ۴۰ میں واضح طور پر یہ الفاظ ہیں کہ مذکورہ اسباب کی بنا پر یہ درخواست ڈسمس کی جاتی ہے:

For the aforesaid reasons this application stands dismissed.

کیسی عجیب بات ہے کہ ایک مقدمہ جس کو ہندستان کی عدالت نے خارج کر دیا، اس کی بابت بالکل غلط طور پر یہ الفاظ لکھے گیے ہیں کہ عدالت نے باقاعدہ فیصلہ دیے بغیر اس کو گول مول حالت میں چھوڑ دیا اور اس طرح شرارت کا دروازہ کھلا رکھا۔ نیز اس سلسلہ میں بنگلہ دیش میں ہونے والے جھوٹے مظاہرہ کا حوالہ اس طرح دیا گیا ہے گویا کہ وہ کوئی قابل فخر اسلامی کارنامہ ہو۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اس قسم کے واقعات کی رپورٹنگ غیر مسلم پریس میں اس سے زیادہ صحیح ہوتی ہے جو نام نہاد مسلم پریس میں نظر آتی ہے۔ مسلم پریس کی تقریباً تمام رپورٹیں اسی طرح بے اصل ہوتی ہیں جس کا ایک نمونہ اوپر کی مثال میں نظر آتا ہے۔ یعنی واقعات کی صحیح تصویر دیے بغیر یک طرفہ طور پر فریق ثانی کو بُرا بتانا۔ اس قسم کا جھوٹا احتجاج نہ خدا کے نزدیک کوئی قیمت رکھتا ہے اور نہ خلق کے نزدیک۔ مسلمان اگر ایک ہزار سال تک اس قسم کا احتجاج کرتے رہیں تب بھی اس کا کوئی فائدہ انھیں ملنے والا نہیں۔

اسلام پسندوں کے مسائل

ذوالفقار علی بھٹو ۱۹۷۳ سے ۱۹۷۷ تک پاکستان کے وزیر اعظم تھے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اور پاکستان کے دوسرے اسلام پسند لوگوں نے ان کے خلاف تحریک چلائی اور اس کا نام "نظامِ مصطفےٰ" رکھا۔ اتھارٹی کے خلاف عوام کو ابھارنا سب سے زیادہ آسان کام ہے۔ چنانچہ ان حضرات کی پرجوش تقریروں سے پاکستانی عوام بھڑک اٹھے۔ یہاں تک کہ بھٹو کی حکومت ختم ہوگئی۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اور اسلامی محاذ کے دوسرے لوگوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں یہ تاثر دیا تھا کہ بھٹو کا جانا پاکستان میں اسلام کا آنا ہے۔ مگر بھٹو کے جانے کے بعد جو چیز پاکستان میں آئی وہ اسلامی محاذ کا آپس کا اختلاف تھا نہ کہ مثبت معنوں میں اسلام۔

یہی واقعہ موجودہ زمانہ میں اکثر ملکوں میں بار بار پیش آیا ہے، کہیں ایک صورت میں اور کہیں دوسری صورت میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "انقلاب" سے پہلے صرف ایک دشمن مشترک طور پر سب کا مرکز توجہ ہوتا ہے۔ مگر مشترک دشمن کے ہٹنے کے بعد جب تعمیر کا وقت آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تعمیر ملک کے بارے میں ہر ایک کے ذہن میں الگ الگ نقشہ ہے۔ بس یہاں سے اختلاف شروع ہوجاتا ہے۔ منفی بنیاد پر متحد ہونے والے مثبت بنیاد پر متحد ہونے میں ناکام رہتے ہیں۔

یہ اختلافات کس قسم کے مسائل میں پیدا ہوتے ہیں، اس کی ایک مثال لیجئے۔ پاکستان کا ایک اردو ہفت روزہ "دید شنید" ہے۔ اس نے پاکستان کی تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کے سوالات میں سے ایک سوال یہ تھا: "اچھا اگر آپ کی حکومت ملک میں قائم ہوجائے تو آپ کے پاس تو پورے اختیار ہوں گے۔ قومی زندگی میں خواتین کی شرکت کے بارے میں آپ کا کیا رویہ ہوگا۔ آپ کہاں تک اجازت دیں گے"

اس سوال کے جواب میں تنظیم اسلامی کے امیر نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک بات یہ تھی: "ہم پرائمری تعلیم پوری عورتوں کے حوالہ کردیں گے۔ ہم پابندی لگادیں گے کہ کوئی مرد پرائمری

ٹیچر نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ بچوں کی صحیح طور پر عورت ہی دیکھ بھال کر سکتی ہے۔ مادرانہ شفقت صرف عورت ہی دے سکتی ہے۔" ماہنامہ میثاق، لاہور، ستمبر ۱۹۸۶، صفحہ ۶۶)

اب اسی موضوع پر دوسرے اسلام پسند کے خیالات ملاحظہ فرمائیے۔ احمد محمد جمال سعودی عرب کے مشہور اسلامی مفکر ہیں۔ وہ فکری طور پر اخوان کے آدمی سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوہ (یکم ستمبر ۱۹۸۶) میں ایک پرجوش مضمون لکھا ہے جس کا عنوان یہ ہے: الفتنة نائمة ..... لعن الله من ایقظها۔ (فتنہ سویا ہوا ہے، اس شخص پر اللہ کی لعنت ہے جو اس کو جگائے) یہ مضمون عین اسی مسئلہ کے بارے میں ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔

سعودی عرب میں اس وقت تعلیم کا پورا نظام مردوں کے ہاتھ میں ہے، ابتدائی تعلیم بھی اور اعلیٰ تعلیم بھی۔ اب سعودی عرب کے بعض دانشور وہاں یہ تحریک چلا رہے ہیں کہ ابتدائی درجہ (المرحلۃ الابتدائیۃ) میں شروع کے تین سال کی تعلیم عورتوں کے حوالہ کر دی جائے۔ اور اس کی دلیل عین وہی دی جاتی ہے جس کا ذکر اوپر کے اقتباس میں ہوا۔ یعنی مادرانہ شفقت۔ وہ کہتے ہیں:

ان الطفل محتاج الی الاحساس بالامن والحب والحنان۔ وهو ما لا يتحقق الا على يد المعلمات بكل ما يحملن من غرائز الامومة الحانية (صفحہ ۲۰)

احمد محمد جمال صاحب نے اپنے مضمون میں اس نقطۂ نظر کے خلاف نہایت شدید ردعمل کا اظہار کیا ہے جس کا اندازہ ان کے عنوان سے ہوتا ہے۔ وہ بچوں کے لیے خاتون معلّم مقرر کرنے کو "فتنہ" قرار دیتے ہیں، ایک ایسا فتنہ جس کے بیدار کرنے پر آدمی خدا کی لعنت کا مستحق قرار پائے۔ انھوں نے اس نظریہ کو نہ صرف اسلامی اعتبار سے مکمل طور پر رد کیا ہے، بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے لیے خاتون معلّم کے مقابلہ میں مرد معلّم زیادہ بہتر ہے:

واعتقد الرجل اصلح من المرأة في التدريس خلال المرحلة الابتدائية

اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ مختلف اسلام پسند ایک دشمن کے خلاف متحد ہوتے ہیں۔ اور جب خارجی دشمن ہٹ جاتا ہے تو خود ایک دوسرے کے دشمن بن کر آپس میں لڑنے لگتے ہیں۔

یہ بگاڑ ہے یا اصلاح

قرآن میں ارشاد ہوا ہے : کہو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ وہ تم پر کوئی عذاب بھیج دے، تمھارے اوپر سے یا تمھارے قدموں کے نیچے سے، یا تم کو گروہ گروہ کرکے بھڑادے اور تمھارے ایک کو تمھارے دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھائے۔ دیکھو ہم کیونکر اپنی نشانیاں طرح طرح سے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں (الانعام ۶۵)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی قوم پر نافرمانی کے سبب سے خدا کا جو عذاب آتا ہے وہ تین صورتوں میں آتا ہے۔ ایک وہ جو اوپر سے آئے۔ جیسے پتھر برسنا یا طوفانی ہوا اور شدید بارش۔ دوسرے وہ جو پاؤں کے نیچے سے آئے، جیسے زلزلہ یا سیلاب وغیرہ۔ تیسرا وہ جس کو داخلی عذاب کہا جاسکتا ہے، یعنی باہمی ٹکراؤ اور آپس کی خوں ریزی۔ پہلا اور دوسرا عذاب ہمیشہ ان قوموں پر آتا ہے جن پر نبی کے ذریعہ اتمام حجت کیا گیا ہو، اس کے باوجود وہ منکر ہی رہے۔ ختم نبوت کے بعد اب چونکہ کوئی نبی آنے والا نہیں۔ اس لئے اب امت مسلمہ کے لئے ان دونوں عذابوں کا خطرہ نہیں۔ البتہ تیسری قسم کے عذاب سے وہ مامون نہیں ہے۔ جب بھی اس امت میں غفلت اور سرکشی بڑھے گی وہ اس تیسرے عذاب کی لپیٹ میں آجائے گی۔

ایک روایت الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ مختلف کتب حدیث میں آئی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے مذکورہ آیت کی تفسیر کے تحت احمد، نسائی، ابن حبان اور ترمذی کے حوالے سے جو روایت درج کی ہے اس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں :

عن خباب بن الارت انہ قال وافیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی لیلۃ صلاھا کلھا حتی کان مع الفجر فسلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلاتہ فقلت یارسول اللہ لقد صلیت اللیلۃ صلاۃ ما رأیتک صلیت مثلھا فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجل انھا صلاۃ رغب ورھب سألت ربی عزوجل فیھا ثلاث خصال فاعطانی اثنتین ومنعنی واحدۃ۔ سألت ربی عزوجل ان لا یھلکنا بما اھلک بہ الامم قبلنا فاعطانیھا۔ وسألت ربی عزوجل ان لا یظھر علینا عدوا من غیرنا فاعطانیھا۔ وسألت

حضرت خباب بن ارت کہتے ہیں کہ میں اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا جب کہ آپ نے ساری رات نماز پڑھی۔ یہاں تک کہ جب فجر کا وقت آگیا تو آپ نے سلام پھیر کر اپنی نماز ختم کی۔ میں نے کہا، اے خدا کے رسول، آج کی رات آپ نے ایسی نماز پڑھی جیسی نماز پڑھتے ہوئے میں نے اس سے پہلے آپ کو نہ دیکھا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں، وہ ڈر اور اشتیاق کی نماز تھی۔ میں نے اس میں اپنے رب سے تین باتیں مانگیں۔ اس نے دو باتیں مجھ کو دے دیں اور ایک سے منع فرمایا۔ میں نے اپنے رب سے یہ مانگا کہ وہ ہم کو اس طرح ہلاک نہ کرے جس طرح پچھلی

ربی عزوجل ان لا یلبسنا شیعا فمنعنیھا

انہیں ہلاک کی گئیں۔ یہ اس نے مجھ کو دے دیا۔ پھر میں نے اپنے رب سے مانگا کہ وہ ہمارے اوپر ہمارے باہر کے دشمن کو (کامل طور پر) مسلط نہ کرے۔ یہ بھی اس نے مجھ کو دے دیا۔ پھر میں نے اپنے رب سے مانگا کہ وہ ہم کو گروہوں میں نہ بانٹے۔ اس کی قبولیت سے اس نے انکار کر دیا۔

ایک اور روایت میں مزید یہ الفاظ ہیں کہ میں اپنی امت پر گمراہ قائدین کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتا۔ جب میری امت میں ایک بار تلوار چل جائے گی تو وہ قیامت تک اس سے اٹھائی نہ جائے گی (انی لا اخاف علی امتی الا الائمۃ المضلین فاذا وضع السیف فی امتی لم یرفع عنھم الی یوم القیامۃ)

امت مسلمہ کے بگاڑ پر ہونے کی کم از کم ایک یقینی پہچان یہ ہے کہ وہ گروہوں میں بٹ جائے اور اس کے ایک گروہ کی طاقت دوسرے گروہ کے خلاف استعمال ہونے لگے۔

موجودہ زمانہ میں بگاڑ کی یہ علامت مسلمانوں میں پوری طرح نمایاں ہو چکی ہے۔ آج ان میں ایسے مذہبی مسائل اور سیاسی نظریات فروغ پا رہے ہیں جو انھیں باہم حریف بنا کر ایک کو دوسرے سے ٹکرا دیں۔ ان میں ایسے لیڈر اٹھ رہے ہیں جو خود اپنے ملک کو فتح کر کے اس کے اوپر اپنی کامرانی کا جھنڈا لہرائیں۔ ان میں ایسے بہادر ابھر رہے ہیں جو خود اپنی قوم کے اداروں پر دھاوا بول کر ان پر قبضہ کر لیں اور ان کے اموال کو اپنے لئے غنیمت بنالیں۔ ان میں ایسے مفکرین اور مدبرین پیدا ہو رہے ہیں جو اپنی قوم کے کچھ لوگوں کو "برائی کی علامت" قرار دے کر ان کے خلاف محاذ آرائی کریں اور ان کے قتل وغارت کا منصوبہ بنائیں۔ ان میں ایسی جماعتیں وجود میں آ رہی ہیں جو خود اپنی قوم کی دوسری جماعتوں کی بیخ کنی کو نشانہ بنا کر کام کریں۔ غرض پوری قوم بے شمار گروہوں میں بٹ گئی ہے۔ ہر شخص جس کے پاس کچھ طاقت ہے وہ اپنے بھائی کو اس کا مزہ چکھانے کے لئے بے قرار نظر آتا ہے۔

آج پوری امت، فرد سے لے کر گروہ تک، باہمی تصادم میں مشغول ہے۔ ملت کے افراد کا حال یہ ہے کہ وہ دوسری قوم کے آدمی کو برداشت کر سکتے ہیں مگر اپنی قوم کے آدمی کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ دوسری اقوام کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے ہر ایک بزدل ہے، مگر اپنی قوم سے لڑنے کے لئے ہر ایک بہادر بنا ہوا ہے۔ امت مسلمہ کی طاقت جو اغیار کے استیصال کے لئے تھی وہ خود ساختہ الفاظ بول کر خود اپنی قوم کے لوگوں کے خلاف استعمال ہو رہی ہے۔ یہ بلاشبہ خدا کے غضب کی علامت ہے، خواہ ہم بطور خود اس کو خدا کی رحمت قرار دے کر خوش ہو رہے ہوں۔

ایک بستی ہے جہاں کسی کو دوسرے سے شکایت نہیں۔ ایک کے ذہن میں دوسرے کے خلاف تلخ یادیں نہیں۔ ایسی بستی میں ایک عام آدمی بھی اخلاق اور انسانیت کی باتیں کر سکتا ہے۔ مگر ایک ایسی بستی جہاں لوگوں کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہوں۔ جہاں دلوں میں یہ احساس چھپا ہوا ہو کہ ان کے پڑوسی نے ان پر زیادتیاں کی ہیں۔ ایسی بستی میں اخلاق اور انسانیت کا وعظ ایک غیر معمولی کام کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہاں کوئی ایسا شخص ہی وعظ کہنے کا حق رکھتا ہے جو اخلاق کے اس بلند مرتبہ پر ہو کہ شکایتوں کے باوجود اپنے پڑوسی کو دوست رکھے۔ دل پر چوٹ لگنے کے بعد بھی چوٹ لگانے والے سے بیزار نہ ہوتا ہو۔ اس پر زیادتیاں کی جائیں مگر وہ زیادتیوں کو بھول کر اخلاق اور انسانیت کا پیکر بنا رہے۔ جو شخص ان بلند اوصاف کا حامل نہ ہو اس کا مذکورہ بستی میں اخلاق اور انسانیت کا وعظ کہنا ایک بے فائدہ حرکت ہے۔ ان وعظوں میں جو وقت اور پیسہ خرچ کیا جائے وہ سب وقت اور پیسہ کو ضائع کرنے کے ہم معنی ہے۔ آدمی کسی دوسرے کو ایسے اخلاق کی تلقین کیسے کر سکتا ہے جس پر وہ خود قائم نہ ہو۔ اور اگر کوئی جوشِ قیادت میں ایسا کرے تو اس کی تلقین کی قیمت کیا ہوگی۔

اس مثال میں ہم کو اس سوال کا جواب مل رہا ہے کہ بے شمار کوششوں کے باوجود ہمارے ملک میں ظالمانہ صورت حال کی اصلاح کیوں نہیں ہوتی۔ نصف صدی سے بھی زیادہ مدت سے ہمارے یہاں انسانی برادری، امن کانفرنس، پیام انسانیت جیسے ناموں سے مختلف تحریکیں اٹھتی رہی ہیں۔ دورے کئے جاتے ہیں۔ تقریریں اور کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ مگر ابتدائی دھوم کے بعد جلد ہی یہ تحریکیں اس طرح ختم ہو جاتی ہیں جیسے ان کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ملک میں واعظ بننے کے لئے غیر معمولی اخلاقیات والے مصلح درکار ہیں۔ جب کہ ہمارے رہنما صرف معمولی اخلاقیات کا سرمایہ اپنے پاس رکھتے ہیں۔ قوم اپنے دائرہ اختیار میں " دوستی کے بدلے دوستی، دشمنی کے بدلے دشمنی "، کے جس اصول کو اپنائے ہوئے ہیں، ہمارے رہنما بھی اپنے دائرہ اختیار میں اسی اصول پر چل رہے ہیں۔ ایسی حالت میں دوسروں سے یہ کہنا کہ " دشمنی کے بدلے دوستی "، کا اصول اپناؤ، خود را فضیحت دیگراں را نصیحت کا مصداق ہے۔ اس قسم کا وعظ ایک قسم کا مسخرہ پن ہے نہ کہ حقیقۃً وعظ و نصیحت۔

انسانیت اور اخلاق کی دو سطحیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس کی طرف سے شکایت کا کوئی سبب پیدا نہ ہوا ہو اس کے ساتھ اخلاق اور انسانیت برتنا۔ یہ معمولی اخلاقیات ہیں۔ دوسرے یہ کہ شکایت اور تلخی پیدا ہونے کے بعد اخلاق اور انسانیت کا معاملہ کرنا۔ اس کو غیر معمولی اخلاقیات کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے رہنما بلاشبہ معمولی اخلاقیات کے حامل ہیں۔ مگر ہمارے جغرافیہ کا جو مسئلہ ہے وہ غیر معمولی اخلاقیات کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اس دوسرے معاملہ میں ہمارے رہنما صفر کی حد تک خالی ہیں " انسانیت " کے پرچار کا کام اگر وہ کسی ایسے جغرافیہ میں کر رہے ہوتے جہاں لوگوں کو ایک دوسرے سے شکایات پیدا نہ ہوئی ہوں تو ان پر کسی کو اعتراض کا حق نہ تھا۔ کیوں کہ یہ اخلاق کی

وہ سطح ہے جس پر وہ خود بھی قائم ہیں ۔ جو لوگ ان کے ساتھ اچھے بنے ہوئے ہوں وہ بھی ان کے ساتھ اچھے بنے رہتے ہیں ۔ مگر جب معاملہ ایسے لوگوں کا ہو جو ان کے ساتھ برا سلوک کریں جو ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچائیں ۔ جو ان کی انا کی راہ میں حائل ہوں تو ان کو ہمارے رہنما کبھی بخشنے کے لئے تیار نہیں ہوتے ۔ بالفاظ دیگر، اس معاملہ میں وہ خود بھی اخلاق کی اسی سطح پر ہیں جہاں ان کا مخاطب سماج ہے ۔ پھر جو لوگ خود معمولی اخلاقیات کی سطح پر ہوں وہ دوسروں کو غیر معمولی اخلاقیات کا وعظ کس طرح سنا سکتے ہیں ۔ جس طرح ایک جھوٹا آدمی سچائی کا مبلغ نہیں بن سکتا اسی طرح معمولی اخلاقیات کے لوگ غیر معمولی اخلاقیات کا درس نہیں دے سکتے اور اگر وہ اس قسم کی جرأت کریں تو یہ ایک بے فائدہ لفظی نمائش ہوگی نہ کہ کوئی حقیقی جد وجہد ۔

ہم کسی سادہ جزیرہ میں نہیں ہیں بلکہ ایک ایسے ملک میں ہیں جہاں بے شمار قسم کی تلخیاں پہلے سے لوگوں کے درمیان موجود ہیں ۔ ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے تاریخی اور غیر تاریخی شکایات ہیں ۔ مفادات کے اختلاف نے لوگوں کو بانٹ رکھا ہے ۔ اعتقادی اور نظریاتی اختلافات لوگوں کے ذہنوں میں بسے ہوئے ہیں اور ہر ایک اپنے کو برسر حق اور دوسرے کو برسر باطل سمجھتا ہے ۔ کچھ لوگ دولت و اقتدار کے مقامات پر قابض ہیں اور کچھ لوگ اس سے محروم پڑے ہوئے ہیں ۔ اختلاف مزاج اور اختلاف مفاد کے نتیجہ میں بار بار ایک دوسرے سے شکایت کے مواقع پیدا ہوتے ہیں ۔ حتیٰ کہ اس صورت حال نے ایک کو دوسرے کا حریف بنا رکھا ہے ۔ ایسے ماحول میں انسانیت اور اخلاق کی بات کرنا گویا لوگوں سے یہ کہنا ہے کہ ـــــــ اختلاف کے باوجود مل کر رہو ۔ شکایات کے اسباب ہوتے ہوئے ایک دوسرے کا احترام کرو ۔ اختیار و اقتدار کے باوجود اپنے کمزور بھائی کے آگے جھک جاؤ ۔ کوئی تمھارے متعلق بری رائے رکھتا ہو تب بھی تم اس کے بارہ میں اچھی رائے رکھو ۔ دوسرے کی طرف سے قابل نفرت رویہ ظاہر ہونے کے باوجود اپنی طرف سے محبت کا مظاہرہ کرو ۔ دوسرے کو اپنا حریف جانتے ہوئے بھی اس کو اپنے گلے سے لگا لو ۔ اور یہ سب کچھ کسی نمائشی جلسہ میں وقتی طور پر نہیں ، بلکہ انھیں بلند اخلاقیات کو اپنا مستقل رویہ بنا لو ۔

سجے ہوئے پنڈال میں الفاظ کا دریا بہانا نہایت آسان ہے ۔ مگر عملی زندگی میں ان بلند اخلاقیات کو نبھانا اتنا ہی زیادہ دشوار ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ یہی وہ بلند اخلاقیات ہیں جن پر کوئی صالح اور صحت مند سماج قائم ہوتا ہے ۔ مگر ایسے سماج کی تعمیر کے داعی وہی لوگ بن سکتے ہیں جو خود بھی ان غیر معمولی اخلاقیات کے حامل ہوں ۔ معمولی اخلاقیات کا سرمایہ رکھنے والے لوگ اس تعمیری مہم کو نہیں چلا سکتے ۔ جہاں تک ہمارے رہنماؤں کا تعلق ہے وہ اس معاملہ میں صفر کی حد تک خالی ہیں ۔ رہنماؤں کی طویل فہرست میں غالباً کوئی ایک بھی ایسا رہنما نہیں ہے جو اخلاق و انسانیت کی اس بلند سطح پر ہو ۔ جو اپنے مخالف سے پیار کرتا ہو ۔ جو اقتدار کا مالک ہونے کے باوجود اپنے کمزور حریف کے ساتھ مسکینی کا رویہ اختیار کرے ۔ جو تلخی اور اشتعال کے اسباب ہوتے ہوئے بھی جذبات کا شکار نہ ہو ـــــ جو اپنے ماتحت ادارہ میں بلند اخلاقیات کا وہی ماحول قائم کئے ہوئے ہو جس کی طرف وہ تمام اہل ملک کو بلا رہا ہے ۔ پھر آدمی خود عمل کی جس سطح پر نہ ہو ، وہ محض تقریروں اور تجویزوں کے ذریعہ دوسروں کو وہاں کس طرح لا سکتا ہے ۔

لفظی کمالات کی کوئی بھی مقدار عملی کوتاہی کا بدل نہیں بن سکتی۔ اگر آپ خود معمولی اخلاقیات کی سطح پر ہوں تو محض الفاظ کے زور سے دوسروں کو غیر معمولی اخلاقیات کی سطح پر نہیں لا سکتے۔ اس قسم کی تقریری مہم صرف ایک مسخرہ پن ہے اور مسخرہ پن نے کبھی اس زمین پر کوئی تاریخ نہیں بنائی ہے۔

جو چیز لوگوں کے درمیان فساد یا بگاڑ پیدا کرتی ہے وہ معمولی حالات نہیں ہیں بلکہ غیر معمولی حالات ہیں۔ عام حالات میں لوگ ہمیشہ ٹھیک ہی رہتے ہیں۔ مگر اجتماعی زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایسے مواقع آتے ہیں جب کسی کو کسی سے تکلیف پہنچ جائے۔ بس یہیں سے فساد شروع ہو جاتا ہے۔ ٹھیس پہنچتے ہی آدمی کے اندر کا شیطان جاگ اٹھتا ہے۔ وہ غصہ اور نفرت میں اندھا ہو جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ جو کچھ وہ اپنے حریف کے خلاف کر سکتا ہے کر گزرے۔

ہر آدمی کے اندر ایک سانپ ہے۔ عام حالات میں وہ سویا ہوا ہوتا ہے۔ مگر وہ اس وقت جاگ اٹھتا ہے جب اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی جائے۔ ایسے موقع پر جو چیز آدمی کو بچاتی ہے وہ صبر اور اللہ کا خوف ہے۔ مگر بدقسمتی سے اس معاملہ میں قوم افلاس کے جس مقام پر ہے ٹھیک وہی حال خود ہمارے واعظوں اور رہنماؤں کا بھی ہے۔ آپ کسی رہنما کے ساتھ نیاز مندی دکھائیے، اس کی قبائے عظمت کا تکمہ بنے رہیے تو وہ آپ سے خوش رہے گا۔ لیکن اگر آپ اس پر تنقید کریں، اس کی برتری کو مجروح کرنے کی کوشش کریں تو اچانک آپ دیکھیں گے کہ اس کے اندر کا سانپ جاگ اٹھا ہے۔ اس کے بعد کم از کم آپ کے مقابلہ میں وہ اپنا انسانی لبادہ اتار پھینکے گا۔ اگر آپ اس کے ادارہ میں ہیں تو آپ کو ذلیل کر کے وہاں سے نکال دیا جائے گا۔ آپ کے دوستوں اور ملاقاتیوں تک کی بے عزتی کی جائے گی۔ رہنما کے زیر اثر پریس کے لئے آپ ایک بالکل بے قیمت انسان بن جائیں گے۔ آپ کو نقصان پہنچانا عین جائز قرار پائے گا۔ ایک ایسے بے دین شخص کا استقبال وہ پسند کرے گا جس سے اس کی امیج میں اضافہ ہوتا ہو۔ مگر آپ سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات کرنا بھی اس کو گوارا نہ ہوگا۔ اس کی نظر میں آپ کے علم و تقویٰ کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔ اس کے برعکس بے دین لوگ اس کے لئے قیمت والے ہوں گے۔ کیوں کہ وہ اس کی شان میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں۔

قوم کا اگر یہ حال ہے کہ وہ عام حالات میں ٹھیک رہتی ہے اور جب کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آ جائے تو بپھر کر فساد کرنے لگتی ہے تو ہمارے رہنما بھی اپنے دائرہ میں اسی کردار کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ پھر وہ قوم کے اوپر انسانیت اور اخلاق کے واعظ کس طرح بن سکتے ہیں۔ "ایک سونے والا دوسرے سونے والے کو کیوں کر جگا سکتا ہے"۔ جو لوگ اپنے نیاز مندوں کے لئے شریف ہوں اور اپنے مخالفین کے لئے سانپ بنے ہوئے ہوں وہ دوسروں سے کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ تم اپنے مخالفین کے لئے سانپ نہ بنو بلکہ ان کے ساتھ انسانیت اور اخلاق کا وہی برتاؤ کرو جو تم اپنے دوستوں کے ساتھ کرتے ہو۔ خود معمولی اخلاق کی سطح پر ہونا اور دوسروں کو غیر معمولی اخلاق کا وعظ سنانا، ایک ایسے کام کا کریڈٹ لینا ہے جس کو آدمی نے کیا نہیں (آل عمران ۱۸۸) اس قسم کی روش خدا کے غضب کو بھڑکانے والی ہے نہ کہ وہ اللہ کی رحمتوں اور نصرتوں کو نازل کرنے کا سبب بنے۔

الفاظ ختم نہیں ہوتے

غالباً ۱۹۶۵ کا واقعہ ہے۔ میں لکھنؤ میں حضرت گنج کے پاس سڑک پر جا رہا تھا۔ میں فٹ پاتھ پر تھا۔ قریب ہی ایک آدمی سڑک کے کنارے بائیں طرف چل رہا تھا۔ اتنے میں ایک موڑ آیا۔ آدمی موڑ پر تھا کہ عین اسی وقت پیچھے سے ایک سائیکل آ گئی۔ ایک نوجوان تیزی سے سائیکل دوڑاتا ہوا موڑ پر پہنچا۔ سائیکل قابو میں نہ آ سکی اور راہ گیر سے ٹکرا گئی۔ راہ گیر سڑک پر گر گیا۔ سائیکل بھی رک گئی۔ راہ گیر اٹھا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ اس نے نوجوان کو غور سے دیکھا۔ اس کے بعد راہ گیر اور نوجوان کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ یہ تھی :

گھنٹی کیوں نہیں بجائی —— راہ گیر نے کہا۔

گھنٹی نہ ہو تو —— نوجوان نے جواب دیا۔

بریک کیوں نہیں لگایا۔

بریک نہ ہو تو ـ)

جب تمہارے پاس گھنٹی نہیں، بریک نہیں، تو تم سائیکل تیز کیوں دوڑاتے ہو

کیا تم سے پوچھ کر دوڑاؤں ـ

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی اگر چپ ہونا نہ چاہے تو کسی بھی دلیل سے اس کو چپ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہر دلیل کے جواب میں الفاظ کا ایک مجموعہ بولتا رہے گا۔ یہاں تک کہ آپ خود ہی چپ ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دلیل کو ماننے کے لئے سنجیدگی کی ضرورت ہے۔ غیر سنجیدہ آدمی کو کسی بھی دلیل سے قائل کرنا ممکن نہیں۔

موجودہ دنیا فتنہ کی دنیا ہے۔ اور دنیا کا سب سے بڑا فتنہ الفاظ ہیں۔ اس دنیا میں آدمی ہر بات کے جواب میں الفاظ پا لیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی جب تک سنجیدہ نہ ہو اس کو سمجھایا نہیں جا سکتا۔

مثلاً آپ ایک آدمی سے کہیں کہ ٹیپو سلطان کی فوج نے آخر وقت میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ صرف تھوڑے سے آدمی ٹیپو کے ساتھ رہ گئے تھے۔ دوسری طرف انگریز جنرل کے پاس بہت بڑی فوج

تھی۔ ایسی حالت میں جنگ واضح طور پر ہلاکت کے ہم معنی تھی۔ اس کے باوجود ٹیپو نے جنگ کی اور مارے گئے۔ مگر یہ طریقہ صحیح نہیں۔ حضرت موسیٰ کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم دیا۔ مگر آپ کی قوم بنی اسرائیل آپ کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوئی۔ صرف تھوڑے سے لوگ آپ کے ساتھ رہ گئے۔ اس وقت جہاد کو ملتوی کر دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب دشمن کی طاقت فیصلہ کن حد تک زیادہ ہو تو جنگ نہیں کرنا چاہئے۔ اس کو سن کر وہ آدمی کہے گا کہ آپ موسیٰ اور ٹیپو کا تقابل کر رہے ہیں۔ موسیٰ تو پیغمبر تھے، پھر پیغمبر کا اور ایک عام انسان کا تقابل کیسے کیا جا سکتا ہے۔

آپ جواب دیں گے کہ بھائی، میں نے تقابل کی بات نہیں کہی۔ میں نے پیروی کی بات کہی ہے۔ پیغمبر ہمارے لئے نمونہ ہیں۔ موسیٰ بھی ہمارے لئے نمونہ تھے۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ جب کسی معاملہ میں پیغمبر کا نمونہ مل جائے تو ہم اس کی پیروی کریں۔ ہم اس کے خلاف نہ جائیں۔ اب وہ آدمی پرجوش طور پر کہے گا۔ آپ کیسی بات کہہ رہے ہیں۔ ہم تو پیغمبر آخر الزماں کی امت ہیں۔ ہمیں اپنے پیغمبر کی پیروی کرنی ہے نہ کہ موسیٰ کی۔ کیا آپ نے حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں پڑھا کہ لو کان موسیٰ حیا ما وسعہ الا اتباعی۔

آپ جواب دیں گے کہ میرے بھائی، یہی اسوہ ہمارے رسول کا بھی ہے۔ مکہ میں آپ کے ساتھ تھوڑے لوگ تھے۔ اس وقت آپ نے مکہ والوں سے جنگ نہیں کی۔ انھوں نے تلواریں لے کر آپ کا مکان گھیر لیا۔ تو آپ رات کے وقت خاموشی سے نکل کر مدینہ چلے گئے۔ آپ نے اس وقت جنگ کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔ اب وہ آدمی کہے گا کہ آپ نے اسلامی تاریخ نہیں پڑھی۔ آپ حضرت ابوبکر کی تاریخ دیکھئے۔ ان کی خلافت کے زمانہ میں جب لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ایک رسی بھی اگر کوئی شخص دینے سے روکے گا تو میں اس سے جہاد کروں گا۔

اب آپ کہیں گے کہ بھائی، تم اقتدار کے زمانہ کی بات کر رہے ہو، اور میں اقتدار سے پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ اِس وقت میں یہ بتا رہا ہوں کہ جب مسلمان اقتدار کی حالت میں نہ ہوں، اس وقت ان کے لئے اسلام میں کیا نمونہ ہے۔ آدمی یہ سن کر پرجوش طور پر کہے گا کہ آپ عجیب بات کر رہے ہیں۔ اسلام تو ایک مکمل نظام ہے۔ خدا نے اسلام کی صورت میں اپنی مکمل شریعت بھیج دی ہے۔ اسلام میں آدھے پونے کی تقسیم نہیں۔ اسلام ایک کامل نظام ہے اور کامل نظام کے طور پر ہی اس کو

لیا جا سکتا ہے۔

اب آپ کہیں گے کہ میرے بھائی ، یہ صحیح ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام ہے۔ مگر کوئی بھی نظام پورا کا پورا ایک وقت قائم نہیں کیا جا سکتا۔ ہر کام آغاز سے چل کر اختتام تک پہنچتا ہے۔ اسی کا نام تدریج ہے۔ اسلام کا کام بھی تدریجی انداز سے ہوگا۔ ہمیں یہ کرنا ہے کہ آج کے حالات میں جو کچھ ممکن ہے وہاں سے اپنے عمل کا آغاز کریں۔ اس طرح ہمارا اسلامی سفر شروع ہو جائے گا۔ وہ منزل بہ منزل جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ ان شاء اللہ ہم آخری مرحلہ تک پہنچ جائیں گے۔ اب آپ کا مخاطب اور زیادہ پر جوش ہو جائے گا۔ وہ کہے گا کہ آپ تو مسلمانوں کو بزدل بنا دینا چاہتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنے مجاہدانہ عزائم کو ختم کر دیں اور نظام باطل کی دی ہوئی رعایتوں کے تحت کمتر زندگی پر راضی ہو جائیں۔

اسی طرح وہ آدمی آپ کی ہر دلیل کو پر جوش طور پر رد کرتا رہے گا۔ آپ خواہ کتنی ہی مدلل بات کہیں وہ آپ کی ہر بات کے جواب میں کچھ نہ کچھ الفاظ بول دے گا۔ اس طرح گفت گو کبھی ختم نہ ہوگی۔

ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کا خاص سبب نکتہ بحث کو بدلنا ہے۔ آپ جب ایک دلیل پیش کرتے ہیں تو اس کا تعلق کسی خاص نکتہ بحث سے ہوتا ہے۔ اگر آپ کا مخاطب نکتہ بحث کو بدل دے تو آپ کی دلیل ، نئے نکتہ بحث کے اعتبار سے بے وزن معلوم ہونے لگے گی۔

قرآن میں حضرت ابراہیم نے شاہ نمرود کے سامنے توحید کی دعوت پیش کرتے ہوئے کہا کہ رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ نمرود نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ پھر تو میں بھی رب ہوں ، کیوں کہ مجھے بھی یہ اختیار حاصل ہے کہ جس کو چاہوں زندگی دوں اور جس کو چاہوں مروا دوں۔ نمرود نے یہاں یہی کیا کہ اس نے نکتہ بحث کو بدل دیا۔ حضرت ابراہیم نے بزر اختیار کے معنی میں یحیی ویمیت کہا تھا ، نمرود نے اس کو ملکی اختیار کے معنی میں لے کر کہہ دیا کہ انا احیی و امیت (البقرہ ۲۵۸)

حضرت ابراہیم نے داعیانہ حکمت کے تحت اس کو نظر انداز کیا اور فرمایا کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے ، تم اس کو مغرب سے نکال دو۔ یہ سن کر نمرود مبہوت ہو گیا۔ آجکل کے انسانوں کے برعکس ، شاید نمرود کے اندر بھی کچھ حیا تھی۔ ورنہ وہ چاہتا تو دوبارہ نکتہ بحث کو بدل کر یہ کہہ سکتا تھا کہ ابھی تم موت و حیات کی بات کر رہے تھے اور پھر اچانک تم سورج چاند کی بات کرنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم کو خود اپنی بات پر یقین نہیں۔

سبب یہاں ہے

ایک امریکی خاتون لندن گئیں۔ وہاں انہوں نے ایک اخبار فروش سے پوچھا کہ باربیکن (Barbican) کا راستہ کون سا ہے۔ اخبار فروش نے بتایا تو تیزی سے اپنے الفاظ ادا کئے۔ اس کے بعد خاتون نے کہا " مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو دوبارہ بتانے کی زحمت دے رہی ہوں۔ میں سمجھ نہ سکی کہ آپ نے کیا کہا۔ اخبار فروش نے جواب دیا:

You know your trouble, love, you were listening with an American accent.

محترمہ آپ کو اپنی مشکل معلوم ہے۔ آپ میری بات کو امریکی لہجہ میں سن رہی تھیں (آر۔ ڈی جولائی ۱۹۷۹)۔

اس طرح کی مشکل اکثر سننے والے اور سنانے والے کے درمیان پیش آتی ہے۔ ایک بار راجستھان کے ایک شہر میں میری تقریر ہوئی۔ تقریر کا موضوع سیرت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تھا۔ میں نے اپنی ڈیڑھ گھنٹہ کی تقریر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سبق آموز واقعات اور آپ کے اقوال سادہ انداز میں بیان کئے۔

جب میں اجتماع گاہ سے باہر آیا تو ایک صاحب ملے۔ انہوں نے کہا " آپ سیرت پر تو کچھ بولے نہیں " مجھے یہ سن کر سخت حیرانی ہوئی۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ میں نے خالص سیرت پر تقریر کی ہے اس میں کوئی دوسری چیز شامل نہیں کی ہے۔ مزید پوچھنے پر معلوم ہوا کہ موصوف کے نزدیک سیرت کی تقریر یہ تھی کہ معجزات اور فتوحات اور خرق عادت کی قسم کے واقعات بیان کئے جائیں۔ چونکہ میں نے سادہ واقعات اور نصیحت کی باتیں بیان کی تھیں اس لئے موصوف کو ایسا محسوس ہوا گویا میں نے سیرت پر تقریر ہی نہیں کی۔

یہاں بھی وہی بات ہے جو مذکورہ صدر واقعہ میں نظر آتی ہے۔ میں نے ہدایت اور نصیحت کی زبان میں بات کی، جب کہ سننے والے بزرگ اس کو فتوحات اور کرامات کی زبان میں سن رہے تھے۔ ایسی صورت میں وہ میری بات کیوں کر سمجھتے۔

اسی طرح کہنے والا اگر "اسلام" کی زبان میں کہہ رہا ہو اور سننے والا اس کو "قوم" کی زبان میں سنے۔ کہنے والا " دعوت " کی زبان میں بولے اور سننے والے کے پاس اس کو سمجھنے کے لئے

"سیاست" کی زبان ہو۔ تو ایسی تمام صورتوں میں سنانے والے اور سننے والے کے درمیان ایک ایسا فصل (Gap) پیدا ہو جائے گا کہ بے حد واضح بات بھی سننے والے کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ انتہائی مدلل بات بھی سننے والے کو بے دلیل معلوم ہو گی۔

یہی بات قرآن وحدیث کے بارہ میں بھی صحیح ہے۔ قرآن وحدیث کی بات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اس کو اسی "زبان" میں سنے جس زبان میں وہ کہی جارہی ہے۔ اگر وہ کسی دوسری زبان میں سننے لگے تو وہ سن کر بھی نہیں پائے گا۔ وہ پڑھ کر بھی اس کی حقیقت سے محروم رہے گا۔

ایک مثال لیجئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو توحید کی طرف بلایا۔ مگر اس نے انکار کیا۔ بالآخر حضرت موسیٰ کو خدا نے بتایا کہ فرعون مع اپنے لشکر کے تباہ کیا جانے والا ہے۔ تم اس کے انکار پر دل گرفتہ نہ ہو، البتہ اپنے مسلک پر صبر کے ساتھ قائم رہتے ہوئے اس کو حق کی دعوت دیتے رہو۔ اس موقع پر ارشاد ہوا ہے: پس تم اور ہارون دونوں قائم رہو اور ان لوگوں کے طریقہ کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے (یونس ۸۹)

اس آیت کا جو مطلب مفسرین نے لیا ہے وہ صفوۃ التفاسیر کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

(ولاتتبعان سبیل الذین لایعلمون) ای لاتسلکا سبیل الجهلة فی الاستعجال اوعدم الاطمئنان بوعد الله تعالی۔ قال الطبری، روی انه مکث بعد هذه الدعوة اربعین سنة ثم اغرق الله فرعون۔

بے علموں کے طریقہ کی پیروی نہ کرو، یعنی جلد بازی اور خدا کے وعدہ کے بارہ میں بے یقینی میں پڑ کر جاہلوں کے راستہ پر نہ چلو۔ طبری نے کہا ہے کہ روایت کی گئی ہے کہ حضرت موسیٰ اس دعا کے بعد چالیس سال تک مصر میں رہے۔ پھر فرعون کو اللہ تعالیٰ نے غرق کر دیا۔

مذکورہ تفسیر کے مطابق آیت میں جس چیز کو بے علمی کہا گیا ہے وہ دعوۃ الی اللہ کے کام میں بے صبری اور جلد بازی ہے۔ مگر ایک مفسر قرآن نے اپنی مخصوص ذہنی ساخت کی بنا پر اس سے بالکل دوسرا مطلب نکال لیا۔ وہ اپنے تفسیری حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"جو لوگ حقیقت کو نہیں جانتے اور اللہ تعالیٰ کی مصلحتوں کو نہیں سمجھتے وہ باطل کے مقابلہ میں حق کی کمزوری اور اقامت حق کے لئے سعی کرنے والوں کی مسلسل ناکامیاں اور ائمہ باطل کے ٹھاٹھ اور ان کی دنیوی سرفرازیاں دیکھ کر یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ کو یہی

منظور ہے کہ اس کے باغی دنیا پر چھائے رہیں ۔ اور شاید حضرت حق خود ہی باطل کے مقابلہ میں حق کی تائید کرنا نہیں چاہتے ۔ پھر وہ نادان لوگ آخر کار اپنی بدگمانیوں کی بنا پر یہ نتیجہ نکال بیٹھتے ہیں کہ اقامت حق کی سعی لاحاصل ہے اور اب مناسب یہی ہے کہ اس ذراسی دینداری پر راضی ہو کر بیٹھ رہا جائے جس کی اجازت کفر وفسق کی سلطانی میں مل رہی ہو۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اور ان کے پیروؤں کو اسی غلطی سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے ۔ ارشاد خداوندی کا منشا یہ ہے کہ صبر کے ساتھ انہیں ناموافق حالات میں کام کئے جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں بھی وہی غلط فہمی ہو جائے جو ایسے حالات میں جاہلوں اور نادانوں کو عموماً لاحق ہو جایا کرتی ہے ۔"

اس آیت میں دعوتی عمل کے ذیل میں بے صبری اور جلد بازی سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے ۔ اور اس کمزوری کو بے علمی سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ کیونکہ دعوتی عمل میں آدمی جب صبر اور حکمت کے خلاف کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ تخلیق کے بارہ میں خدا کے منصوبہ کو نہیں سمجھتا۔ مگر مذکورہ بالا تفسیر میں عجیب وغریب طور پر یہ معنی نکال لئے گئے کہ کفر وفسق کی سلطانی قبول کر کے ذراسی دینداری پر راضی ہو جانا بے علمی ہے ۔ اس تفسیر میں اور قرآن کی آیت میں صرف "بے علمی" کا لفظ مشترک ہے، باقی سب کچھ مفسر کا اپنا اضافہ ہے ۔

مزید یہ کہ اس تفسیر نے دین کے پورے معاملہ کو الٹ دیا ہے ۔ وہ بڑی دینداری کو "ذراسی دینداری" قرار دے رہی ہے اور ذراسی دینداری کو بڑی دینداری ۔ اس تفسیر کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ اور آپ کے ساتھیوں کو زمانۂ دعوت میں فرعون کے ملک میں جس دینداری کا موقع حاصل تھا وہ بس " ذراسی دینداری " تھی ۔ خدا نے کہا کہ اس ذراسی دینداری پر قانع نہ ہو جاؤ ورنہ تم جاہل ٹھہروگے ۔

اب دیکھئے کہ حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کو کیا چیز حاصل تھی ۔ ان کو "سلطانیٔ باطل" کے باوجود یہ موقع حاصل تھا کہ وہ خدا کی عبادت کریں ۔ وہ آخرت کی فکر کریں ۔ وہ خدا سے ڈریں اور اس سے محبت کریں ۔ وہ اپنے رب کی یادوں میں جئیں ۔ وہ دعوت وشہادت کا کام کریں اور خدا کے بندوں کو خدا کی طرف بلائیں ۔ اخبات وانابت اور خشوع وتضرع سے لیکر بندوں کے ساتھ انصاف اور خیر خواہی تک سب کچھ کرنے کا موقع انہیں ملا ہوا تھا اور وہ پوری طرح اس میں مشغول تھے ۔ مگر یہ تمام اہم ترین چیزیں، مذکورہ تشریح کی روشنی میں " ذراسی دینداری " بن کر رہ گئیں ۔

گروہ بندی

ائمہ اربعہ نے ضرورت کے احساس کے تحت بہت سے نئے مسائل وضع کئے۔ مگر وہ کتاب اور سنت ہی کو دین کا اصل مرجع سمجھتے تھے۔ ان کو کبھی گمان نہ تھا کہ ان کے وضع کردہ مسائل دین کا مقام حاصل کرلیں گے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے کہ کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ وہ ہمارے قول پر فتویٰ دے بغیر اس کے کہ اس کو ہماری دلیل کا علم حاصل ہو (لا یجوز لاحد ان یقول قولنا من غیر ان یعرف دلیلنا)

مگر بعد کے زمانہ میں یہ صورت باقی نہ رہی حتیٰ کہ وہ وقت آیا کہ لوگ بس اپنے امام کے قول کو سب کچھ سمجھنے لگے۔ انسانی فقہ نے خدائی شریعت کی جگہ لے لی۔ اب امام کرخی کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ ہر آیت یا حدیث جو اس سے ٹکراتی ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا تو قابل تاویل ہے یا منسوخ ہو چکی ہے۔ (کل آیۃ اوحدیث یخالف ماعلیہ اصحابنا فھو مؤول اومنسوخ، فقہ السنۃ، مجلد اوّل، صفحۃ ۱۳)

جب قوم پر گراوٹ کا یہ دور آتا ہے اسی وقت اس کے اندر تحزب پیدا ہوجاتا ہے۔ ہر ایک اپنے مسلک کو اصل دین سمجھنے لگتا ہے۔ قوم مختلف قسم کے متحارب فرقوں میں بٹ جاتی ہے۔ دین کا اصل سرا لوگوں کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ ہر ایک کا وہ حال ہوجاتا ہے جو قرآن کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے؛ وتقطعوا امرھم بینھم زبراً کل حزب بما لدیھم فرحون)

تاہم اس کی ذمہ داری ائمہ پر نہیں، ان کے بعد کے متبعین پر عائد ہوتی ہے۔ بعد کے لوگوں نے اپنے اپنے مذاہب فقہ کو صحیح ثابت کرنے اور دوسرے کو غلط قرار دینے کے لیے جو غلو کیا وہ ہرگز کسی امام کا مسلک نہ تھا۔

یہاں ہم مختلف ائمہ کے خیالات ان کے اپنے الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ائمہ کا اپنا خیال اپنے مسلک فقہ کے بارے میں کیا تھا، اور بعد کے لوگوں نے اس کو کیا کردیا۔

ائمہ کے اقوال

مامنا الا من یخطئ ویرد علیہ الا المعصوم ہم میں سے ہر شخص غلطی کرتا ہے اور ہم میں سے ہر شخص

صلی اللہ علیہ وسلم (الامام مالك)

کی کوئی بات قابل رد ہو سکتی ہے سوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو کہ معصوم ہیں۔

اذا صح الحدیث فھو مذھبی۔ وا ضر بوا بقولی عرض الحائط (الامام الشافعی)

جب حدیث سے ثابت ہو جائے تو وہی میرا مسلک ہے۔اس کے بعد میرے قول کو دیوار پہ مار دو۔

لاحجة فی قول احد دون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم (الامام الشافعی)

رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کا قول حجت نہیں۔

لا ینبغی لمن لایعرف دلیلی ان یفتی بکلامی۔ (وکان اذا افتی یقول) ھذا رائ النعمان بن ثابت وھو احسن ما قدرنا علیه فمن جاء باحسن منه فھو اولیٰ بالصواب (الامام ابوحنیفه)

جو شخص میری دلیل کو نہ جانے اس کے لئے درست نہیں کہ وہ ہمارے قول پر فتویٰ دے۔ابو حنیفہ جب کسی مسئلہ میں فتویٰ دیتے تو کہتے کہ یہ نعمان بن ثابت کی رائے ہے۔ ہمارے علم کے مطابق یہ احسن ہے۔ جو شخص اس سے زیادہ احسن کو پائے تو اس کے بعد وہی زیادہ احسن ہے۔

لا تقلدنی ولا تقلد مالکا ولا الشافعی ولا الاوزاعی ولا النخعی ولا غیرھم (الامام احمد بن حنبل)

تم میری تقلید نہ کرو اور نہ مالک اور شافعی اور اوزاعی اور نخعی یا کسی اور کی تقلید کرو۔

منار الاسلام صفر ۱۴۰۴ھ (نومبر۔دسمبر ۱۹۸۳)

ائمہ اربعہ کے ان اقوال سے ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک اصل چیز قرآن اور سنت تھی۔ وہ اس کو سراسر غلط سمجھتے تھے کہ کوئی شخص ان کا مقلد بن جائے اور کتاب وسنت سے براہ راست دین اخذ نہ کرے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بعد کے دور میں جو تقلید رائج ہوئی اس کا خود ائمہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔

موجودہ رواجی تقلید کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ قرآن وسنت کے ساتھ آدمی کا زندہ رشتہ قائم نہیں رہتا۔قرآن وسنت مومن کی غذائیں ہیں۔ مگر مروجہ تقلید کے بعد قرآن وسنت یا تو کسی تقلیدی مسلک کو صحیح ثابت کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں یا برکت اور تقدس حاصل کرنے کے لئے۔ قرآن وسنت کے نام پر آدمی قرآن وسنت سے دور ہو جاتا ہے۔

مسئلہ کا حل

مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۱۹۰۸-۱۹۸۵) اپنی آخر عمر تک ماہنامہ 'برہان' (دہلی) کے ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے ایک بار اپنے اداریہ کے صفحات میں لکھا تھا:

"ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی جو معاشیات میں ڈاکٹر ہیں، وہاں مسلمان طلباء کی انجمن کی دعوت پر اسلام پر مختلف مراکز میں لکچر دینے کی غرض سے امریکہ گئے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں شکاگو سے ان کا ایک خط آیا ہے جس میں تحریر فرماتے ہیں: ہندوستان میں گزشتہ پچیس برس میں ہم نے (مسلمانوں نے) احتجاج کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ لیکن یہاں کے مسلمان مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ اس مدت میں ہم نے کوئی تعمیری (positive) اور مثبت کام بھی کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو وہ کیا ہے؟ یہ سن کر سخت شرمندگی ہوتی ہے، آپ ازراہ کرم اس پر توجہ کیجیے۔ راقم الحروف نے اس کے جواب میں ڈاکٹر نجات اللہ صاحب کو لکھا ہے کہ آپ نے یہ وہی بات لکھی ہے جس کو میں شروع سے کہتا اور لکھتا چلا آرہا ہوں، لیکن افسوس، یہاں کے مسلمانوں میں اجتماعی اور قومی سطح پر مثبت اور تعمیری کام کرنے کا کوئی جذبہ ہی نہیں ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لیڈرشپ بالکل نکمی اور ناکارہ ہے، اس کے پاس نہ دل ہے نہ دماغ۔ ہوا ؤں پر اڑتی اور جلسوں جلوسوں پر جیتی ہے۔"

(برہان، دہلی، اکتوبر ۱۹۷۲ء)

ان سطروں کے لکھے اور چھپے ہوتے ۲۰ سال ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ وقت قریب آگیا جبکہ "۲۵ سال" کی کہانی کو "۵۰ سال" کی کہانی کا عنوان دیا جاتے مگر وہی صورت حال بدستور ابھی تک باقی ہے۔ اس میں اضافہ کی نشاندہی تو کی جاسکتی ہے مگر اس میں کمی کی کوئی نشاندہی نہیں کی جاسکتی۔

یہ بات بذات خود صحیح ہے کہ لیڈرشپ کے ناکارہ ہونے کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہوتی ہے مگر یہاں دوبارہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے درمیان ایسے لوگ آخر لیڈر کیسے بن جاتے ہیں جو بالکل نکمے اور نارہ ہوں۔ ایسے لوگوں کو ملت کے کوڑا خانہ میں جگہ ملنی چاہیے نہ یہ کہ ملت کے قیادی اسٹیج پر انھیں بٹھایا جاتے۔

اس کی وجہ مسلم سماج کی بے شعوری ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان بے شعوری کی سطح پر جی رہے ہیں

وہ صحیح اور غلط میں تمیز نہیں کر پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ جو آدمی زیادہ جوشیلی تقریر کرتا ہے۔ جو بڑے بڑے الفاظ بولنا جانتا ہے۔ جو جھوٹی آرزوؤں اور فرضی خوش فہمیوں میں جینے کی خوراک فراہم کرتا ہے، اس کے پیچھے ان کی بھیڑ دوڑ پڑتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنی بے شعوری کی بنا پر لفظ اور حقیقت میں فرق کرنے کی تمیز نہیں رکھتی۔

ایسی حالت میں کرنے کا پہلا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو باشعور بنایا جائے۔ جس دن مسلمان ایک باشعور گروہ بن جائیں گے اسی دن ناکارہ قیادت اپنی زمین کھو دے گی اور پھر وہ اپنے آپ ختم ہو کر رہ جائے گی۔ نکمی قیادت کو ختم کرنا ہے تو مسلمانوں کے بے شعورپن کو ختم کیجئے۔ اس مسئلہ کا حل بالواسطہ طریق کار میں ہے نہ کہ براہ راست طریق کار میں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر آدمی کے لیے اس کی فطرت سب سے بڑی اور سب سے بہتر رہنما ہے۔ جھوٹے لیڈر آدمی کو اس کی فطرت کے راستہ سے ہٹاتے ہیں اگر یہ نام نہاد لیڈر سامنے نہ رہیں تو ہر آدمی کی فطرت جاگ اٹھے گی۔ اور جب فطرت زندہ اور بیدار ہو تو کسی رہنما کی کوئی ضرورت نہیں۔

مسلمانوں کے سلسلہ میں اس وقت کرنے کا اصل کام یہ نہیں ہے کہ یہ شکوہ کیا جائے کہ ان کے درمیان تعمیری اور مثبت قسم کی لیڈرشپ نہیں ہے۔ بلکہ اصل کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر تعمیری اور مثبت ذہن بنایا جائے تاکہ ان کے درمیان تعمیری اور مثبت لیڈرشپ ابھر سکے۔

حدیث میں آیا ہے کہ: کما تکونون کذٰلک یؤمّرُ علیکم۔ یعنی جیسے تم ہو گے ویسے ہی تمہارے لیڈر ہوں گے۔ موجودہ زمانہ میں جو غیر صحیح لیڈرشپ مسلمانوں کے اوپر مسلّط ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خود مسلمان کا مزاج غیر صحیح ہے۔ اگر مزاج صحیح ہو جائے تو ان کے درمیان لیڈرشپ بھی صحیح قسم کی ابھرے گی۔ ہمارے کرنے کا اصل کام مزاج سازی یا ذہنی تعمیر ہے۔ بقیہ چیزیں جو ہم چاہتے ہیں وہ اسی کا نتیجہ ہیں۔ اس بنیادی کام کے بغیر ان کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

صحیح طریقہ

ٹائمس آف انڈیا (۲۲ اگست ۱۹۸۷) میں مسٹر کے سبرا منیم کا ایک مضمون شائع ہوا ہے اس کا عنوان ہے : ایک حقیقت جس کو مسلمان نظر انداز کرتے ہیں (A Reality Muslims Ignore) اس مضمون میں ہندستانی مسلمانوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس ذیل میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے ایک بات وہ ہے جو مسلمانوں کی "تہذیبی تشخص" کی تحریکوں کے بارہ میں ہے۔ مضمون نگار نے لکھا ہے کہ ایک فرقہ جو ایک وسیع تر مجموعہ، جیسے ایک قوم کا جزء ہو، وہ اپنے تشخص کو صرف دو طریقوں سے برقرار رکھ سکتا ہے۔ وہ یا تو وسیع تر مجموعہ کے علی العموم کلچر میں اپنا کوئی بہت خاص حصہ ادا کرے، یا وہ بقیہ لوگوں سے اپنے آپ کو منقطع کر لینے پر اصرار کرے۔ اول الذکر سے یک جہتی پیدا ہوتی ہے، جب کہ ثانی الذکر تصادم کی طرف لے جاتا ہے :

> A community, as a constituent of a larger entity like a nation, can sustain its identity in two ways. It can either make its own unique contribution to the overall culture of the larger entity or it can insist on cutting itself off from the rest. While the former leads to integration, the latter leads to conflict.
>
> *The Times of India,* New Delhi, August 22, 1987

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں " اَلْاَمِین" کہا جاتا تھا۔ تعمیر کعبہ کے مشہور واقعہ میں صبح کو جب لوگوں نے آپ کو کعبہ میں پایا تو وہ کہہ پڑے : ھٰذَا الْاَمِیْنُ رَضِیْنَا (یہ امین ہیں، ہم ان پر راضی ہیں) آپ کا امانت دار ہونا آپ کا ایسا امتیاز بن گیا کہ مکہ میں آپ اپنی اسی صفت سے پہچانے جانے لگے۔ یہ تشخص حاصل کرنے کا صحت مندانہ طریقہ ہے۔ جو لوگ کسی سماج میں اخلاقی یا اصلاحی یا تعمیری اعتبار سے ممتاز ہو جائیں ان کو دوسروں کے درمیان ایسا تشخص حاصل ہوتا ہے جو حقیقی تشخص ہوتا ہے۔

اس کے برعکس جو لوگ اپنا تشخص اس طرح حاصل کرنا چاہیں کہ وہ ہر معاملہ میں دوسروں سے الگ ہونے کی کوشش کریں وہ لوگوں کے درمیان ایک قسم کے "اچھوت" بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان کا تشخص موت کا تشخص ہوتا ہے نہ کہ زندگی کا تشخص۔

اصلاح کا طریقہ

بنو امیہ کے زمانہ میں خلافت اپنے اسلامی طرز پر باقی نہ رہی۔ اب انصاف کی جگہ ظلم ہونے لگا اور سرکاری اموال میں دیانت کے بجائے اسراف شروع ہوگیا۔ اس زمانہ میں کچھ لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ ایسے حکمرانوں کو زکواۃ دینا درست نہیں۔ مگر اس وقت اصحاب رسول میں سے جو لوگ موجود تھے انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ زکواۃ انھیں موجودہ حکمرانوں کو دی جائے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر سے پوچھا کہ اب زکواۃ کس کو دیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ وقت کے حاکموں کو دو۔ پوچھنے والے نے کہا کہ یہ لوگ زکواۃ کی رقم عطر پر اور اپنے قیمتی کپڑوں پر خرچ کرتے ہیں۔ جواب دیا: وَاِنْ۔ یعنی اگرچہ وہ ایسا کریں تب بھی انھیں کو دو (ابن ابی شیبہ)

صحابی رسول کی یہ ہدایت عین اسلامی تعلیم کے مطابق ہے۔ اس ہدایت کا مطلب ظالم حکمراں کے سامنے جھکنا نہیں تھا، بلکہ لوگوں کو یہ بتانا تھا کہ ان کے عمل کا رخ کیا ہونا چاہیے۔

حکمراں کا بگاڑ ہمیشہ عوام کے بگاڑ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ جیسے تم ہوگے ویسے ہی تمہارے حکمراں ہوں گے (کما تکونون کذلك یؤمر علیکم) ایسی حالت میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب حکمراں میں بگاڑ نظر آئے تو عوام کی سطح پر اصلاح کا کام شروع کر دیا جائے۔ درخت کے اندر اگر سوکھنے کے آثار ظاہر ہوں تو اس کی جڑ میں پانی دیا جائے گا نہ کہ پتیوں میں۔

حضرت عبداللہ بن عمر نے اپنے جواب کے ذریعہ لوگوں کے سوچنے کے رخ کو موڑ دیا۔ لوگ حکمراں میں بگاڑ دیکھ کر سوچنے لگے تھے کہ حکمراں سے لڑیں۔ آپ نے لوگوں کو بتایا کہ تم لوگ اپنی سوچ کو سیاست کے باہر دوسرے دائروں میں اصلاح پر لگاؤ۔ غیر سیاسی دائرہ میں اگر تم اصلاح لانے میں کامیاب ہوگیے تو اس کے بعد سیاسی دائرہ میں بھی لازماً اصلاح ہو کر رہے گی۔

سیاست میں بگاڑ کو دیکھ کر سیاسی نظام سے لڑنے لگنا صرف ایک عاجلانہ ردعمل ہے، قوت کے ضیاع کے سوا اس کا کوئی حقیقی فائدہ نہیں۔ اس لیے اسلام میں ایسی کارروائیوں سے منع کیا گیا ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ بگاڑ کی جڑ کو سمجھا جائے اور جڑ سے اصلاح کی کوشش کی جائے۔ اور جڑ والی اصلاح کا آغاز عوامی اصلاح سے ہوتا ہے نہ کہ حکومتی ٹکراؤ سے۔

قیمتی نصیحت

تبلیغی جماعت کے ایک بزرگ نے تقریر کی۔ انھوں نے تبلیغ والوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ جہاں بھی رہیں، خاموشی کے ساتھ اپنا کام کریں۔ وہاں کا جو نظام ہے، اس میں نہ داخل ہوں اور نہ اس میں دخل دیں۔

یہ نہایت عمدہ نصیحت ہے۔ یہ اسلامی حکمت کے عین مطابق ہے۔ مثال کے طور پر آپ ایک یونیورسٹی میں ہیں۔ وہاں آپ نہ یونین کی سیاست میں داخل ہوں اور نہ وائس چانسلر کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے میں حصّہ لیں۔ آپ ایک حکومتی نظام میں ہیں۔ وہاں آپ نہ عہدہ کے طالب بنیں اور نہ حکومت اور ایڈمنسٹریشن کی مخالفت میں وہ سرگرمیاں دکھائیں جو اپوزیشن کے لوگ کیا کرتے ہیں۔ ان تمام چیزوں سے الگ رہ کر آپ اپنے لیے کام کا میدان تلاش کرلیں۔

اس طریق کار کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو ہر نظام میں کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ آدمی اگر نظام میں داخل ہو تو اس کو رقابتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور اگر وہ اس میں دخل دے تو نظام کی طرف سے طرح طرح کی رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو کام ہو سکتا ہے وہ بھی نہیں ہو پاتا۔ اور ساری طاقت بے فائدہ مشغولیتوں میں ضائع ہو کر رہ جاتی ہے۔

جو لوگ یہ طریق کار اختیار کریں وہ شکایت کی نفسیات سے بچے رہتے ہیں۔ ان کی نظر ان مواقع پر نہیں ہوتی جن پر دوسرے لوگ قبضہ کیے ہوتے ہیں۔ ان کی نظر ہمیشہ ان مواقع پر ہوتی ہے جو دوسروں کے قبضہ کے باوجود ابھی تک خالی پڑا ہوا ہے۔ اس طرح وہ تضاد سے محفوظ رہ کر ہر جگہ اپنے لیے کام کا میدان پالیتے ہیں۔ وہ اس قیمتی دولت کے مالک بن جاتے ہیں جس کو قرآن میں نفس مطمئنہ کہا گیا ہے۔

مفروضہ زیادتیوں کے خلاف "آواز بلند کرنا" کوئی کام نہیں ہے۔ بلکہ امکانی مواقع کو استعمال کرنا کام ہے۔ نظام کو توڑنے میں سرگرم ہونا کوئی کام نہیں، بلکہ ذہنوں کو بدلنے کے لیے محنت کرنا کام ہے۔ اخبار کے صفحات میں جگہ حاصل کرنا کوئی کام نہیں، بلکہ خاموش فکر میں لگنا اصل کام ہے۔ سڑکوں پر مظاہرہ کرنا کوئی کام نہیں۔ کام یہ ہے کہ آدمی اپنی تنہائیوں میں کام کے لیے تڑپے اور اس کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑیں۔

صحیح انداز کار

دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کے مقابلہ میں فرانس کو شکست ہوئی۔ اس دوران پیرس میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں فرانس کے مختلف ذمہ دار شریک تھے۔ اس میٹنگ میں جن لوگوں نے تقریریں کیں ان سب کا مشترک خلاصہ یہ تھا کہ ہر ایک جرمنی کو اور نازی پارٹی کو برا بھلا کہتا رہا۔ آخر میں ایک فرانسیسی جنرل اٹھا اس نے کہا کہ ہماری شکست کا سبب جرمنی نہیں بلکہ ہم خود ہیں۔ اور وہ یہ کہ ہمارے پاس نہ ہتھیار ہیں اور نہ لڑنے والے جوان :

No armament, no children

دوسری جنگ عظیم سے پہلے فرانس کی جنگی صنعت نسبتاً بہت پیچھے تھی۔ دوسری طرف فرانس میں جنسی اباحیت کے نتیجہ میں بہت بڑے پیمانہ پر یہ ذہن پیدا ہوگیا تھا کہ بچے نہ پیدا کیے جائیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس میں بچوں کی پیدائش کی شرح بہت گھٹ گئی۔ مذکورہ جنرل کے نزدیک یہ دو داخلی اسباب تھے جو فرانس کے شکست کا سبب بنے۔ ظاہر ہے کہ جب نہ ہتھیار ہو اور نہ فوج تو جنگ کیسے لڑی جائے گی۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاملات میں سوچنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے خارجی اندازِ فکر اور دوسرا ہے داخلی اندازِ فکر۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر احیاءِ امت کی جو تحریکیں چل رہی ہیں وہ سب کی سب خارجی اندازِ فکر پر چل رہی ہیں۔ ہر ایک نے اپنے سے باہر ایک "دشمن" دریافت کر رکھا ہے۔ اور ہر ایک اپنے دریافت کردہ دشمن کے خلاف تقریری یا غیر تقریری مہم چلانے میں مصروف ہے۔

موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکوں میں اس اعتبار سے غالباً ایک ہی استثناء ہے اور وہ تبلیغی جماعت کا ہے تبلیغی جماعت واحد مسلم جماعت ہے جو داخلی اندازِ فکر پر چل رہی ہے۔ تبلیغی جماعت کا کہنا یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر ایمان ویقین کی کمزوری سے ان کے سارے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے اندر اگر دوبارہ ایمان ویقین زندہ ہوجائے تو ان کے تمام مسائل بھی اپنے آپ حل ہوجائیں گے۔

راقم الحروف ذاتی طور پر اسی آخری طرزِ فکر کو صحیح سمجھتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا ہر مسئلہ ان کی داخلی کمزوری کا مسئلہ ہے۔ جو شخص واقعتہً کوئی نتیجہ خیز کام کرنا چاہتا ہو اس کو مسلمانوں کی داخلی اصلاح پر اپنی ساری طاقت لگا دینی چاہیے۔

کلمۂ حکمت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں بتاتی ہیں کہ آپ کو جب بھی دو صورتوں میں سے ایک صورت کا اختیار کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان صورت کا انتخاب فرماتے تھے (ماخیّر بین امرین إلا اختار ایسرھما)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دانش مند وہ نہیں جو خیر اور شر کے فرق کو جانے۔ بلکہ دانش مند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے کون سا خیر ہے (لیس العاقل الذی یعرف الخیر من الشر ولکنہ الذی یعرف خیر الشرین) العبقریات الاسلامیۃ للعقاد، صفحہ ۵۰۵

اسی بات کو امام شافعیؒ نے اس طرح کہا کہ دانش مند وہ نہیں ہے جس کو خیر اور شر کے درمیان انتخاب کرنا ہو اور وہ ایک چیز کا انتخاب کر لے۔ دانش مند تو وہ ہے جو دو شر کے درمیان پڑ جائے اور پھر دونوں میں سے جو آسان ہے اس کا انتخاب کرے (لیس العاقل الذی یقع بین الشر والخیر فیختار۔ إنما العاقل الذی یقع بین الشرین فیختار ایسرھما) الامام الشافعی، تالیف عبد الحلیم الجندی، القاہرہ، صفحہ ۴۹

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ شہر میں غیر مسلموں کا ایک جلوس نکلتا ہے۔ وہ مسلم مخالف نعرہ لگاتا ہوا مسلمانوں کے محلہ سے گزرتا ہے جو مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کر دینے والا ہے۔ یہ بظاہر شر کی ایک صورت حال ہے۔ لیکن بار بار کا تجربہ بتاتا ہے کہ مسلمان اگر اس شر کو مٹانے کے لیے اٹھیں تو ایسا نہیں ہوتا کہ جلوس کا خاتمہ ہو جائے۔ اس کے بجائے عملاً جو چیز پیش آتی ہے وہ یہ کہ جلوس کا معاملہ بڑھ کر فساد کا معاملہ بن جاتا ہے۔

گویا اس مسئلہ میں مسلمانوں کے لیے واقعی انتخاب جلوس اور بے جلوس میں نہیں ہے۔ بلکہ جلوس اور فساد میں ہے۔ اب مذکورہ اسلامی اصول کے مطابق، عقل مند وہ ہے جو جلوس کو گوارہ کر لے تاکہ وہ ہلاکت خیز فساد سے بچ جائے۔

موجودہ دنیا میں تمام معاملات کا حال یہی ہے۔ یہاں اکثر اوقات کم شر اور زیادہ شر کے درمیان انتخاب کا مسئلہ رہتا ہے نہ کہ خالص شر اور خالص خیر کے درمیان۔

عقل کی بات

حضرت ایوب علیہ السلام کا قصہ قرآن میں مختصر طور پر اور بائبل میں مفصل طور پر بیان ہوا ہے۔ وہ حضرت مسیح علیہ السلام سے کئی سو سال پہلے شام و فلسطین کے درمیانی علاقہ میں پیدا ہوئے۔ بائبل میں اس جگہ کا نام عوض (Uz) بتایا گیا ہے۔

بائبل کا بیان ہے کہ حضرت ایوب کے یہاں سات ہزار بھیڑیں اور تین ہزار اونٹ اور پانچ سو جوڑی بیل اور پانچ سو گدھے اور بہت سے نوکر چاکر تھے، ایسا کہ اہل مشرق میں وہ سب سے بڑا آدمی تھا۔ کچھ عرصہ بعد ایسی آفتیں آئیں کہ حضرت ایوب کا تمام مال و دولت ختم ہو گیا۔ وہ بالکل مفلس ہو گیے۔ تاہم انھوں نے صبر کیا۔ بائبل کے الفاظ میں :

تب ایوب نے اٹھ کر اپنا پیراہن چاک کیا اور سر منڈایا اور زمین پر گر کر سجدہ کیا۔ اور کہا ننگا میں اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا اور ننگا ہی واپس جاؤں گا۔ خداوند نے دیا اور خداوند نے لے لیا۔ خداوند کا نام مبارک ہو (ایوب، باب ۱)

کچھ سالوں کے بعد حالات بدلے۔ حضرت ایوب کے پاس دوبارہ ہر قسم کا مال و اسباب مزید اضافہ کے ساتھ جمع ہو گیا۔ بائبل کا بیان ہے : اور خداوند نے ایوب کو جتنا اس کے پاس پہلے تھا اس کا دو چند دیا۔ یوں خداوند نے ایوب کے آخری ایام میں ابتدا کی نسبت زیادہ برکت بخشی۔ اس کے پاس چودہ ہزار بھیڑ بکریاں اور چھ ہزار اونٹ اور ہزار جوڑی بیل اور ہزار گدھے ہو گیے (ایوب، باب ۴۲)

قرآن میں اس واقعہ کا تفصیلی ذکر نہیں۔ البتہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک نہایت اہم اور سبق آموز بات بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ ایوب کو ہم نے دوبارہ سب چیز دیدی، اور اس واقعہ میں نصیحت ہے عقل والوں کے لیے (وذکریٰ لاولی الالباب، ص ۴۳)

اس مختصر فقرہ کے بہت سے پہلو ہیں۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس دنیا میں آدمی کو اگر محرومی کا تجربہ ہو تو اس کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ خدا نے اپنی رحمت سے اس دنیا کا نظام اس طرح بنایا ہے کہ یہاں کوئی محرومی آخری محرومی نہیں۔ یہاں ہر محرومی کے بعد دوبارہ یافت ہے۔ ہر کھونے کے بعد دوبارہ پانا ہے۔ بشرطیکہ آدمی صبر کرے اور خدا کے اعتماد پر اپنی جدوجہد کو برابر جاری رکھے۔

بزدلی نہیں اخلاق

ایک صاحب نے کہا کہ میں آپ کا الرسالہ پڑھتا ہوں۔ مگر اس کی ایک بات مجھے پسند نہیں۔ آپ مسلمانوں کو ہمیشہ صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ تو بزدلی ہے۔ کیا آپ سارے مسلمانوں کو بزدل بنا دینا چاہتے ہیں۔

یہ صاحب ایک چھوٹے دکاندار ہیں۔ وہ عام ضرورت کی چیزیں بیچتے ہیں۔ ایک روز میں ان کی دکان پر گیا۔ میں وہاں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک لڑکا آیا۔ اس کے ہاتھ میں دیاسلائی تھی، اس نے دیاسلائی کی ڈبیہ زور سے ان کی طرف پھینکی اور بگڑ کر کہا: اس پر آپ ۶۰ تیلی لکھے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ اس میں صرف ۵۰ تیلیاں ہیں۔

لڑکے نے گستاخی بھی کی تھی اور جارحیت بھی۔ مگر دکان دار نے اس کے خلاف کچھ نہیں کہا۔ بس خاموشی کے ساتھ دوسری ڈبیہ نکال کر اس کو دیدی۔ نرمی کے ساتھ صرف اتنا کہا: کوئی بات نہیں، دوسری لے جاؤ۔

لڑکا جب چلا گیا تو میں نے دکاندار سے پوچھا کہ لڑکے نے اتنی سخت بدتمیزی کی، مگر آپ کچھ نہیں بولے۔ دکاندار نے کہا کہ پہلے میں خوب بولتا تھا، بلکہ گاہکوں سے لڑائی کر لیتا تھا، مگر اس کے بعد کیا ہوا کہ میری دکانداری ختم ہوگئی۔ پھر میں نے ایک بنیا کو دیکھا کہ وہ کیا کرتا ہے، اس کی دکان خوب چل رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ گاہکوں سے کبھی نہیں الجھتا۔ وہ گاہک کی ہر الٹی بات کو نظر انداز کر کے اس سے معاملہ کرتا ہے۔ میں بھی ایسا ہی کرنے لگا۔ اب خدا کے فضل سے میری دکان چلنے لگی۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ اچھی چل رہی ہے۔

دکاندار کی بات میں خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ آخر میں میں نے کہا: بھائی صاحب، مجھ میں اور آپ میں صرف ایک لفظ کا فرق ہے۔ آپ تجارتِ دنیا کے لیے بزدل بنے ہوئے ہیں، میں تجارتِ آخرت کے لیے بزدل بن جانا چاہتا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کا معاملہ "بزدلی" نہیں، وہ ایک اخلاقی اصول ہے۔ وہ بے عملی نہیں بلکہ عین عمل ہے۔ وہ ہار ماننا نہیں ہے بلکہ سب سے بڑی جیت کی طرف قدم بڑھانا ہے۔ وہ کھونا نہیں بلکہ پانا ہے۔ وہ کسی آدمی کے سامنے جھکنا نہیں ہے بلکہ رب العالمین کے سامنے اپنے آپ کو جھکانا ہے۔

جو لوگ صبر کی اہمیت کو نہیں سمجھتے، اس کا سبب صرف ان کی ناسمجھی اور کوتاہ بینی ہے نہ کہ ان کی معاملہ فہمی اور سمجھداری۔

ایک اور اقلیت

مسٹر بی ایم بھاٹیا کا ایک مضمون ٹائمس آف انڈیا (۲ جنوری ۱۹۸۹) میں شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا ـــــ ہندستان میں دو قومیں ہیں، ایک مغربی تعلیم یافتہ، اور دوسرے بقیہ لوگ:

Two Nations In India: Western Educated And Others

مضمون میں بتایا گیا تھا کہ مارکس نے صاحب جائداد اور بے جائداد کی بنیاد پر انسانوں کو دو طبقہ میں تقسیم کیا ہے۔ ہندستان میں ایسی کوئی تقسیم موجود نہیں۔ البتہ ایک اور تقسیم ہے جس نے ہندستان کو ایک طبقاتی سماج (Class society) بنا دیا ہے۔ ان میں سے ایک انگریزی تعلیم یافتہ مغربی طبقہ (English educated, westernised class) ہے۔ اور دوسرا عوام کا طبقہ جو جاہل یا غیر انگریزی تعلیم یافتہ ہے۔ ثانی الذکر طبقہ ملک کی ۸۰ فی صد آبادی پر مشتمل ہے۔ جب کہ اول الذکر طبقہ بمشکل پوری آبادی کا ۲۰ فی صد حصہ ہے۔

ملک کی دولت کا ۵۰ فی صد حصہ اسی ۲۰ فی صد آبادی کے پاس ہے۔ وہی انتظامی عہدوں پر قابض ہے، اسی کے ہاتھ میں ملک کی صحافت ہے۔ وہی تمام علمی اور تعلیمی اداروں پر چھایا ہوا ہے۔ وہی عملاً، براہ راست یا بالواسطہ طور پر، پورے ملک کو چلا رہا ہے۔ ہندستان میں انگریزی تعلیم برٹش انڈیا کمپنی نے ۱۸۳۵ میں شروع کی تھی۔ اب ڈیڑھ سو سال بعد یہ طبقاتی عمل اپنی آخری حد (Culmination) پر پہونچ چکا ہے۔ ۱۹۴۷ میں ہندستان کی آزادی طبقاتی تقسیم کے اس عمل کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ (صفحہ ۶)

اس واقعہ کا ایک پہلو وہ ہے جس کو مسٹر بھاٹیا نے بیان کیا ہے۔ تاہم اس میں ایک خوش آئند پہلو بھی ہے۔ اس تقسیم نے اس ملک میں کسی حقیقی اصلاحی کام کو بہت زیادہ آسان بنا دیا ہے۔ آپ یہاں کی آبادی کے ۲۰ فی صد حصہ پر کام کر کے پوری آبادی تک پہونچ سکتے ہیں۔ آپ غالب اقلیت پر براہِ راست اشاعت افکار کا کام کیجئے، اور بقیہ ۸۰ فی صد اکثریت تک آپ کی دعوت بالواسطہ انداز میں پہونچ جائے گی ـــــ ہر تاریک پہلو میں ایک روشن پہلو چھپا ہوا ہوتا ہے، بشرطیکہ استعمال کرنے والے اس کو استعمال کر سکیں۔

ذہنی تربیت

اسلام سے پہلے کے دور کو جاہلیت کا دور کہا جاتا ہے۔ جاہلیت سے مراد جہالت نہیں ہے بلکہ اس سے مراد بے خبری ہے۔ اسلام کے ظہور سے پہلے عرب کے لوگ بے خبری کے دور میں تھے، اسلام نے ان کو باخبری کے دور میں پہنچا دیا۔ اسلام سے پہلے وہ بے شعوری کی حالت میں زندگی گزار رہے تھے۔ اسلام نے ان کی ذہنی تربیت کر کے انھیں اس قابل بنایا کہ وہ باشعور زندگی گزار سکیں۔

اس معاملہ کی ایک مثال یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کے لوگ لڑنے بھڑنے کو کمال سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ اکثر لڑتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ صحیح اور غلط، اپنے اور غیر کی تفریق کے بغیر انھوں نے لڑنے کو بذاتِ خود اپنا مقصود بنالیا تھا۔ ایک جاہلی شاعر فخر کے ساتھ کہتا ہے کہ کبھی ہم خود اپنے بھائی بنوبکر پر حملہ کر دیتے ہیں جبکہ لڑنے کے لیے کوئی دوسرا موجود نہیں ہوتا:

و احیاناً علیٰ بکرٍ أخینا اذا مالم نجد الّا اخانا

اسلام نے ان کی ذہنی اور فکری تربیت کر کے ان کے اندر یہ صلاحیت پیدا کی کہ وہ ایک اور دوسرے میں فرق کریں۔ وہ حق کے پرستاروں اور حق سے بغاوت کرنے والوں کے درمیان تمیز کریں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بتایا گیا کہ وہ منکرین پر سخت اور آپس میں نرم ہیں (اشداء علی الکفار رحماء بینھم) الفتح ۲۹

قرآن کی اس آیت کی تشریح شاہ عبدالقادر صاحب نے مختصر طور پر اس طرح کی ہے ——— جو تندی اور نرمی اپنی خو ہو، وہ سب جگہ برابر چلے۔ اور جو ایمان سے سنور کر آئے، وہ تندی اپنی جگہ اور نرمی اپنی جگہ۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کس طرح آدمی کے ذہن کی تربیت کرتا ہے اور اس کے مزاج کو منفی رخ سے مثبت رخ کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اسلام آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ صحیح اور غلط کے فرق کو سمجھے۔ وہ یہ جانے کہ کہاں بولنا ہے اور کہاں چپ رہنا ہے۔ کہاں لڑنا ہے اور کہاں برداشت کرنا ہے۔ کہاں اقدام کرنا ہے اور کہاں یہ کوشش کرنا ہے کہ اقدام کی نوبت نہ آئے۔

طلبہ کے نام

ایک عربی درس گاہ کے طلبہ کو ایک بار مجھے خطاب کرنے کا موقع ملا۔ میں نے کہا کہ صحیح ابن حبان میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے ایک روایت آئی ہے۔ اس میں مسلم عاقل کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کو اپنے زمانہ سے باخبر ہونا چاہیے (ان یکون بصیراً بزمانہ)

یہ ایک بے حد اہم ہدایت ہے۔ اس کے مطابق آپ کو چاہیے کہ آپ صرف واقفِ دین نہ بنیں بلکہ اسی کے ساتھ واقفِ زمانہ بھی بنیں۔ اس کے بعد ہی آپ موجودہ زمانہ میں دین کی صحیح خدمت کر سکتے ہیں۔

واقفِ زمانہ بننے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ مسلمانوں کے خلاف ہونے والے "ظلم اور سازش" کو جاننے کے ماہر بن جائیں۔ یہ میرے نزدیک سطحیت ہے نہ کہ علم۔ یہ ظواہر کو جاننا اور حقائق سے بے خبر رہنا ہے۔ اور علم بلاشبہ یہ ہے کہ آدمی اصل حقیقت کو جانے، نہ یہ کہ اس کی نگاہ ظاہری چیزوں میں اٹک کر رہ جائے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ دوسری قومیں مسلمانوں کے خلاف سازش اور ظلم میں مصروف ہیں۔ تب بھی اصل جاننے کی بات یہ ہے کہ وہ کیا اسباب ہیں جنھوں نے ان قوموں کو یہ حیثیت دیدی ہے کہ وہ ہمارے خلاف کامیاب سازشیں کر سکیں۔ وہ ہمارے خلاف اپنے ظالمانہ منصوبوں کی کامیاب تعمیل کریں اور ہمارے تمام اعاظم واکابر اس کو روکنے میں مکمل طور پر عاجز ثابت ہوں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی اصل کمی یہ ہے کہ وہ عصر حاضر سے بالکل ناواقف ہیں۔ وہ گزرے ہوئے ماضی کے واقعات کو جانتے ہیں۔ مگر آج کے واقعات کی انھیں مطلق خبر نہیں۔ ان میں سے کوئی شخص اگر کچھ جانتا ہے تو وہ بھی ظاہری نتائج کو جانتا ہے نہ کہ نتائج کے اصل اسباب کو۔

مدارسِ دینیہ کے طلبہ اگر صرف "حیوان کاسب" بن کر نہیں رہنا چاہتے، بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو اسلام اور ملتِ اسلام کے احیا میں مفید طور پر لگائیں تو ان پر لازم ہے کہ وہ عصرِ حاضر کو اس کی گہرائیوں کے ساتھ جانیں، وہ موجودہ زمانہ کی ان تبدیلیوں سے واقفیت حاصل کریں جنھوں نے ہمارے مروجہ طریقوں کو عملی اعتبار سے بالکل غیر موثر بنا کر رکھ دیا ہے۔

سادگی میں عظمت

ایک مرتبہ میں ایک قصبہ میں گیا۔ وہاں ایک مسجد میں چند بار نماز پڑھی۔ میں نے دیکھا کہ اس مسجد کے جو امام ہیں، وہ لوگوں کے درمیان نہایت محبوب ہیں۔ لوگ ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔ وہ جو بات کہہ دیں، اس کو تمام لوگ فوراً مان لیتے ہیں۔ میں نے مختلف لوگوں سے پوچھا کہ امام صاحب کی اس مقبولیت کا سبب کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ اسلام کے کچھ سادہ اصولوں پر پابندی سے عمل کرتے ہیں۔ اور یہی ان کی مقبولیت اور محبوبیت کا راز ہے۔

امام صاحب کا معمول تھا کہ وہ اذان سنتے ہی اپنے گھر سے نکل پڑتے تھے۔ مؤذن کے آخری کلمات کے ساتھ وہ مسجد میں داخل ہو جاتے۔ یہ گویا خدا کی پکار پر فی الفور دوڑ پڑنا ہے۔ اور جس آدمی کا یہ حال ہو کہ وہ خدا کی پکار پر فوراً دوڑ پڑے تو لوگ بھی اس کی طرف دوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح امام صاحب کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ سلام میں پہل کرتے تھے۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا تھا کہ کوئی شخص سلام کرنے میں ان پر سبقت لے جائے۔ جو شخص اس طرح لوگوں کو سلام کرنے لگے، وہ گویا لوگوں کے حق میں اپنے جذبۂ محبت کا اظہار کرتا ہے۔ اور جس آدمی کے دل میں دوسروں کے لیے محبت ہو دوسرے لوگ بھی اس سے محبت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں

امام صاحب کی ایک اور صفت یہ تھی کہ وہ کبھی کسی سے سوال نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنی آمدنی کے بقدر نہایت سادگی اور قناعت کی زندگی گزارتے تھے۔ یہ طریقہ بھی اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ دوسروں سے سوال کرنے والا دوسروں سے چھوٹا بن جاتا ہے۔ اور جو شخص دوسروں سے سوال نہ کرے، وہ دوسروں کو اپنے سے بڑا دکھائی دینے لگے گا۔

امام صاحب کی ایک عادت یہ تھی کہ وہ صرف بقدر ضرورت کلام کرتے تھے۔ وہ دوسروں کی بات زیادہ سنتے اور خود کم بولتے، اور جو کچھ بولتے، سوچ سمجھ کر بولتے۔ یہ بھی ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کم بولنا آدمی کو باوزن بناتا ہے اور زیادہ بولنا آدمی کو ہلکا کر دیتا ہے۔

یہ اصول سب کے سب نہایت سادہ اصول ہیں۔ وہ بظاہر بہت معمولی ہیں۔ مگر وہ جس انسان کے اندر پیدا ہو جائیں، اس کو وہ غیر معمولی انسان بنا دیتے ہیں۔

تجارتی شرکت

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکہ میں پیدا ہوئے۔ مکہ کے لوگ اس زمانہ میں زیادہ تر تجارت کیا کرتے تھے۔ آپ نے بھی نبوت سے پہلے تجارت فرمائی اور اس سلسلہ میں لوگوں کے ساتھ شرکت کے معاملات کیے۔ اس سلسلہ میں کچھ واقعات سیرت اور حدیث کی کتابوں میں نقل کیے گیے ہیں۔

عبداللہ بن سائب مکہ کے باشندہ تھے۔ انھوں نے بعد کو اسلام قبول کیا۔ عبداللہ بن سائب کہتے ہیں کہ میں جاہلیت کے زمانہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا شریک تجارت تھا۔ ہجرت کے بعد مدینہ آکر میں آپ سے ملا۔ آپ نے پوچھا کہ مجھ کو پہچانتے ہو۔ میں نے کہا کیوں نہیں۔ آپ کے ساتھ تو میری تجارتی شرکت تھی۔ اور آپ کتنے اچھے شریک تھے۔ آپ نہ کبھی دھوکا دیتے تھے اور نہ کسی بات پر جھگڑتے تھے (کنت شریکی فنعم الشریک لا تداری ولا تماری)

اسی طرح قیس بن سائب مخزومی کہتے ہیں کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں آپ کی شرکت میں تجارت کی ہے۔ آپ بہترین شریک تجارت تھے۔ آپ نہ جھگڑتے تھے اور نہ کسی قسم کا منافشہ کرتے تھے (وکان خیر شریک لا یماری ولا یشاری)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاجرانہ شرکت کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے اور اس کو برقرار رکھنے کے لیے کیا چیز درکار ہے۔ یہ دو چیزیں ہیں ——— باہمی اعتماد کو باقی رکھنا، اور نظر انداز کرنے کی پالیسی اختیار کرنا۔

جب بھی دو یا دو سے زیادہ آدمی مل کر کاروبار کریں تو ایسے مواقع آتے ہیں جب کہ ایک آدمی دوسرے کو فریب دے کر ذاتی نفع حاصل کرے۔ ایسی روش شریکوں کے درمیان اعتماد کو ٹھیس پہونچاتی ہے۔ اور شرکت کو برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جو شخص تجارتی شرکت کو باقی رکھنا چاہتا ہو، اس پر لازم ہے کہ وہ ایسے ہر فعل سے انتہائی حد تک اپنے آپ کو بچائے۔

اسی طرح تاجرانہ شرکت میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کوئی اختلافی صورت پیش آتی ہے۔ ایسے مواقع پر نزاع اور تکرار سے بچ کر وسعت ظرف کا معاملہ کرنا چاہیے۔ اختلافی مسائل پر نزاع سے شرکت ٹوٹتی ہے، اور اختلافی مسائل میں عالی ظرفی کا طریقہ اختیار کرنے سے شرکت برقرار رہتی ہے۔

یقینی کامیابی

ایک بُت پرست دکاندار کو میں نے دیکھا کہ وہ روزانہ صبح کو پتھر کی بنی ہوئی مورتی کو پوجتا ہے۔ اور اس کے بعد بازار جا کر اپنی دکان کھولتا ہے۔ وہ اپنی دکان داری میں کافی کامیاب تھا۔

ایک روز میں نے اس سے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ یہ ہمارے دیوتا ہیں۔ جب ہم ان کی پوجا کر لیتے ہیں تو ہم کو پورا وشواش ہو جاتا ہے کہ اب ہم ان کی مدد سے ضرور کامیاب ہوں گے۔ یہ دیوتا ہمارے لیے سرچشمۂ اعتماد (Source of confidence) ہیں۔

کامیابی کا سب سے بڑا راز صرف ایک ہے۔ اور وہ اعتماد ہے۔ ایک شخص اگر فرضی اور بے حقیقت دیوتاؤں کی بنیاد پر بھی اپنے اندر اعتماد کا جذبہ پیدا کر لے تو وہ بھی اس دنیا میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر کسی شخص کو سچے خدا پر یقین ہو اور اس کی بنیاد پر اس کے اندر اعتماد کی کیفیت پیدا ہو جائے تو وہ اپنے منصوبوں میں کتنا زیادہ کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ مَن صَلّی الصبح فهو فی ذمّۃ اللّٰہ یعنی جس شخص نے صبح کی نماز ادا کر لی وہ اللہ کی ذمہ داری (Guarantee) میں آگیا۔ گویا صبح (فجر) کی نماز پورے دن کے لیے آدمی کو مالکِ کائنات کی سرپرستی اور نگرانی میں دیدیتی ہے۔ اس کے بعد یہ خدا کا ذمہ ہو جاتا ہے کہ وہ ہر خطرہ کے موقع پر آدمی کی حفاظت کرے، وہ ہر ممکن مدد کے ذریعہ اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچائے۔

آدمی رات کے وقت آرام کرتا ہے۔ اس کے بعد صبح ہوتی ہے تو وہ تیار ہو کر اپنے کام کے لیے گھر سے باہر جاتا ہے۔ اب اگر آدمی اپنے اندر خدائے واحد کا یقین پیدا کرے اور رات گزار کر صبح کو اٹھے تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کر کے باہر نکلے تو وہ پورے اعتماد کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوگا۔ اس کا دل اس سے کہے گا کہ کامیابی تمہارے لیے مقدر ہو چکی ہے۔ اب تمہارے لیے ناکامی کا کوئی سوال نہیں۔

جو آدمی اس اعتماد کے ساتھ زندگی کے کاروبار میں داخل ہو وہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ محنت کرے گا۔ وہ دشوار گزار راستہ میں بھی اس یقین کے ساتھ گھستا چلا جائے گا کہ اس کے دوسری طرف یقینی کامیابی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔

ایسے آدمی کے لیے خدا کی اس دنیا میں کامیابی کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔

فرض کی ادائیگی

ظل عباس عباسی صاحب (پیدائش ۱۳۴۴ھ) ایک صحافی ہیں۔ وہ مختلف اخبارات میں کام کرتے رہے ہیں۔ ۱۹۸۲ء سے وہ اخبار ملاپ (دہلی) سے وابستہ ہیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۹۰ کی ملاقات میں انھوں نے ایک واقعہ بتایا جس میں بہت بڑا اسبق ہے۔

ظل عباس عباسی صاحب جب ملاپ کے دفتر میں آئے تو ان کے لیے جمعہ کی نماز کا مسئلہ پیدا ہوا۔ وہ اخبار کے مینجر مسٹر پریم ناتھ چوپڑا (۵۸ سال) کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ میں جمعہ کے دن نماز کے لیے مسجد جاؤں گا۔ اس میں جتنی دیر لگے گی، اتنی دیر مزید کام کر کے میں اپنا چھ گھنٹہ کارکردگی کا وقت پورا کردوں گا۔ مسٹر چوپڑا نے انھیں فوراً اجازت دے دی۔

ظل عباس عباسی صاحب نہایت پابندی کے ساتھ اپنے قول پر عمل کرتے رہے۔ وہ ہر جمعہ کو نماز کے وقت آفس سے چلے جاتے اور جتنی دیر انھیں لگتی، اتنی دیر مزید کام کر کے اپنے اوقاتِ کارکردگی کو پورا کر دیتے۔

ہفتے اور مہینے گزرتے رہے۔ یہاں تک کہ رمضان کا زمانہ آگیا، ابھی رمضان کا مہینہ شروع ہونے کو چند دن باقی تھے کہ مسٹر پریم ناتھ چوپڑا جناب ظل عباس عباسی صاحب کے کمرہ میں آئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے روزے شروع ہونے والے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ آپ روزہ رکھتے ہیں۔ اب آپ اپنے اوقات تبدیل کر کے اس طرح کرلیں کہ آپ کو کوئی زحمت نہ ہو۔ ہماری طرف سے اجازت ہے کہ آپ جب چاہے آئیں اور جب چاہے جائیں۔ رمضان کے مہینہ بھر آپ کے اوپر دفتری اوقات کی پابندی لازم نہ ہوگی۔

جس طرح نماز کی ادائیگی ایک فریضہ ہے، اسی طرح یہ بھی ایک فریضہ ہے کہ آدمی اپنی ڈیوٹی کو پوری طرح ادا کرے۔ اگر نماز پڑھنے والے اس حقیقت کو جانیں اور اپنے اندر دونوں صفات پیدا کرلیں تو نماز ان کے لیے بیک وقت دو عظیم فائدوں کا ذریعہ بن جائے گی۔ ایک طرف وہ ان کے اندر روحانی صفت پیدا کر کے انھیں خدا سے قریب کرے گی۔ دوسری طرف ان کے اندر وہ اخلاقی صفت پیدا کرے گی جس کے ذریعہ وہ بندوں کی نظر میں محبوب و مقبول بن جائیں۔

تخلیقیت

موجودہ دنیا مختلف قسم کے اسباب اور احوال سے بھری ہوئی ہے۔ یہ اسباب اور احوال ہم سے الگ اپنا وجود رکھتے ہیں اور آپ اپنے زور پر قائم ہیں۔ ہم ان سے ہم آہنگی کرکے اپنا مقصد حاصل کرسکتے ہیں، ان کو نظر انداز کرکے منزلِ مقصود تک پہونچنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔

اس صورت حال کے تقاضوں میں سے ایک تقاضا یہ ہے کہ آدمی کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ پیش آمدہ حالات کے اعتبار سے پورے معاملہ پر از سرِ نو غور کرسکے۔ وہ مسئلہ کا نیا حل دریافت کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔ اسی معنی میں ایک فرانسیسی مفکر (Emile Chartier) نے کہا ہے کہ کوئی چیز اس سے زیادہ خطرناک نہیں کہ آدمی اپنے پاس صرف ایک ہی تصور رکھتا ہو:

Nothing is more dangerous than an idea
when it is the only one we have.

اکثر حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ کے حل کے لیے ہماری ابتدائی تدبیر غیر موثر ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ ہم اپنی سابقہ سوچ کے دائرہ سے نکل کر کوئی نئی تدبیر اختیار کرسکیں۔ اسی صلاحیت کا نام تخلیقیت (Creativity) ہے۔ اور اسی تخلیقی صلاحیت میں آدمی کی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس اصول کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر آپ دشمنوں سے لڑے۔ مگر غزوۂ احزاب کے موقع پر آپ نے اپنے اور دشمن کے درمیان خندق کی رکاوٹ قائم کر دی۔ غزوۂ احد میں آپ نے اپنے مخالفین سے باقاعدہ جنگ کی اور حدیبیہ کے موقع پر جنگ کیے بغیر واپس چلے آئے۔ غزوۂ حمراء الاسد میں آپ نے اعلان و اظہار کے ساتھ مارچ کیا اور فتح مکہ کے سفر میں مکمل خاموشی کا طریقہ اختیار فرمایا، وغیرہ۔ اس تخلیقیت میں جو شخص جتنا زیادہ بڑھا ہوا ہوگا، اس دنیا میں وہ اتنی ہی زیادہ بڑی کامیابی حاصل کرے گا۔

ایک نمونہ

مسٹر ششی پرشاد گوئل (۲۲ سال) میرٹھ کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۸۹ کے سول سروسز امتحانات میں انھوں نے ٹاپ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آئی اے ایس میں شرکت سے ان کا مقصد روپیہ کمانا نہیں ہے۔ بلکہ اس جاب کی باعزت حیثیت (Dignified status) ان کے لیے کشش کا باعث ہوئی۔

مسٹر گوئل کا ایک انٹرویو ٹائمس آف انڈیا (۸ جون ۱۹۸۹) میں چھپا ہے۔ اس میں انھوں نے جو باتیں کہیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ سول سروس میں داخل ہونے کا ذہن ان کے اندر اس وقت بنا جب کہ انھوں نے مسٹر جاوید عثمانی کا انٹرویو پڑھا۔ مسٹر عثمانی نے محض اپنی ذاتی محنت سے ۱۹۸۱ کے سول سروس امتحان میں ٹاپ کیا تھا۔ وہ ان کے نمونہ سے اتنا زیادہ متاثر ہوئے کہ اس وقت سے ان کا یہ ذہن بن گیا کہ ایک شخص سول سروس کے ذریعہ قوم کی زیادہ بہتر خدمت کر سکتا ہے:

> His mind was made up after he read the interview of Mr. Javed Usmani, the topper in the civil services examinations in 1981. "I was so inspired by his example that since that day I have thought that one can serve the nation best only through the civil services" (p. 3).

مسٹر جاوید عثمانی کے پاس کہنے کے لیے اگر یہ ہوتا کہ اس ملک میں تعصب ہے، یہاں ان کے لیے ترقی کے مواقع نہیں ہیں، تو مسٹر گوئل کو ان کے کلام سے کوئی تحریک نہ ملتی۔ مگر جب انھوں نے تعصب کو نظر انداز کر کے محنت کو ترقی کا زینہ بتایا تو مسٹر گوئل کو اس میں خود اپنی ترقی کا نسخہ مل گیا۔ اس کو اختیار کر کے وہ ایک باعزت عہدہ تک پہونچ گئے۔

آج مسلمان اس ملک میں احتجاجی گروہ (Protestant group) بنے ہوئے ہیں۔ اگر وہ مسٹر جاوید عثمانی کی طرح اپنی افادیت ثابت کریں تو وہ اس ملک میں تخلیقی گروہ (Creative group) بن جائیں گے۔ احتجاجی لوگ نہ اپنے آپ کو کچھ دیتے ہیں اور نہ دوسروں کو۔ مگر جو لوگ تخلیقی گروہ کی حیثیت حاصل کر لیں وہ خود بھی پاتے ہیں اور دوسروں کو بھی دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے اس ملک میں تخلیقی گروہ بننے کے امکانات پوری طرح موجود تھے۔ مگر ان کے لیڈروں کی جھوٹی سیاست نے انھیں اس کے سوا کسی قابل نہ رکھا کہ وہ اس ملک میں بے اثر احتجاجی گروہ بن کر رہ جائیں۔

دے کر پانا

ڈاکٹر تارا چند کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "ہندستانی کلچر پر اسلام کے اثرات"
سو تین سو صفحہ کی یہ کتاب ایک مفید اور منصفانہ کتاب ہے اور ہر شخص کو اسے پڑھنا چاہیے۔ اس
کتاب کے ایک حصہ میں فاضل مصنف نے دکھایا ہے کہ ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں
مسلمان تاجر جنوبی ہند کے ساحل پر اترے تو یہاں ان کو زبردست اہمیت (Great importance)
حاصل ہو گئی۔ مقامی لوگوں نے ان کو "ماپلا" کا خطاب دیا جس کے معنی عظیم فرزند کے ہوتے ہیں
تقریبات کے موقع پر مسلمان نمبوتری برہمن کے ساتھ بٹھائے جاتے تھے۔ یہ ایک ایسا اعزاز تھا
جو اس وقت نائر لوگوں کو بھی حاصل نہ تھا (۳۵) وغیرہ وغیرہ

کالی کٹ کے راجہ زمورن نے ان عرب مسلمانوں کی غیر معمولی قدر و منزلت کی۔ حتی کہ اس
نے واضح طور قبول اسلام کی حوصلہ افزائی کی تاکہ اسے اپنے ان جہازوں کے لیے کارکن مل سکیں
جن پر اس کی عظمت و ترقی کا انحصار تھا۔ اس نے یہ حکم دے دیا کہ اس کی مملکت میں ماہی گیروں کے
ہر گھرانے میں سے ایک یا دو مرد افراد کی تربیت مسلمان کی حیثیت سے کی جائے:

> The Zamorin thought so highly of the Muslims that he definitely encouraged conversion in order to man the Arab ships on which he depended for his aggrandizement. He gave orders that in every family of fishermen (Makkuvans) in his dominion one or more of the male members should be brought up as Muhammadans.
>
> Dr. Tara Chand, *Influence of Islam on Indian Culture*, The Indian Press Ltd., Allahabad, 1963, p. 36

یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب کہ عرب مسلمان جہاز رانی میں ساری دنیا پر فوقیت رکھتے تھے۔
اپنی اس امتیازی خصوصیت کے ساتھ جب وہ ہندستان کے ساحل پر اترے تو یہاں کے ذمہ داروں
کو محسوس ہوا کہ وہ ہماری بحری ضرورت ہیں۔ ان کے ذریعہ ہم اپنی ترقی میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ
ابتدائی مسلمان اہل ہند کے لیے قیمتی سرمایہ بن گئے۔ انھوں نے دوسروں کو دیا، اس لیے دوسروں
نے بھی انھیں دیا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمان صرف دوسروں سے مانگ رہے ہیں، اس لیے
وہ ابتک پانے والے بھی نہیں بنے۔ موجودہ دنیا میں دینے والے کو دیا جاتا ہے نہ کہ مانگنے والے کو۔

ایک مثال

ڈاکٹر ایم خلیل اللہ امراض قلب کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ وہ اس وقت نئی دہلی کے گوبند بلبھ اسپتال میں ڈائرکٹر ہیں۔ انھوں نے اندرون ملک ہندستان کا پہلا پیس میکر (Pacemaker) تیار کیا ہے۔ یہ وہ طبی آلہ ہے جو دل کی حرکت کو مصنوعی طور پر باقاعدہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جب کہ اس کا قدرتی نظام کام نہ کر رہا ہو۔ ان کی اس قسم کی ممتاز طبی خدمات کی بنا پر ناگپور یونیورسٹی نے ان کو ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری عطا کی ہے۔

ڈاکٹر خلیل اللہ کو یہ اعزاز ناگپور یونیورسٹی کے ۷۵ ویں کنونشن پر وائس چانسلر ڈاکٹر مدھو سودن چن سرکار نے ۵ جنوری ۱۹۸۸ کو پیش کیا۔ کنونشن کے مہمان خصوصی لوک سبھا کے اسپیکر مسٹر بلرام جاکھڑ تھے۔

ڈاکٹر خلیل اللہ نے ایک جدید برقی لیبارٹری قائم کرکے امراض قلب کی تشخیص میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کو ۱۹۸۴ میں پدم شری کا ایوارڈ دیا گیا تھا۔ اسی سال انھیں بی سی رائے قومی ایوارڈ بھی ملا۔ ڈاکٹر خلیل اللہ نے کئی نصابی کتابوں کی تیاری میں حصہ لیا ہے اور قومی اور بین اقوامی طبی جرنل میں ان کے ۱۲۰ مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ (قومی آواز ۶ جنوری ۱۹۸۸)

"ایم خلیل اللہ" اگر ڈاکٹر کی ڈگری لینے کے لیے مطالبات کی مہم چلاتے۔ وہ جلسوں اور تقریروں کے ذریعہ یہ مانگ کرتے کہ مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دو تو کوئی یونیورسٹی ان کی طرف توجہ نہ کرتی۔ مگر جب انھوں نے ممتاز کام کرکے اپنے آپ کو ڈگری کا مستحق ثابت کر دیا تو مانگ کے بغیر ان کو ڈگری مل گئی۔ آدمی اگر واقعی معنوں میں کوئی قابل قدر کام کرے تو وہ قدر دانی پاکر رہتا ہے، خواہ وہ ایک فرقہ کا آدمی ہو یا دوسرے فرقہ کا۔

موجودہ دنیا کا نظام نفع بخشی کے اصول پر قائم ہے۔ یہاں سب سے زیادہ بے قیمت چیز مانگنا ہے اور سب سے زیادہ باقیمت چیز دینا۔ مانگنے والا اپنے گھر کے اندر بھی حقیر ہو جاتا ہے اور اپنے گھر کے باہر بھی۔ مگر جو شخص اپنے آپ کو دینے والا بنا لے وہ اپنوں کے اندر بھی عزت پائے گا اور اپنوں کے باہر بھی۔

ایک واقعہ

۶ ستمبر ۱۹۸۹ کو میں انبیٹھ (سہارن پور) میں تھا۔ وہاں ایک واقعہ معلوم ہوا جس میں بہت بڑا سبق ہے۔ اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر شاہد صابری (پیدائش 1951) نے بستی کے باہر ۱۹۸۵ میں ایک زمین خریدی۔ اس کا رقبہ تقریباً پانچ ایکڑ ہے۔ انھوں نے زمین حاصل کرنے کے بعد اس کے چاروں طرف مینڈ بنائی۔ اس زمین سے متصل یہاں کا مرگھٹ ہے۔ مینڈ بنانے کے بعد کچھ ہندوؤں نے اعتراض کیا کہ آپ نے مینڈ غلط بنائی۔ اس میں مرگھٹ کی زمین کا ایک حصہ شامل ہو گیا ہے۔ یہ اعتراض کرنے والے وہ افراد تھے جو مقامی طور پر متعصب اور فرقہ پرست کی حیثیت سے مشہور ہیں۔

ڈاکٹر شاہد صابری نے کہا کہ آپ لوگ پیمائش کرالیں اور جتنی زمین پیمائش میں نکلے، اس کا دگنا لے کر مرگھٹ میں شامل کر لیجئے۔ یہ کام آپ مجھ سے پوچھے بغیر خود سے کرلیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

اگست ۱۹۸۷ کا واقعہ ہے۔ ڈاکٹر شاہد صابری راستہ سے گزر رہے تھے کہ انھوں نے دیکھا کہ بہت سے ہندو آگے کی طرف جا رہے ہیں۔ ملاقات کے بعد انھوں نے بتایا کہ آج ہم آپ کی زمین کو ناپنے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر شاہد صاحب نے کہا کہ آپ لوگ ضرور جائیں اور ناپنے کے بعد مرگھٹ کی جو زمین ہماری طرف نکلے اس کو بلا بحث اس میں شامل کرلیں۔ ان لوگوں نے کہا کہ آپ بھی چلیے تاکہ آپ کے سامنے پیمائش کی جا سکے۔

ڈاکٹر شاہد صابری بھی کچھ دیر بعد اپنی زمین پر پہونچ گیے۔ انھوں نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ بلکہ ہندو صاحبان کو آزادانہ طور پر ناپنے کا موقع دیا۔ انھوں نے بار بار ناپا۔ یہاں تک کہ معلوم ہوا کہ ان کا شبہ غلط تھا۔ ڈاکٹر شاہد صاحب نے مینڈ بالکل صحیح بنائی ہے، بلکہ ایک طرف خود اپنی کچھ زمین مرگھٹ کی طرف چھوڑ دی ہے۔

اس واقعہ کا اتنا اثر ہوا کہ اس کے بعد مقامی ہندوؤں نے ڈاکٹر شاہد صابری سے کہا کہ آپ انبیٹھ کی چیرمینی کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ یہاں کے ہندو اور مسلمان دونوں آپ کا ساتھ دیں گے اور آپ بلا مقابلہ کامیاب ہو جائیں گے۔ مگر ڈاکٹر صابری نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔

پولیس بھی

ڈاکٹر ابو بکر صاحب (بمبئی) نے ۱۹ فروری ۱۹۹۰ کی ملاقات میں بتایا کہ مہاراشٹر کے ایک مقام پر تبلیغی جماعت کا بڑا اجتماع تھا۔ پولیس والے بھی اپنے طور پر انتظام کے لیے وہاں آئے۔ اجتماع کے بعد ڈاکٹر ابو بکر صاحب سے ایک پولیس افسر کی گفت گو ہوئی جو حسب ذیل ہے۔

پولیس افسر نے تمل زبان میں ان سے کہا کہ ہم یہاں دیکھ بھال کے لیے آئے تھے مگر آپ کے اجتماع کو دیکھنے اور سننے کے بعد میرا خیال یہ ہے کہ اگر دوسرے بھی آپ لوگوں کی طرح ہو جائیں تو پولیس کے انتظام کی کوئی ضرورت ہی نہ رہے گی۔

پولیس افسر نے کہا کہ میری یہ رائے محض تقریروں کو سن کر نہیں بنی ہے بلکہ عمل کو دیکھ کر بنی ہے۔ اس نے بتایا کہ مثلاً ایک بار تبلیغ کے لوگ وضو کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک شخص نے وضو کیا۔ اس کے بعد وہ اپنی گھڑی وہیں بھول کر نماز کے لیے چلا گیا۔ میں کنارے چپ چاپ کھڑا ہو گیا کہ دیکھوں اب کیا ہوتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ دوسرے لوگ وضو کرنے کے لیے آرہے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص کو وہ گھڑی ملی۔ اس نے گھڑی اٹھالی اور چلنے لگا۔ میں بھی پیچھے پیچھے چلا۔ یہاں تک کہ وہ آدمی اس خیمہ میں پہونچ گیا جہاں گم شدہ سامان جمع کرنے کا دفتر قائم تھا۔ آدمی نے گھڑی کو وہاں جمع کر دیا اور اس کے بعد نماز کے لیے چلا گیا۔

پولیس افسر نے کہا کہ آج کی دنیا میں لوگ دوسروں کی جیبوں سے گھڑی اور سامان نکالنے کی فکر میں رہتے ہیں مگر یہاں ایسے لوگ جمع ہیں جو دوسروں کی ملی ہوئی چیز کو بھی اپنی چیز نہ سمجھیں اور اس کو لے جاکر اصل مالک کے حوالے کر دیں۔ میری بھگوان سے پرارتھنا ہے کہ سب لوگ ایسے ہی ہو جائیں تاکہ دنیا سے جھگڑے اور فساد کا خاتمہ ہو جائے۔

اچھا اخلاق ہر ایک کو مسخر کر لیتا ہے، حتی کہ پولیس جیسے بدنام گروہ کو بھی۔ ایک جانور اخلاق سے غیر متاثر رہ سکتا ہے۔ مگر کوئی آدمی اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیوں کہ انسان کے اندر پیدائشی طور پر اخلاقی حس موجود ہے۔ انسان مجبور ہے کہ جب وہ کوئی اخلاقی واقعہ دیکھے تو اس سے اثر قبول کیے بغیر نہ رہے۔

اخلاق کا معیار

قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کسی سے تمہاری دشمنی ہو جائے تو تم ایسا مت کرو کہ اس کے ساتھ بے انصافی کرنے لگو، بلکہ تم ہر حال میں انصاف کرو۔ یہی بات تقویٰ کے مطابق ہے (لا یجرمنکم شنآن قوم علیٰ ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ)

مفسر ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے: یعنی کسی کا بغض تم کو نہ ابھارے کہ اس کے معاملہ میں تم انصاف کو چھوڑ دو۔ بلکہ ہر ایک کے معاملہ میں انصاف کرو خواہ وہ دوست ہو یا دشمن (ای لا یحملنکم بغض قوم علیٰ ترك العدل فیھم بل استعملوا العدل فی کل احد صدیقاً کان او عدواً)

اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ موجودہ دنیا میں تقوی کا سب سے زیادہ یقینی معیار ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان معتدل تعلقات ہوں تو دونوں بالکل ٹھیک نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں اعلیٰ اخلاق پر قائم ہیں۔ مگر کسی کے اخلاق کو جانچنے کا یہ صحیح معیار نہیں۔ کوئی شخص اخلاقی اعتبار سے کیسا ہے، اس کا اندازہ معتدل حالات میں نہیں ہوتا۔ اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ دونوں کے درمیان تلخی اور شکایت کی فضا پیدا ہو گئی ہو۔

ایک پھل اندر سے کیسا ہے، اس کا اندازہ آپ پھل کے چھلکے کو دیکھ کر نہیں کر سکتے۔ اس کا پتہ صرف اس وقت چلتا ہے جب کہ پھل کو توڑا جائے۔ اسی طرح کوئی انسان حقیقۃً کیا ہے، اس کا اندازہ معمول کے حالات میں نہیں ہوتا، بلکہ غیر معمولی حالات میں ہوتا ہے۔ جب آدمی کے ساتھ کوئی خلافِ مزاج واقعہ پیش آتا ہے، اسی وقت معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کیا تھا اور کیا نہیں تھا۔ عام حالات میں آدمی اپنے آپ کو چھپائے رہتا ہے۔ مگر جب اس کی شخصیت کو کوئی شدید جھٹکا لگتا ہے اس وقت اس کا اندر اس کے باہر آجاتا ہے۔ اس وقت کھل جاتا ہے کہ وہ شریف تھا یا غیر شریف۔ وہ بے اخلاق تھا یا با اخلاق۔

جس شخص سے آپ کا بگاڑ نہیں ہوا اس سے خوش اخلاقی برت کر آپ خدا کے نزدیک خوش اخلاق نہیں ہو سکتے۔ خدا کے نزدیک آپ اس وقت خوش اخلاق قرار پائیں گے جب کہ آپ اس شخص کے معاملہ میں خوش اخلاق ثابت ہوں جس سے آپ کا بگاڑ پیدا ہو چکا ہے۔

زمانہ کا فرق

چمگادڑ کی عادت ہے کہ وہ عام چڑیوں کی طرح نہیں بیٹھتا۔ بلکہ بیٹھنے والی جگہ کو پیروں سے پکڑ کر لٹک جاتا ہے۔ چمگادڑ کی یہ عادت قدیم زمانہ میں اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھی۔ وہ شاخ یا اس قسم کی دوسری چیزوں پر لٹکتا اور پھر جب چاہتا اڑ جاتا۔

مگر اب بجلی کے زمانہ میں چمگادڑ کی یہ عادت اس کے لیے موت کا سبب بن گئی ہے۔ عام چڑیاں اب بھی بجلی کے تار پر بیٹھتی ہیں اور اڑ جاتی ہیں۔ مگر چمگادڑ بجلی کے تار پر آتا ہے تو وہ اس کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بجلی کا صرف ایک تار چھونا خطرناک نہیں ہے۔ خطرناک یہ ہے کہ اس کے دونوں تاروں کو بیک وقت چھوا جائے۔ عام چڑیاں صرف ایک تار پر بیٹھتی ہیں۔ ان کا تعلق دوسرے تار سے ہونے نہیں پاتا اس لیے وہ محفوظ رہتی ہیں۔ اس کے برعکس چمگادڑ اپنی عادت کی وجہ سے تار کو پکڑ کر لٹکتا ہے۔ قدرتی طور پر اس کا جسم دوسرے تار کو بھی چھونے لگتا ہے۔ اس کی وجہ سے شارٹ سرکٹنگ ہوتی ہے اور وہ مر جاتا ہے۔

چمگادڑ کے لیے یہ عذر ہے کہ اُس کو زمانہ کے اِس "فرق" کا پتہ نہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہی غلطی اکثر وہ انسان کرتا ہے جس کو اس کے پیدا کرنے والے نے عقل اور شعور دیا ہے۔ وہ زمانہ کے فرق کو جاننے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اس طرح عمل کرتا ہے جیسے وہ چمگادڑ ہے نہ کہ عقل و ہوش والا انسان۔

موجودہ زمانہ میں جو فرق پیدا ہوئے ہیں، ان میں سے ایک فرق یہ ہے کہ آج کا زمانہ کسی انسان کو اظہار رائے کی مکمل آزادی دیتا ہے۔ مگر تشدد کو وہ مکمل طور پر جرم قرار دیتا ہے۔ ماضی میں یہ فرق اتنی واضح صورت میں موجود نہ تھا۔ اب جو لوگ اس فرق کو سمجھیں وہ امن کے دائرہ میں رہ کر اپنا کام کریں گے، وہ تشدد کے دائرہ میں داخل نہ ہوں گے اور اس طرح کامیاب رہیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنے ماضی کے ذہن کی بنا پر اس فرق کو نہ سمجھیں وہ اپنی جدوجہد میں اس کو ملحوظ نہ رکھیں گے۔ وہ امن کے دائرہ سے گزر کر تشدد کے دائرہ میں داخل ہو جائیں گے، اور نتیجۃً ناکامی سے دوچار ہوں گے۔

اعتراف

فتح مکہ کے بعد جب عرب پر اسلام کا غلبہ قائم ہوگیا اور اکثر قبائل اسلام میں داخل ہوگیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتوں کے خاتمہ کی مہم شروع کی۔ اس سلسلہ میں ایک مہم وہ تھی جو سُواع کی طرف سے بھیجی گئی۔

ہُذیل بن مُدرکہ بن الیاس بن مُضر نے زمانۂ جاہلیت میں ایک بت بنایا تھا جو سُواع کہا جاتا تھا، اس بت کو انھوں نے رہاط (ینبوع) میں رکھا تھا۔ رمضان ۸ھ میں حضرت عمرو بن العاص سواع کو منہدم کرنے کے لیے بھیجے گیے۔

یہ مقام مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر تھا۔ عمرو بن العاصؓ جب وہاں پہنچے تو اس بت کے مجاور نے ان سے پوچھا کہ تم کس ارادہ سے یہاں آئے ہو۔ عمرو بن العاص نے جواب دیا کہ میں خدا کے رسول کے حکم سے یہاں آیا ہوں تاکہ اس بُت کو منہدم کر دوں۔ مجاور کے ذہن پر سواع کی عظمت اتنی زیادہ چھائی ہوئی تھی کہ اس نے کہا کہ تم کبھی ایسا نہ کرسکو گے۔ سواع تم کو ضرور اس سے روک دے گا۔ عمرو بن العاص نے کہا کہ افسوس ہے تمہارے اوپر، تم اب تک اسی وہم میں پڑے ہوئے ہو۔ کیا یہ بت سنتا ہے اور دیکھتا ہے جو وہ مجھ کو روک دے گا۔ یہ کہہ کر انھوں نے سواع پر ایک ضرب لگائی اور بت ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔

یہ منظر مجاور کے لیے بالکل خلاف توقع تھا۔ بت کے ٹوٹنے کے ساتھ اس کے خیالات کا طلسم بھی ٹوٹ گیا۔ وہ پکار اٹھا: اَسْلمتُ لِلّٰہ۔ اور اسی وقت شرک کو چھوڑ کر دینِ توحید (اسلام) میں داخل ہوگیا۔

حق کو نہ ماننے والے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو تعصب اور نفسانیت کی وجہ سے حق کو نہ مانیں۔ دوسرے وہ جو غلط فہمی کی وجہ سے حق کو نہ مانیں۔ پہلی قسم کے لوگوں کو کبھی حق کا اعتراف کرنے کی توفیق نہیں ملتی۔ مگر دوسری قسم کے لوگوں کا نہ ماننا وقتی ہوتا ہے۔ وہ نہ سمجھنے کی وجہ سے انکار کر رہے تھے، اس لیے جب بات کو دلیل سے واضح کر دیا جائے تو وہ فوراً حق کو پا لیتے ہیں اور اپنی پچھلی روش کو چھوڑ کر اس کے آگے جھک جاتے ہیں۔

چُپ کی طاقت

پرانا مثل ہے کہ "ایک چپ ہزار بلا ٹالتی ہے" یہ بہت بامعنی ہے اور طویل انسانی تجربہ پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چپ رہنا بذاتِ خود ایک طاقت ور ہتھیار ہے، بشرطیکہ اس ہتھیار کو اس کے تمام تقاضوں کے ساتھ استعمال کیا جائے۔

غالباً ۱۹۶۶ کی بات ہے۔ میں لکھنؤ اور شاہ گنج کے درمیان ٹرین سے سفر کر رہا تھا۔ یہ دہرہ دون اکسپرس تھی اور میں پرانے نام کے مطابق تھرڈ کلاس اور نئے نام کے مطابق سکنڈ کلاس کے ایک ڈبہ میں تھا۔ پورے ڈبہ میں بظاہر میں اکیلا مسلمان تھا۔

سفر کے درمیان ایسا ہوا کہ مجھے ٹائلٹ جانے کی ضرورت پیش آئی۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر ڈبہ کے ٹائیلٹ کے پاس گیا۔ میں نے حسبِ عادت دروازہ آہستگی سے کھولا۔ مگر دروازہ ذرا سا کھلا تھا کہ اندر سے کپڑے کی صورت دکھائی دی۔ میں نے فوراً دروازہ بند کر دیا اور واپس آکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

واقعہ یہ تھا کہ ٹائیلٹ کے اندر ایک ہندو خاتون موجود تھیں۔ مگر انھوں نے قاعدہ کے مطابق دروازہ کا بولٹ نہیں لگایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دروازہ کسی قدر کھل گیا۔

عورت کا ہندو شوہر میرے قریب کی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس منظر کو دیکھتے ہی وہ بگڑ گیا۔ وہ غصہ اور نفرت سے بھر کر میرے اوپر پل پڑا۔ وہ جوش میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مجھے بری طرح ڈانٹنا اور برا بھلا کہنا شروع کیا۔ میں نے کہا کہ دروازہ اندر سے بند نہ تھا اور مجھ کو معلوم نہ تھا کہ اندر کوئی ہے، ورنہ ہرگز میں دروازہ کھولنے کی کوشش نہ کرتا۔ مگر میری وضاحت کا ہر لفظ اس کو اور زیادہ برہم کر رہا تھا۔ حتی کہ بظاہر ایسا معلوم ہوا کہ وہ مجھے کھڑکی کے راستہ سے باہر پھینک دے گا۔

لمبی بوگی پوری طرح بھری ہوئی تھی۔ مگر سارے ڈبہ میں کوئی ایک شخص بھی میری حمایت کے لیے نہیں اٹھا۔ آخر میں میں بالکل خاموش ہو گیا۔ میں مذکورہ شخص کی طرف دیکھ رہا تھا مگر میرے چہرے پر خوف یا اشتعال کا ذرا سا بھی کوئی اثر نہ تھا۔ میں انتہائی غیر جذباتی انداز میں اسٹیچو کی طرح خاموشی کے ساتھ اس کو دیکھتا رہا۔ اب وہ ٹھنڈا پڑنے لگا، یہاں تک کہ بالکل چپ ہو گیا۔ دوسرے کو چپ کرنے کی سب سے آسان تدبیر صرف ایک ہے ـــــ اپنی زبان کو یک طرفہ طور پر بند کر لینا۔

تیسری آنکھ

حضرت عمر فاروقؓ کا قول ہے : من لم ینفعہ ظنہ لم تنفعہ عینہ (جس شخص کا گمان اسے فائدہ نہ دے اس کی آنکھ بھی اس کو فائدہ نہیں دے سکتی) یعنی جو آدمی سوچ کر نہ سمجھے وہ دیکھ کر بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو چیز آنکھ سے دکھائی دیتی ہے وہی ساری بات نہیں ہوتی ہمیشہ ظاہری مشاہدہ کے سوا بھی کچھ باتیں ہوتی ہیں۔ آدمی اگر مشاہدہ کے ساتھ ان مزید باتوں کو نہ ملا سکے تو وہ بات کی حقیقت کو سمجھ نہیں سکتا۔

مثلاً علامہ اقبال انجمن حمایت اسلام (لاہور) کے جلسوں میں نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ ان جلسوں میں مسلمان جوق در جوق آتے تھے۔ یہ دیکھ کر انھوں نے کہہ دیا :

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے　　ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

مگر بعد کو جب مسلم قوم کے بارہ میں ان کو مزید تجربات ہوئے تو انھوں نے کہا :

تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں　　ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے پاکستان میں غلاف کعبہ (۱۹۶۳) اور یوم شوکت اسلام (۱۹۷۰) کے جلوس نکالے۔ اس میں وہاں کے مسلمان لاکھوں کی تعداد میں شریک ہوئے۔ یہ دیکھ کر مولانا مودودی نے سمجھ لیا کہ پاکستان کے ۹۹ فی صد مسلمان اسلام چاہتے ہیں۔ وہ اسلامی نظام کا نعرہ لے کر الکشن میں کود پڑے مگر چار الکشنوں میں حصہ لینے کے باوجود انھیں پانچ فی صد سے زیادہ ووٹ نہیں ملے۔ اسی طرح ہندستان میں آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت نے ۱۹۶۶ میں اپوزیشن کے ساتھ مل کر یہ تحریک چلائی کہ کانگریس کو الکشن میں ہراؤ۔ اس وقت جلسوں اور جلوسوں میں مسلمانوں کی زبردست بھیڑ دکھائی دینے لگی۔ مسلم قائدین نے یہ اعلان کر دیا کہ ہندستان کے مسلمان اپنے تمام اختلافات کو مٹا کر ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو گیے ہیں۔ مگر الکشن کے ختم ہوتے ہی مسلمانوں کا "عظیم الشان اتحاد" ختم ہو چکا تھا اور اسی کے ساتھ خود قائدین کا اپنا اتحاد بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں دو آنکھ کے ساتھ "تیسری آنکھ" کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس آدمی کے پاس تیسری آنکھ نہ ہو وہ دیکھنے کے بعد بھی نہیں دیکھے گا، وہ جاننے کے بعد بھی جاننے سے محروم رہے گا۔

فرق کو جانئے

رشید احمد صدیقی (۱۹۷۷ - ۱۸۹۲) اردو کے مشہور ادیب تھے۔ وہ مسلم یونی ورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر رہے۔ آل احمد سرور نے ان کا ایک واقعہ اس طرح لکھا ہے :

ڈاکٹر ضیار الدین نے نظام حیدر آباد کو علی گڑھ بلایا۔ ایڈریس لکھنے کی خدمت رشید صاحب کے سپرد ہوئی۔ رشید صاحب نے بڑے چاؤ سے ایڈریس لکھا، اور مجھے بھی سنایا۔ میں نے کہا "دیکھ لیجئے گا، پسند نہ آئے گا"۔ بولے "کیوں"۔ میں نے کہا: "اس میں خوشامد کم ہے، ادبی رنگ زیادہ، ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں نہ آئے گا"۔ یہی ہوا۔ ایڈریس سن کر کہنے لگے "کچھ جنچا نہیں، پھر کوشش کیجئے"۔ رشید صاحب نے نظر ثانی کی اور پھر پیش کیا۔ رشید صاحب نے لکھا تھا: "مغلوں کے عہد نے ہندستان کو تین تحفے دیے۔ تاج محل، غالب اور دولت آصفیہ"۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "نظام حیدر آباد کے سلسلے میں تاج محل کے ذکر کا کیا موقع ہے؟" غرض کئی دفعہ ایڈریس میں کانٹ چھانٹ ہوئی اور ڈاکٹر ضیاء الدین اور ان کے حواریوں کی جبین پر شکن ہی رہی۔ آخر رشید صاحب نے کہا کہ "مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ آپ کسی اور سے لکھوا لیجئے"۔ اس پر ڈاکٹر صاحب بہت چراغ پا ہوئے، اور رشید صاحب کی غیبت میں کہنے لگے کہ "اگر اردو شعبے کے لوگ ایک ایڈریس نہیں لکھ سکتے، تو ایسے شعبے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

(رشید احمد صدیقی، مرتبہ مالک رام، صفحہ ۴۳)

ڈاکٹر ضیاء الدین (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) ایک سائنس داں تھے۔ مگر انھوں نے اپنے اس تبصرہ میں ایک غیر سائنسی بات کہی۔ ان کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے ایڈریس اور قصیدہ میں فرق نہیں کیا۔ شعبۂ اردو جس مضمون کو تیار کرنے میں "ناکام" ہوا تھا، وہ مدحیہ قصیدہ تھا نہ کہ فی الواقع ایڈریس۔ اس کا تیار کردہ مضمون پورے معنوں میں ایڈریس تھا، البتہ وہ مدحیہ قصیدہ نہ تھا۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان فرق کرے۔ عام طور پر لوگ اس طرح فرق کر کے نہیں سوچ پاتے، اس لیے وہ اکثر رائے قائم کرنے میں غلطی کر جاتے ہیں۔ وہ ایک صورت معاملہ پر دوسری صورت معاملہ کو قیاس کر لیتے ہیں۔ حالانکہ دونوں کی نوعیت ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہے۔

بے خبری

امیر شکیب ارسلان (۱۹۴۶ - ۱۸۶۹) لبنان میں پیدا ہوئے۔ وہ نہایت ذہین آدمی تھے۔ پہلی بار جب ان کی ملاقات سید جمال الدین افغانی سے ہوئی تو انھوں نے امیر شکیب ارسلان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر کہا: انا اهنئ ارض الاسلام التی انبتتك (میں اس اسلامی سرزمین کو مبارکباد دیتا ہوں جس نے تم کو جنم دیا)

امیر شکیب ارسلان عربی، ترکی، فرانسیسی، انگریزی وغیرہ زبانیں جانتے تھے۔ انھوں نے یورپ کے ملکوں کا دورہ کیا اور وہاں عرصہ تک مقیم رہے۔ ان کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنے بارہ میں لکھتے ہیں کہ مطالعہ سے زیادہ کوئی چیز مجھے اس دنیا میں محبوب نہیں۔ ایک ظریف نے کہا ہے کہ میں انگور کھانے سے کبھی نہیں اکتاتا، خواہ میرے پیٹ میں تکلیف ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اسی طرح میں مطالعہ سے کبھی نہیں اکتاتا، خواہ میری آنکھوں میں جلن کیوں نہ پیدا ہو جائے (ذکری الامیر شکیب ارسلان، صفحہ ۲۴)

امیر شکیب ارسلان کی آخری دریافت یہ تھی کہ مغرب کا سیاسی استعمار عالم اسلام کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ وہ ساری عمر مغربی استعمار کے خلاف قلمی جہاد کرتے رہے۔ مجلہ السیاسۃ (بیروت) میں ایک بار ان کے ایک ہمدرد نے انھیں مشورہ دیا کہ زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ استعماری حکومتوں سے مصالحت کا انداز اختیار کرتے ہوئے کام کیا جائے۔ اس پر امیر شکیب ارسلان بگڑ گئے اور السیاسۃ میں سخت تردیدی مضمون شائع کیا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد امیر شکیب ارسلان کا نشانہ پورا ہو گیا۔ تمام مسلم ممالک مغرب کے سیاسی غلبہ سے آزاد ہو گئے۔ مگر عملی صورت حال میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ مغرب کی بالادستی اب بھی زیادہ طاقتور انداز میں قائم ہے۔ حتی کہ ہمارے جن بزرگوں نے مغربی استعمار کو سب سے بڑی برائی سمجھ کر ان کے خلاف سیاسی جہاد کیا تھا، ان کی اولاد دوبارہ بھاگ بھاگ کر انھیں مغربی ملکوں میں جا رہی ہیں تاکہ اپنی بہترین صلاحیت کو ان "اسلام دشمنوں" کی خدمت کے لیے وقف کر سکیں۔

امیر شکیب ارسلان اور ان کے جیسے لوگ ان حقائق کو سمجھنے سے کیوں عاجز رہے۔ اس کی وجہ ان کی بے خبری تھی۔ انھوں نے ادب جیسی چیزوں کا مطالعہ کیا۔ مگر انھوں نے تاریخ اور سائنسی علوم کا زیادہ گہرا مطالعہ نہیں کیا۔ اس لیے وہ نہ زمانۂ حاضر کو سمجھ سکے اور نہ وقت کے مطابق قوم کو رہنمائی دینے میں کامیاب ہوئے۔

تاریخ کا سبق

سابق امریکی صدر جارج بش نے ۵ اکتوبر ۱۹۹۱ کو اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ ایک شخص خارجہ پالیسی اور فوجی معاملات کو اقتصادی ترقی اور اصلاح سے جدا نہیں کر سکتا۔ دنیا نے واضح طور پر دیکھ لیا ہے کہ بڑھی ہوئی ہتھیار بندی اور جارحیت عراق کے لیے کتنی زیادہ مہنگی پڑی۔ دنیا نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ سیاسی اور فوجی طاقت پر بہت زیادہ توجہ دینا اور اقتصادیات کو نظر انداز کرنا سوویت یونین کے لیے کتنا زیادہ اور شاید مستقل طور پر نقصان کا باعث ثابت ہوا :

> One can not separate foreign policy and military issues from economic growth and reform. The world has seen only too clearly the immense costs of over-armed, aggressive states such as Iraq. It has also seen how excessive focus upon projecting politico-military power and neglecting the economy has badly, perpahs permanently damaged the USSR.

موجودہ دنیا میں کبھی کبھی ضرورت کے طور پر طاقت کو بھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ مگر طاقت کا استعمال صرف انتہائی ضرورت کے تحت وقتی طور پر کیا جا سکتا ہے۔ طاقت کو مستقل پالیسی بنانا کسی کے لیے بھی مفید نہیں، نہ فرد کے لیے اور نہ قوم کے لیے، نہ منی پاور کے لیے اور نہ سپر پاور کے لیے۔

کوئی بھی اتنا طاقت ور نہیں کہ وہ اقتصادی ترقی اور ہتھیاروں کی دوڑ کو بیک وقت جاری رکھ سکے۔ ہتھیار بندی میں زیادہ وسائل لگانا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ اقتصادی ترقی میں اسی کے بقدر کمی کرنی پڑے۔ ایسی پالیسی ہمیشہ مہلک ہوتی ہے۔ ماضی اور حال کی تاریخ میں اس کے عبرت ناک نمونے موجود ہیں۔

امن عمومی پالیسی کا عنوان ہے اور جنگ استثنائی اقدام کا عنوان۔ کسی بھی فرد یا قوم کے لیے صحیح ترین پالیسی یہی ہے کہ وہ امن اور حسن تدبیر کے ذریعہ دوسروں کے ساتھ اپنے معاملات درست کرے۔ جنگ یا ٹکراؤ کا طریقہ صرف شدید ترین ضرورت کے لیے اتفاقی طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

کم بولنا زیادہ سننا

كتب رجل الى حكيم يقول : لِمَ تبخلُ على الناس بالكلام - فقال الحكيم : إنّ الخالق سبحانه قد خلق لنا أذنين ولسانا واحداً لنسمع اكثر مما نتكلم ، لا أن نتكلم اكثر مما نسمع

ایک آدمی نے ایک دانا شخص کو لکھا کہ آپ لوگوں سے کلام کرنے میں کیوں بخل سے کام لیتے ہیں۔ دانا نے جواب دیا کہ خالق عزوجل نے ہمارے لیے دو کان پیدا کیے اور ایک زبان بنائی۔ تاکہ ہم بولنے سے زیادہ سنیں۔ نہ کہ سننے سے زیادہ بولیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کے لیے درست طریقہ یہی ہے کہ وہ کم بولے اور زیادہ سنے۔ یہی کسی انسان کا صحیح ترین مزاج ہے اور اسی میں دنیا اور آخرت کی کامیابی ہے، زیادہ سننے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی زیادہ جاننے کی کوشش کرے۔ آدمی جتنا زیادہ جانے گا اتنا ہی زیادہ وہ صحیح بول پائے گا۔ اس کے برعکس زیادہ بولنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کمتر معلومات کے باوجود بولنے لگے۔ ایسے شخص کا کلام سطحی ہو کر رہ جائے گا۔

آدمی جب دوسرے کی بات سنتا ہے تو اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ دوسرے کے نقطۂ نظر کو جاننے کے بعد وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنے نقطہ نظر کو زیادہ طاقت ور اور زیادہ مطابق واقعہ بنا کر پیش کر سکے۔ سننے سے پہلے بولنے میں یک طرفہ طور پر صرف اپنے ذہن کی رعایت ہوتی ہے۔ مگر جب آدمی دوسروں کی سن کر بولے تو اس کے کلام میں اپنے ساتھ دوسروں کی رعایت بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اس کا کلام دوطرفہ صداقت کا حامل بن جاتا ہے۔

زیادہ سننا اور کم بولنا صرف ایک صفت نہیں، وہ صفات کا مجموعہ ہے۔ وہ آدمی کی پوری شخصیت کی ایک علامت ہے۔ اس کا مطلب ہے تواضع، سنجیدگی، خوش اخلاقی، دوسروں کی رعایت اور معاملات کو گہرائی کے ساتھ دیکھنے کا مزاج۔ اس کے برعکس کم سننا اور زیادہ بولنا ایک ایسی شخصیت کی علامت ہے جس کے اجزاء ہیں سطحیت، بے اخلاقی، ذاتی اظہار، سرسری معلومات پر رائے قائم کرنا اور احساس ذمہ داری کے بغیر کلام کرنا۔

فرق کو جانیے

حدیث میں تعلیم دی گئی ہے کہ تم تجسس نہ کرو (ولا تجسسوا) دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ تم علم کی طلب کرو خواہ وہ چین میں ہو۔ (اطلبوا العلم ولو کان بالصین) تجسس اور طلب علم بظاہر ملتی جلتی چیزیں ہیں۔ کیوں کہ دونوں میں اصل مقصود معلومات جمع کرنا ہوتا ہے۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے طلب علم کو جائز اور مطلوب بتایا اور تجسس کو ناجائز اور غیر مطلوب قرار دیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ تجسس کا مقصد کسی آدمی کے شخصی راز کو جاننا ہوتا ہے۔ تجسس کرنے والا یہ چاہتا ہے کہ دوسرے آدمی کے ذاتی عیب کو معلوم کرے۔ اس قسم کا تجسس صرف ایک برائی ہے۔ وہ نفرت، بدگمانی، کشیدگی اور عداوت لے آتی ہے۔ اس سے خاندانی اور سماجی زندگی میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ وہ اصلاح کا سبب نہیں بلکہ بگاڑ کا سبب ہے۔

طلب علم کا معاملہ اس سے سراسر مختلف ہے۔ علم کی طلب معرفت کی طلب ہے۔ وہ حقائقِ عالم کو جاننے کی کوشش ہے۔ علم کے اضافہ سے آدمی کے ذہن میں وسعت آتی ہے۔ اس کی روح کو معرفت کی غذا ملتی ہے۔ وہ زندگی کے معاملہ میں زیادہ بہتر منصوبہ بندی کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ علم آدمی کو اخلاقی اور انسانی حیثیت سے اعلیٰ مرتبہ پر لے جاتا ہے۔

اسی طرح بہت سی چیزیں بظاہر ایک سی نظر آتی ہیں۔ مگر ان میں زبردست نوعی فرق ہوتا ہے۔ دنیا میں صحیح راستہ پر قائم رہنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو جانے۔ وہ چیزوں کو صرف ظاہر کے اعتبار سے نہ دیکھے بلکہ ان کی اندرونی حقیقت کے اعتبار سے انھیں دیکھ سکے۔

"فرق" کو جاننے کا تعلق پوری زندگی سے ہے۔ ہر چیز میں اس حکمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی ضرورت دین کے معاملہ میں بھی ہے اور دنیا کے معاملہ میں بھی۔ مثلاً زندگی میں کبھی چپ رہنا ضروری ہوتا ہے اور کبھی بولنا ضروری بن جاتا ہے۔ کبھی چلنا ضروری ہوتا ہے اور کبھی ضروری ہوتا ہے کہ آدمی اپنے گھر کے اندر بیٹھا رہے۔ کبھی معاملہ کو گھٹانا مقصود ہوتا ہے اور کبھی ضروری ہوتا ہے کہ اس کو بڑھانے کی کوشش کی جائے۔ جو لوگ اس فرق کو جانیں وہی دانش مند ہیں۔ اور جو لوگ اس فرق کو نہ جانیں وہ حیوان کی مانند ہیں، خواہ بظاہر وہ خوش پوش انسان کے روپ میں دکھائی دے رہے ہوں۔

زیادہ صحیح اصول

ٹیپو سلطان ۱۷۸۲ سے لے کر ۱۷۹۹ تک ریاست میسور کے حکمراں تھے۔ اسی زمانہ میں انگریز ہندستان پر قبضہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ ٹیپو سلطان کا مقابلہ انگریزوں سے پیش آیا۔ ٹیپو سلطان تنہا اس پوزیشن میں نہ تھے کہ وہ انگریز کی جدید فوجوں کا مقابلہ کر سکیں۔ انھوں نے کوشش کی کہ فرانس کو ایک انگریز مخالف معاہدہ میں شریک کریں، مگر فرانس راضی نہ ہو سکا۔ اس کے بعد انھوں نے عرب، کابل، قسطنطنیہ، ماریشس کی حکومتوں کے پاس اپنے وفود بھیجے تاکہ ان سے انگریز کے مقابلہ میں فوجی تعاون حاصل کریں، مگر اس میں بھی انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ اسی طرح انھوں نے ہندستان کی اس وقت کی ریاستوں کو انگریز مخالف مہم میں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی، مگر ریاستوں نے اس کو خودکشی کے ہم معنی سمجھا۔ چنانچہ کوئی ریاست اس کے لیے تیار نہ ہو سکی۔

آخر کار ٹیپو سلطان تنہا انگریزوں سے لڑ گئے۔ نتیجہ پہلے سے معلوم تھا۔ ۴ مئی ۱۷۹۹ کو سرنگاپٹم میں انگریز کی گولی نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ ٹیپو کی یہ جنگ یقینی طور پر بے فائدہ تھی۔ تاہم ٹیپو سلطان نے یہ کہہ کر اس کو صحیح قرار دیا کہ: شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے۔

ٹیپو سلطان کا یہ جملہ مسلم شاعروں اور خطیبوں کو بہت پسند ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس جملہ میں بہادری ضرور ہے۔ لیکن اس میں بصیرت اور دانش مندی نہیں۔ اگر یہ کوئی مطلق طور پر اعلیٰ اصول ہو تو پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب (مہاجرین) کو مکہ میں شیر کی طرح لڑ کر شہید ہو جانا چاہیے تھا، نہ کہ وہ ایک ایسا طرز عمل اختیار کریں جس نے اغیار کو یہ موقع دیا کہ وہ اس کو "فرار" سے تعبیر کرنے لگیں۔

اس کے برعکس مثال حیدرآباد کے نظام علی خاں کی ہے۔ حالات کو دیکھتے ہوئے انھوں نے ۱۷۶۸ میں انگریزوں سے صلح کا معاہدہ کر لیا۔ ان کی ریاست بدستور قائم رہی۔ اس طرح ریاست حیدرآباد کو موقع ملا کہ وہ ۱۷۶۸ سے لے کر ۱۹۵۶ تک مسلمانوں اور اسلامی اداروں کی غیر معمولی خدمت کر سکے۔

ٹیپو سلطان کے مذکورہ قول کے مقابلہ میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ایک دن کے لیے "گیدڑ" بن جانا آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ سو سال تک "شیر" بن کر رہ سکے۔

اخلاقی حالت

ٹائم (۵ ستمبر ۱۹۸۸) میں ایک مضمون چھپا۔اس معلوماتی مضمون کا موضوع کوریا کی اقتصادیات (Korean economy) تھا۔ اس مضمون میں کہا گیا تھا کہ کوریا کی کار ہیونڈائی (Hyundai) کا انجن جاپان کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ بقیہ اجزار کو اپنے یہاں تیار کر کے اس کو وہ کوریا کی کار کے طور پر فروخت کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں ہیونڈائی موٹر کمپنی (سیول) کے جنرل منیجر ڈونگ مان کم (Dong Man Kim) نے ٹائم کو ایک تردیدی خط لکھا جس میں کہا گیا تھا :

> I would like to invite you to our Ulsan plant to see how we manufacture our own engines.

یعنی ہم آپ کو اپنے کارخانہ واقع اُلسان میں آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ وہاں آکر دیکھیں کہ ہم کس طرح اپنے انجن خود تیار کرتے ہیں۔ جنرل منیجر کا یہ خط نہ صرف ایک چیلنج تھا بلکہ وہ ٹائم کی رپورٹ کو خلافِ واقعہ قرار دے رہا تھا۔ اس کے باوجود ٹائم نے اس کو اپنے شمارہ ۲۴ اکتوبر میں من وعن شائع کیا۔

یہ موجودہ دنیا کے " بے دینوں " کا حال ہے۔ دوسری طرف دین داروں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک شخص کے بارہ میں سراسر خلافِ واقعہ بات چھاپیں گے۔ اور جب اس کی تردید کی جائے گی تو وہ ہرگز تردید کو شائع نہ کریں گے۔ وہ غلطی کا اعتراف کرنے کے بجائے شخص مذکور پر جھوٹے الزامات لگانا شروع کر دیں گے۔ ایک غلطی کا اعتراف نہ کرنے کے لیے مزید شدید تر غلطیاں کرتے چلے جائیں گے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں، خاص طور پر نام نہاد دین دار طبقہ کے بارہ میں مجھے اس طرح کے تجربات کثرت سے ہوئے ہیں۔ حتی کہ میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ کم ازکم اخلاق وکردار کے اعتبار سے بدنام بے دین معروف دین داروں سے زیادہ دیندار ہیں۔

کسی قوم کی اصل طاقت اس کا اخلاق ہے۔ قوم کے افراد اخلاق وکردار کے جس رویہ پر ہوں گے، اسی درجہ کی کامیابی اسے حاصل ہوگی۔ نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔ اس میں ایک قوم یا دوسری قوم کی کوئی تفریق نہیں۔ یہ اصول مسلمانوں پر بھی اتنا ہی چسپاں ہوتا ہے جتنا غیر مسلمانوں پر۔ یہ ایسا آفاقی اصول ہے جس میں کوئی استثنار نہیں۔

لفظ کا فرق

ہوائی جہاز چلانے کا کام بہت زیادہ تربیت کا طالب ہے۔ مگر اکثر پائلٹ مطلوبہ معیار سے کم ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی۔ امریکی میگزین ٹائم (یکم اگست ۱۹۸۸) نے ایک رپورٹ شائع کی ہے جس کی سُرخی یہ ہے ــــــــ کیا امریکی ہواباز کوالیفائڈ ہیں :

Are U.S. pilots qualified (p. 39).

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ کی ہوائی کمپنیاں اکثر فیڈرل اوییشن ایڈمنسٹریشن (FAA) کے سرٹیفکٹ پر بھروسہ کرکے پائلٹ کو بھرتی کرلیتی ہیں، خود زیادہ تحقیق نہیں کرتیں۔ مگر یہ بھروسہ کافی نہیں۔ ایک ریسرچ ٹیم نے ۱۱۲ ہوابازوں کا جائزہ لیا تو ان میں ۵۰ فیصد ہواباز معیار سے کم تر تھے۔

مثلاً ایک پائلٹ نے ۱۹۸۵ میں ایک ہوائی حادثہ کیا۔ اس کے ریکارڈ کا گہرا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس سے پہلے وہ تین مزید حادثات کر چکا تھا، اس کے باوجود اس کو بھرتی کرلیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پچھلے تینوں حادثات اس کی فائل میں حادثات (Accidents) کے بجائے محض واقعات (Incidents) لکھے ہوئے تھے۔

الفاظ کا معاملہ بڑا عجیب ہے۔ ایک ہی واقعہ کو گھٹا کر بھی بیان کیا جاسکتا ہے اور بڑھا کر بھی۔ ایک قسم کا لفظ بولا جائے تو وہ معمولی نظر آئے گا، اور دوسرے قسم کا لفظ بولا جائے تو بے حد سنگین معلوم ہونے لگے گا۔ الفاظ کا معاملہ ربر جیسا ہے۔ اس میں کمی بیشی کا انحصار اس پر ہے کہ آپ نے اس کو کتنا کھینچا اور کتنا نہیں کھینچا۔

اس معاملہ میں مومن کے قول کو قولِ سدید ہونا چاہیے۔ قولِ سدید کا مطلب یہ ہے کہ بالکل تلتی ہوئی بات کہی جائے۔ ایسے الفاظ بولے جائیں جو اصل واقعہ کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہوں، نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔ خاص طور پر جہاں دو شخص یا دو گروہ کے درمیان کا نزاعی معاملہ ہو وہاں تو عین مطابق واقعہ لفظ بولنا فرض کے درجہ میں مطلوب ہوجاتا ہے، اور غیر واقعی لفظ بولنا حرام کے درجہ میں غیر مطلوب۔

کامیابی کی قیمت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (البقرہ ۲۴۹) حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جان لو کہ فتح ہمیشہ صبر کے ساتھ آتی ہے (اعلم ان النصر مع الصبر)

صبر کامیابی کی قیمت ہے۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ ایک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس کے خلاف باتوں کو چھوڑنا برداشت کیا جائے۔ امریکی سنگر اگورگورن (Igron Gorin) نے اپنے حالات کے ذیل میں بتایا ہے کہ پہلے وہ بہت زیادہ پائپ پیا کرتا تھا۔ اس کے استاد نے کہا کہ اگور، تم کو اپنے بارہ میں طے کرنا ہوگا کہ تم ایک عظیم سنگر بننا چاہتے ہو یا عظیم پائپ اسموکر۔ تم بیک وقت دونوں نہیں بن سکتے۔

اگور نے پائپ پینا چھوڑ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک عظیم سنگر بن گیا۔ پانے کی خاطر چھوڑنے کے اسی فعل کا نام صبر ہے۔ اس صابرانہ اصول کو امریکہ کے ایک ماہر نفسیات نے ان لفظوں میں بیان کیا ـــــ ہر انعام کی ایک قیمت ہے۔ اس دنیا میں انعام ہاں ہے، اور اس کی قیمت نہیں:

Every prize has its price. The prize is
the yes; the price is the no (p. 68).

یہ قول نہایت بامعنی ہے۔ اگر آپ ایک منظم اور بااصول آدمی بننا چاہتے ہیں تو آپ کو غیر ضروری عادتیں چھوڑنی پڑیں گی۔ اگر آپ ایک صحت مند انسان بننا چاہتے ہیں تو آپ کو وہ چیزیں چھوڑنی پڑیں گی جو صحت کو غارت کرنے والی ہیں۔ آدمی پہلے "نہیں" کو برداشت کرتا ہے۔ اس کے بعد ہی اس کو "ہاں" کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی گروہ یہ چاہتا ہے کہ وہ تعلیم اور روزگار اور صنعت وتجارت میں ترقی کرے، تو اسی کے ساتھ اس کو یہ بھی طے کرنا ہوگا کہ وہ لڑائی جھگڑے سے بچے گا۔ وہ یک طرفہ اعراض کے ذریعہ دوسروں کے ساتھ ٹکراؤ کی نوبت نہیں آنے دے گا۔ وہ ایسی ہر سرگرمی سے اپنے آپ کو بچائے گا جو دوسرے سماجی گروہوں سے رقابت اور دشمنی کا تعلق پیدا کرنے والا ہو۔ کیوں کہ ترقی پُرامن حالات میں حاصل کی جاسکتی ہے، نزاع اور فساد کے حالات میں ترقی کا سفر ممکن نہیں۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے ٹوٹی ہوئی ریلوے لائن پر ٹرین کا سفر ممکن نہیں ہوتا۔

صبر و برداشت

حضرت ابوسعید سعد بن مالک بن سنان الخُدری کی ایک روایت ہے جس کو امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے اپنی "صحیح" میں نقل کیا ہے۔ اس کا ایک جزء یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی شخص کو اللہ کی طرف سے صبر سے زیادہ بہتر اور زیادہ بڑا عطیہ نہیں دیا گیا۔

(وما اُعطیَ اَحدٌ عطاءً خیراً واوسعَ مِنَ الصّبر)

صبر تمام کامیابیوں کی کنجی ہے۔ خواہ اس کا تعلق دنیا کی کامیابی سے ہو یا آخرت کی کامیابی سے۔ پیغمبر اسلامؐ کی یہ تعلیم اعلیٰ ترین فطری صداقت تھی۔ چنانچہ وہ ساری دنیا میں مختلف شکلوں میں دہرائی گئی۔ شیخ سعدی شیرازی (۱۲۹۲ - ۱۲۱۳) نے اس کو فارسی زبان میں اس طرح بیان کیا کہ صبر کڑوا ہے، مگر اس کا پھل میٹھا ہے:

صبر تلخ است ولیکن برِ شیریں دارد

اس کے بعد زندگی کا یہ قیمتی سبق عالمی ادب میں پہونچا اور ہر ملک میں اس کو کسی نہ کسی صورت سے نقل کیا گیا۔ مثلاً فرانسیسی مفکر روسو (۱۷۷۸ - ۱۷۱۲) نے یہی بات دوبارہ اس طرح کہی کہ برداشت کڑوی چیز ہے مگر اس کا پھل میٹھا ہوتا ہے:

Patience is bitter, but its fruit is sweet.

صبر کا کڑوا پن چند منٹ کے لیے ہوتا ہے، مگر بے صبری کے نتیجہ میں جو کڑوا پن آتا ہے وہ برسوں تک بھی ختم نہیں ہوتا۔ صبر کا جھٹکا ذہن کے اندر صرف نفسیاتی طور پر سہنا پڑتا ہے، مگر بے صبری وہ چیز ہے جو آخر کار جانوں کو ہلاک کرتی ہے۔ جائدادوں کو برباد کرتی ہے۔ وہ آدمی کو آگ اور خون کے دریا میں پہونچا دیتی ہے۔

صبر ایک اصول ہے جب کہ بے صبری صرف ایک منفی ردّ عمل ہے۔ صبر کرنے والا اپنے آپ کو بااصول انسان ثابت کرتا ہے۔ اس کو اندرونی طور پر اطمینان کی یہ لذت ملتی ہے کہ وہ کٹھن گھڑیوں میں بھی اصول پر قائم رہا۔ اس کے برعکس بے صبر انسان کے حصہ میں یہ بدنصیبی آتی ہے کہ وہ وقتی طور پر بھڑک کر ایک جذباتی کارروائی کرے، اور پھر ساری عمر پچھتاتا رہے کہ کاش میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔

صبر کا پھل

نسیم علی خاں صاحب (پیدائش ۱۹۵۹) گیارہ سال سے بمبئی میں رہتے ہیں۔ ۲۳ اگست ۱۹۹۰ء کی ملاقات میں انھوں نے ایک واقعہ بتایا جو بہت سبق آموز ہے۔

بمبئی میں سیوری کراس روڈ کے علاقہ میں "مقدس مسجد" کے نام سے ایک مسجد ہے۔ یہاں پچھلے ۲۵ سال سے تبلیغی جماعت کا کام ہو رہا تھا۔ تین سال پہلے کی بات ہے، ایک روز سنّی (بریلوی) مسلمانوں کی ایک جماعت اچانک مسجد میں آگئی۔ یہ جمعہ کا دن تھا، وہ کھڑے ہو کر سلام پڑھنے لگے۔ دوسرے مسلمانوں نے انھیں روکا۔ اس پر بات بڑھی، اور پولس بلانی پڑی۔

آخر کار بریلوی حضرات کے مطالبہ پر یہ طے ہوا کہ ہم سلام نہیں پڑھیں گے مگر تبلیغی جماعت والے بھی یہاں اپنی کتاب پڑھنا بند کر دیں۔ اس پر تبلیغ والے راضی ہو گئے۔

اب مسجد میں تبلیغ والوں کی کتاب کا پڑھنا بند ہو گیا۔ تاہم تبلیغ والوں نے اپنا کام بند نہیں کیا۔ اب وہ مسجد کے دروازہ پر اپنا پروگرام کرنے لگے۔ تبلیغ والوں نے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی۔ البتہ اخلاقی تدبیریں کرتے رہے۔ مثلاً ایک بار انھوں نے سیوری کے سنّی مسلمانوں کے سرکردہ افراد کو کھانے پر بلایا۔ ان کے لیے عمدہ طریقہ پر دعوت کا انتظام کیا، وغیرہ۔

یہ سلسلہ تقریباً ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ تبلیغ والے صبر کے ساتھ مسجد کے باہر اپنا پروگرام کرتے رہے۔ اسی کے ساتھ خوش اخلاقی اور خوش تدبیری کے ذریعہ ان کے دلوں کو نرم بھی کرتے رہے۔ آخر کار تمام مخالف لوگ نرم پڑ گئے، یہاں تک کہ انھوں نے تبلیغ والوں کو اجازت دے دی کہ وہ مسجد کے اندر آکر اپنا پروگرام کر سکتے ہیں۔

یہی موجودہ دنیا میں کامیابی کا طریقہ ہے۔ اسی کے ذریعہ تمام مسئلے حل ہو سکتے ہیں، خواہ وہ مسئلہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان پیدا ہوا ہو یا مسلمان اور ہندو کے درمیان۔

موجودہ دنیا آزادی کی دنیا ہے۔ یہاں ہر ایک کو اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے کا اختیار ہے۔ اس لیے یہاں ایک دوسرے کے درمیان اختلاف کا پیش آنا عین فطری ہے، اس کا حل ٹکراؤ میں نہیں۔ اس کا واحد حل وہی ہے جس کو "حکمتِ اعراض" کہا جاتا ہے۔

اسوۂ ابراہیمی

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ صبر اور اعراض کو کمتر درجہ کی چیز سمجھتے ہیں. ان کے نزدیک مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ مجاہدانہ جوش کے تحت فوراً میدان مقابلہ میں کود پڑے۔ اس قسم کے اقدام کو وہ اسوۂ ابراہیمی قرار دیتے ہیں۔ اگر ان سے پوچھئے کہ اس جہادیا اسوۂ ابراہیمی کا ماخذ کیا ہے تو وہ فوراً اقبال کا یہ شعر پڑھ دیں گے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ شاعر کی خود ساختہ خیال آرائی ہے نہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ۔ اس شعر میں حضرت ابراہیم کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ سراسر خلافِ واقعہ ہے۔ اس کا تعلق نہ قرآن وحدیث سے ہے اور نہ تاریخ سے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم بن آزر علیہ الصلوٰۃ والسلام عراق میں پیدا ہوئے۔ اس وقت وہاں مکمل طور پر شرک کا غلبہ تھا۔ آپ نے ان کو توحید کی طرف بلایا۔ اور اپنی طرف سے کسی بھی قسم کا ٹکراؤ پیدا کیے بغیر خالص پرامن انداز میں اس کی دعوت دیتے رہے۔ قوم کے سردار جو بت پرستی کے اوپر اپنی سرداری قائم کیے ہوئے تھے، وہ آپ کے دشمن ہو گیے۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ آپ کو جلا کر ختم کر دیں (قالوا حرقوہ الانبیاء ۶۸)

روایات بتاتی ہیں کہ اس کے بعد انھوں نے ایک گڑھا کھودا۔ اس گڑھے میں لکڑیاں ڈال کر اس میں آگ لگا دی۔ جب آگ خوب بھڑکنے لگی، اس وقت انھوں نے حضرت ابراہیم کو پکڑ کر انھیں باندھا، باندھ کر ان کو منجنیق میں رکھا۔ اور منجنیق کے ذریعہ آپ کو آگ میں پھینک دیا (ثم اوثقوا ابراهيم وجعلوه في منجنيق ورموه في النار، صفوة التفاسير (المجلد الثاني، صفحه ۲۶۸)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ آگ میں ڈالے گیے تھے نہ کہ آگ میں کود پڑے تھے۔ یہ جبر کا معاملہ تھا نہ کہ اختیار کا۔ مذکورہ شعر حضرت ابراہیم کی جو تصویر پیش کرتا ہے وہ نہ صرف خلاف واقعہ ہے بلکہ خلاف اسلام بھی ہے۔ یہ ہرگز اسلام یا پیغمبروں کا اسوہ نہیں کہ آدمی بے خطر آگ میں کود پڑے۔ پیغمبروں کا اسوہ لوگوں کو آگ سے نکالنے کی کوشش کرنا ہے نہ کہ خوامخواہ آگ میں کود پڑنا۔

فساد کا مسئلہ

جناب ایم۔ ساجد صاحب (دہلی) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں الرسالہ پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ مجھے آپ کی سب باتوں سے اتفاق ہے۔ مگر ایک بات ایسی ہے جس سے میں اتفاق نہیں کر سکتا۔ وہ یہ کہ ملک کے فرقہ وارانہ فسادات کا ذمہ دار آپ مسلمانوں کو بتاتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ مسلمان فساد کرتے ہیں۔ ہم کیوں کر اس کو مان لیں۔ یہ تو واقعہ کے خلاف ہے۔

میں نے کہا کہ آپ نے میری بات کی صحیح ترجمانی نہیں کی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مسلمان پر فساد کرنے کی ذمہ داری ہے۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ مسلمان پر فساد کو نہ روکنے کی ذمہ داری ہے۔

میں نے کہا کہ قرآن میں ہے: وإن تصبروا وتتقوا لا يضركم كيدهم شيئا (آل عمران ۱۲۰) یعنی اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو مخالفین کی سازش تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچائے گی۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ سازش کی موجودگی نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ صبر و تقوی کی غیر موجودگی ہے۔ اس کے مطابق، فساد کا واقعہ پیش آنے کا سبب یہ نہیں ہے کہ یہاں سازش ہے۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ہم اس کے مقابلہ میں صبر و تقویٰ کا طریقہ اختیار نہیں کر پاتے۔

میں نے کہا کہ خواہ ہندستان کا مسئلہ ہو یا کسی اور ملک کا مسئلہ، ہمیشہ ایسا ہوگا کہ کچھ لوگ ایسی کارروائی کریں گے جس سے دوسروں کے جذبات بھڑکیں۔ اس مسئلہ کا حل دوسروں کو روکنا نہیں ہے بلکہ خود اپنے جذبات پر کنٹرول کرنا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے جہاں بھی ردعمل کا اور مشتعل ہونے کا طریقہ اختیار کیا، وہاں بات بڑھ کر فساد تک پہنچ گئی۔ اور جہاں صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کیا وہاں بات پہلے ہی مرحلہ میں ختم ہو گئی اور عمومی فساد کی نوبت نہیں آئی۔

اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ایڈمنسٹریشن کبھی فساد کو روک نہیں سکتا۔ فساد جب بھی رکے گا وہ مسلمانوں ہی کے روکنے سے رکے گا۔ اور اس کو روکنے کی تدبیر یہ ہے کہ مسلمان اشتعال انگیزی پر مشتعل نہ ہوں۔ وہ ناخوش گوار باتوں پر صبر کر لیں۔ اور اگر ضرورت ہو تو پہلے ہی مرحلہ میں اس کو پولیس کے حوالے کر دیں۔ اگر مسلمان ایسا کریں تو اِس ملک میں ہمیشہ کے لیے فساد کی جڑ کٹ جائے۔

فساد کا حل

جلوس کی مخالفت کرنے سے فساد ہوتا ہے اور جلوس سے اعراض کرنا فساد کو روکتا ہے۔ فساد کو ختم کرنے کی یہی واحد تدبیر ہے۔ ہزاروں مثالیں اس اصول کو صحیح ثابت کرتی ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک نصیحت آموز مثال وہ ہے جو مدراس میں پیش آئی۔ مدراس میں ۲ ستمبر ۱۹۹۰ کو ونایک چترتھی (Vinayaka Chaturthi) کا جلوس ہندوؤں نے نکالا۔ یہ جلوس چلتا ہوا ٹریپلی کین (Triplicate) کی سڑک پر پہنچا۔ یہاں مسلمانوں کی ایک مسجد ہے۔ مسلمانوں نے کچھ پرجوش لیڈروں کے زیر اثر جلوس پر روک ٹوک کی۔ انھوں نے کہا کہ تم لوگ اپنی روٹ بدلو۔ ہماری مسجد کے سامنے سے جلوس مت نکالو۔ مگر جلوس والے نہ مانے۔

اس پر تناؤ بڑھا۔ دونوں طرف سے لوگ مشتعل ہوگئے۔ فرقہ وارانہ ٹکراؤ کی نوبت آگئی۔ یہاں تک کہ پولیس نے گولی چلائی۔ دو مسلمان مارے گئے۔ بہت سے زخمی ہوئے۔ مسلمانوں کی کئی دکانوں اور مکانوں کو نقصان پہنچا۔ اس کے نتیجہ میں دونوں فرقوں کے درمیان نفرت اور کشیدگی کی جو فضا پیدا ہوئی وہ اس کے علاوہ ہے۔

اس تلخ تجربہ کے بعد مسلمان اگلے سال لیڈروں کی باتوں میں نہیں آئے۔ انھوں نے اس معاملہ میں اعراض کی پالیسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سال بھی حسب معمول ہندوؤں نے ۲۲ ستمبر ۱۹۹۱ کو اپنا جلوس نکالا۔ یہ جلوس اشتعال انگیز نعرے لگاتا ہوا ٹریپلی کین پہنچا۔ مسجد کے سامنے وہی حالات دوبارہ زیادہ شدت کے ساتھ پیدا ہوئے جو پچھلے سال پیدا ہوئے تھے۔ مگر مسلمانوں نے اپنے فیصلہ کے مطابق مکمل اعراض کا طریقہ اختیار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس مسلمانوں کا بدل بن گئی۔ کسی قسم کا کوئی تشدد نہیں ہوا۔ جلوس سڑک سے گزر گیا اور مسلمانوں کا جان و مال پوری طرح محفوظ رہا۔

اس واقعہ پر مدراس کے اخبار، دی ہندو نے اپنے شمارہ ۲۶ ستمبر ۱۹۹۱ میں مسلمانوں کو مبارک باد دیتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے اس موقع پر اشتعال انگیزی کے باوجود زبردست صبر (great restraint) کا مظاہرہ کیا۔ اور اس بنا پر اس بار کوئی فساد نہیں ہوا۔

یہی فساد کے مسئلہ کا آزمودہ حل ہے، اور مسلمانوں کو ہر جگہ اسی کو اختیار کرنا چاہئے۔

امن کمیٹی

دہلی کے اردو روزنامہ قومی آواز (۱۹ جنوری ۱۹۹۳) میں ایک خبر شائع ہوئی ہے۔ اس کا عنوان ہے: مسجد، مندر سے لاؤڈ اسپیکر ہٹا لینے کا کولھاپور میں متفقہ فیصلہ۔ پوری خبر اس طرح ہے:

"مسلم مذہبی رہ نماؤں اور بھارتیہ لوک آندولن کے رہ نماؤں نے مسجدوں سے لاؤڈ اسپیکر ہٹانے کا اور مہا آرتی فوراً ختم کر دینے کا متفقہ فیصلہ کر لیا ہے۔

ضلع مجسٹریٹ کے ترجمان نے بتایا کہ ۱۶ جنوری کو ضلع کلکٹر اجیت کمار جین کی جانب سے امن کی اپیل کے جواب میں گزشتہ رات یہاں مسلم مذہبی رہ نماؤں اور رآمھی بھارتیہ لوک آندولن کے رہنماؤں کی ایک میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا۔ ترجمان نے کہا کہ لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعہ نماز اور مہا آرتی کی وجہ سے پچھلے ایک ہفتہ سے شہر میں کشیدگی پیدا ہو رہی تھی۔ اس کے نتیجہ میں شہر میں آتش زنی اور پتھراؤ کی وارداتوں کی اطلاعات مل رہی تھیں۔

ضلع کی تمام سیاسی جماعتوں نے اس فیصلہ کو سراہتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے شہر میں امن اور بھائی چارہ برقرار رکھنے میں مدد ملے گی۔ (صفحہ ۱)

یہ ایک خوش کن چیز ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ باہمی اختلاف پیش آنے کی صورت میں وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی نہیں کریں گے۔ بلکہ وہ اپنے اختلافات کو بھائی چارہ کے اصول پر حل کریں گے۔

ضرورت ہے کہ ہر شہر اور ہر بستی میں امن کمیٹی بنائی جائے۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں طرف کے بزرگ لوگ شامل ہوں۔ جب بھی دونوں فرقوں میں کوئی اختلافی بات پیش آئے یا کسی بات پر تناؤ کی فضا ہو تو فوراً امن کمیٹی کے لوگ بیٹھ کر مشورہ کریں۔ اور باہمی مشورہ سے معاملہ کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔

امن کمیٹی اس قسم کے مسائل کو حل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ تجربہ ہے کہ جہاں کہیں بھی امن کمیٹی بنائی گئی وہاں وہ فساد کے خلاف ایک طاقتور چیک بن گئی۔ اسی کامیاب تجربہ کو ہر جگہ دہرانے کی ضرورت ہے، خواہ وہ چھوٹی جگہ ہو یا کوئی بڑی جگہ۔

امر بالمعروف ، نہی عن المنکر

ایک خاتون کا خط مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۹۲ ہم کو ملا ہے۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے : بلقیس کوثر ، ا-۳-۲۲ کسان نگر ، بھونگیر ۵۰۸۱۱۶ (ضلع نلگنڈا) انھوں نے اپنے یہاں کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ یہ واقعہ انھیں کے اپنے لفظوں میں یہ ہے :

"ہمارے یہاں کے ایک صاحب جو اسکوٹر پر اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ راستہ میں تین لڑکے جو ہمارے محلہ ہی کے تھے ، جن میں دو مسلم تھے اور ایک ہندو ، وہ بھی سڑک پر جا رہے تھے۔ اچانک اسکوٹر ان سے ٹکرا گیا اور وہ صاحب اسکوٹر سے گر پڑے۔ غصہ میں آکر انھوں نے اس لڑکے کو جو ہندو تھا ، ایک تھپڑ مارا ، اور پھر اپنے گھر چلے گئے۔ اس کے بعد وہ کار میں بیٹھے اور سیدھا پولس اسٹیشن جانے کے لیے نکل پڑے۔ ہمارے ابا جان نے ان سے پوچھا تو کہنے لگے کہ میں پولس اسٹیشن پر رپورٹ لکھوانے جا رہا ہوں۔ اگر میں خاموش ہو گیا تو یہ اسی طرح کرتے رہیں گے۔ ابا جان نے منع کیا اور کہا کہ ایسے واقعات کی رپورٹ پولس اسٹیشن میں نہیں لکھوانا چاہیے۔ کیوں کہ اس سے بات بڑھ جائے گی اور مار پیٹ شروع ہو کر فساد کی نوبت آجائے گی۔ پہلے وہ صاحب نہیں مان رہے تھے۔ جب ۱۵-۲۰ منٹ تک ان سے کہا کہ آئندہ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ یہ اپنے محلہ کے لڑکے ہیں ، وغیرہ تو آخر کار وہ صاحب مان گئے۔ اس طرح ایک بڑا جھگڑا ہونے سے رک گیا"

یہ واقعہ اس عمل کی ایک مثال ہے جس کو شریعت میں امر بالمعروف ، نہی عن المنکر کہا گیا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یہی ہے کہ ماحول کے اندر جب مذکورہ قسم کے حالات پیدا ہوں تو ایک یا چند افراد فوراً اس کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ وہ لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کریں۔ وہ ان کو منصفانہ عمل کی تلقین کریں۔ وہ ان کو ایسے اقدامات سے روکیں جن کا نتیجہ جان و مال کی تباہی کی صورت میں نکلنے والا ہو۔

یہی فسادات کا واحد چیک ہے۔ اگر ہر مقام پر یہ عمل جاری ہو جائے تو یقینی طور پر تمام فرقہ وارانہ یا غیر فرقہ وارانہ فساد کی جڑ کٹ جائے۔ امر بالمعروف ، نہی عن المنکر اسی قسم کا ایک سماجی اور اصلاحی عمل ہے ، وہ سیاسی لیڈری کا کوئی عنوان نہیں۔

دو ملک ایک واقعہ

ہندستان کے شہر بھاگلپور میں ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۰ کو ہندو مسلم فساد ہوا جس کا سلسلہ کئی دن تک جاری رہا۔ اس میں مسلمانوں کا زبردست جانی و مالی نقصان ہوا۔ اس کے بارہ میں بہت سی رپورٹیں اخبارات میں آچکی ہیں۔ بھاگل پور کے مولانا اکرام الدین قاسمی نے ذاتی جائزہ کے بعد ایک مفصل رپورٹ شائع کی ہے جو ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس رپورٹ کا عنوان ہے: بھاگلپور میں آگ اور خون کی ہولی۔

اس رپورٹ کے ٹائٹل پر ایک تصویر ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح سات مسلمانوں کو بے دردی کے ساتھ جلایا اور قتل کیا گیا۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا ہے: بھاگلپور کے ایک خاندان کے سات افراد کی لاشیں، جن میں ایک سال کا معصوم بچہ بھی شامل ہے۔

اب دوسری تصویر دیکھئے۔ پاکستان کے شہر کراچی میں ۷ فروری ۱۹۹۰ کو مسلم مسلم فساد ہوا جس کا سلسلہ کئی روز تک برابر جاری رہا۔ پاکستان کے مشہور اخبار نوائے وقت (۸ فروری ۱۹۹۰) کے صفحہ اول پر اس کی خبر نمایاں طور پر چھپی ہے۔ اس خبر کی سرخی یہ ہے: کراچی میں آگ اور خون کا کھیل۔

اس سلسلہ میں نوائے وقت (۱۰ فروری ۱۹۹۰) کے صفحہ اول پر مزید یہ خبر درج ہے کہ کراچی میں پانچ افراد پیٹ چاک کرنے کے بعد زندہ جلا دیئے گئے۔ یہ الم ناک اور بہیمانہ واقعہ منگھو پیر روڈ پر ہوا۔ یہاں ایک جلی ہوئی سوزوکی وین سے پانچ مسخ شدہ لاشیں برآمد کی گئیں۔ ان پانچ افراد کو رسیوں کے ساتھ وین کے اندر باندھا گیا اور ان کا پیٹ پھاڑ کر زندہ جلا دیا گیا۔

جو لوگ "بھاگلپور" کے واقعہ کو ہندو ظلم کے خانہ میں ڈالتے ہیں، وہ "کراچی" کے اسی قسم کے واقعہ کو کس کے ظلم کے خانہ میں ڈالیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ان دونوں واقعات کا کوئی مشترک سبب تلاش کرنا ہوگا۔ یہ مشترک سبب صرف ایک ہے۔ اور وہ عدم برداشت ہے۔

زندگی ناخوش گوار واقعات کو خوش گواری کے ساتھ برداشت کرنے کا نام ہے۔ اگر آپ اس برداشت کے لیے تیار رہوں تو آپ اپنی زندگی میں کامیاب رہیں گے۔ اور اگر آپ اس برداشت پر راضی نہ ہوں تو آپ "آگ اور خون" کے حوالے کیے جائیں گے، خواہ آپ مسلم ملک میں ہوں یا غیر مسلم ملک میں۔

واحد حل

دہلی کے روزنامہ قومی آواز (۲ جنوری ۱۹۹۰) میں ایک خبر چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے "مسلم بارات میں چاقو چل گیا"۔ اخبار کی رپورٹ کے مطابق خبر حسب ذیل ہے:

" ۳۱ دسمبر ۱۹۸۹ کی شام کو جامع مسجد کے علاقہ میں ایک شادی کی تقریب کے دوران پرانی دشمنی کی وجہ سے چاقو چل گیے۔ گلی شاہ تارا کے ناصر، محمد اقبال اور ان کے ایک ساتھی نے مبینہ طور پر محمد اسلم اور محمد میاں کو چاقو مار کر زخمی کر دیا۔ دونوں زخمی جے پرکاش اسپتال میں داخل ہیں، جب کہ تینوں ملزم فرار ہوگیے۔ بتایا جاتا ہے کہ ذاکر حسین کالج کے زمانہ طالب علمی میں اسلم نے کبھی ناصر کی پٹائی کر دی تھی۔ تب سے دونوں میں رنجش چلی آرہی تھی۔ آج بارات میں ان دونوں کے دوست عادل نے ان کو اپنی شادی پر مدعو کیا تھا۔ دونوں اپنے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں موجود تھے۔ تقریب کے دوران دونوں میں کسی بات پر تکرار ہوگئی۔ اس کے نتیجہ میں ناصر اور اقبال غصہ ہوگیے اور اسلم اور محمد میاں کو چاقو مار کر بھاگ گیے۔ جامع مسجد کی پولیس نے اقدام قتل کا کیس درج کر لیا ہے، تاہم ابھی تک اس سلسلہ میں کوئی گرفتاری نہیں ہوسکی ہے۔"

دو مسلمانوں کے درمیان اس قسم کے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ اسی سے اس ہندو مسلم واقعہ کو سمجھا جا سکتا ہے جو زیادہ بڑے پیمانہ پر ملک میں جاری ہے۔ ۱۹۴۷ میں ہندوؤں کو یہ شکایت ہوئی کہ مسلمانوں نے ان کی "بھارت ماتا" کے دو ٹکڑے کروا دیے۔ مزید یہ کہ لیڈروں کی حماقت کے نتیجہ میں اس موقع پر دونوں فرقوں میں زبردست مارکاٹ ہوئی۔ ماضی کی یہ تلخ یاد ہندو کے ذہن میں باقی ہے۔ عام حالات میں وہ زندگی کے مسائل کے نیچے دبی رہتی ہے۔ مگر جب کبھی ہندو اور مسلمان کے درمیان کسی بات پر تکرار ہو جاتی ہے تو ماضی کی تمام یادیں از سر نو جاگ اٹھتی ہیں۔ اب ہندو اپنے انتقامی جذبات کو لے کر مسلمانوں کے اوپر ٹوٹ پڑتا ہے۔

ایسی حالت میں مسلمانوں کے لیے عقلمندی یہ ہے کہ وہ "تکرار" کے مواقع کو نہ آنے دیں۔ وہ اعراض کی پالیسی پر عمل کرکے سوئے ہوئے جذبات کو سویا رہنے دیں۔ اس کے سوا اس مسئلہ کا دوسرا کوئی حل نہیں۔

جزئی مسئلہ

ٹائمس آف انڈیا (۶ جولائی ۱۹۹۱) میں ایک آرٹیکل چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے ـــــ
رام راجیہ کا مطلب عورتوں کے لیے کیا ہوگا :

What will Ramrajya mean to female.

اس مضمون میں جو باتیں کہی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ رام راجیہ ہندی دالوں کے شہری حلقہ کا ایک ظاہرہ ہے، اور اس کا دائرہ بھی صرف مرد آبادی تک محدود ہے :

Ramrajya is a Hindi belt urban phenomenon confined to the male population alone. (p.6).

یہ تجزیہ بالکل درست ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ " رام راجیہ " کی تحریک سارے ہندوؤں کی تحریک نہیں، وہ ہندو قوم کے ایک حصہ کی تحریک ہے۔ اور وہ حصہ بھی اقلیت میں ہے نہ کہ اکثریت میں۔

سورج گرہن، خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو، ساری زمین پر اندھیرا نہیں پھیلاتا۔ اور نہ کوئی سورج گرہن ہمیشہ کے لیے باقی رہتا۔ یہی معاملہ انسانی دنیا کا ہے۔ انسانی دنیا میں کوئی برائی، خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہو، وہ کبھی ساری انسانیت کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیتی۔ انسانیت کا ایک حصہ اگر وقتی طور پر اس کی زد میں آتا ہے تو بقیہ حصہ اس کے اثرات سے بچا رہتا ہے۔ اور جو حصہ بچتا ہے وہ اکثر اوقات زیادہ قیمتی اور زیادہ اہم ہوتا ہے۔

ہندستان میں مسلمانوں کے خلاف چلنے والی تحریکیں ہوں یا دنیا کے دوسرے حصوں میں چلنے والی اس قسم کی تحریکیں، ان سے ہمیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ خود قدرت کا قانون ان کے اوپر چیک لگانے کے لیے ابدی طور پر موجود ہے۔ عین قانون قدرت کے تحت ایسا ہے کہ اپنی ساری تگ و دو کے باوجود ایسی تحریکیں کسی سماج کے صرف ایک جزئی حصہ کو متاثر کر سکتی ہیں۔ سماج کا بڑا حصہ پھر بھی ایسا باقی رہے گا جو ہمارے موافق ہوگا اور جن کو استعمال کرکے ہم اتنا آگے بڑھ سکتے ہیں کہ ناموافق عناصر کی زد سے باہر نکل جائیں۔

جوابی فارمولا

کہا جاتا ہے کہ ہندستان کے فرقہ پرست ہندو سازش کر کے مسلمانوں کے خلاف فساد کرتے ہیں۔ ان فسادات میں مسلمانوں کا بے حساب جانی اور مالی نقصان ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی " سازش " کیا ہوتی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی اس کمزوری کو جان لیا ہے کہ ان کے اندر صبر کا مادہ نہیں۔ ان کے خلاف اشتعال انگیزی کی جائے تو وہ فوراً مشتعل ہو کر آمادۂ تشدد ہو جائیں گے۔ مسلمانوں کی اسی کمزوری کو استعمال کرنے کا نام فرقہ وارانہ فساد ہے۔

فرقہ پرست ہندو منصوبہ بنا کر ایک جلوس نکالیں گے۔ وہ جلوس سڑکوں سے گزرتا ہوا مسلم محلّے میں پہونچے گا۔ وہاں وہ مسجد کے سامنے باجا بجائے گا یا اشتعال انگیز نعرہ لگائے گا۔ اب مسلمان بھڑک کر جلوس کو روکیں گے۔ بات بڑھے گی۔ یہاں تک کہ عملی تشدد شروع ہو جائے گا۔ اب ہندوؤں کو موقع مل جائے گا۔ وہ مسلمانوں پر آغازِ تشدد کا الزام لگا کر ان کو جلانا اور مارنا شروع کر دیں گے۔ اُن کی اس فسادی پالیسی کو ایک لفظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ غصہ دلاؤ اور کامیابی حاصل کرو :

Anger and conquer

قرآن کے مطابق، اس فسادی پالیسی کا بہترین توڑ صبر و اعراض ہے۔ فساد کی مذکورہ سازش گویا ایک ٹائم بم ہے۔ اس بم کی تباہی سے بچنے کی آسان تدبیر یہ ہے کہ اس کو حکمت کے ساتھ ڈیفیوز کر کے ناکارہ بنا دیا جائے۔ فساد کے ٹائم بم کو ناکارہ بنانے کا قرآنی فارمولا ایک لفظ میں یہ ہے کہ اعراض کرو اور کامیابی حاصل کرو :

Avoid and conquer

اس فارمولے کا خلاصہ یہ ہے کہ جب بھی اس قسم کا جلوس نکلے تو مسلمان نہ تو اس کی روٹ بدلنے پر اصرار کریں اور نہ ان کے اشتعال انگیز نعروں پر مشتعل ہوں۔ اِن باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہیں۔ بار بار کا تجربہ ہے کہ جہاں مسلمانوں نے اس فارمولے پر عمل کیا وہاں فساد نہیں ہوا۔ اس کے بعد بھی اگر جلوس والوں نے کوئی حرکت کرنا چاہا تو پولیس نے اول مرحلہ میں اس کو سختی سے روک دیا۔ کیوں کہ اب مسئلہ پولیس بمقابلہ جلوس بن گیا تھا۔

سازش کا راز

سعودی حکمراں شاہ فیصل ۲۵ مارچ ۱۹۷۵ کو قتل کردئے گئے۔ قاتل ان کا بھتیجا شہزادہ فیصل بن مساعد تھا۔ مسٹر ایلن ہارٹ نے اپنی انگریزی تصنیف "یاسر عرفات، دہشت پسند یا امن کے نقیب" میں لکھا ہے کہ قتل کا منصوبہ اسرائیلی ایجنٹوں نے تیار کیا تھا۔ فیصل بن مساعد کی حیثیت محض آلۂ کار کی تھی۔ مصنف نے تنظیم آزادی فلسطین کی امور خارجہ کمیٹی کے چیئرمین مسٹر خالد حسن کے حوالے سے لکھا ہے کہ فیصل بن مساعد کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کے والد کی موت کے ذمہ دار شاہ فیصل ہیں۔ نیز یہ کہ شاہی خاندان اس کے ساتھ امتیازی سلوک کر رہا ہے۔ اس کے سینے میں انتقام اور محرومی کا احساس دبا ہوا تھا۔ اسرائیلی ایجنٹوں نے اس کے اسی احساس کو استعمال کیا۔

فیصل بن مساعد تعلیم کے لئے امریکہ میں مقیم تھا۔ اس زمانہ میں باقاعدہ منصوبہ کے تحت ایک یہودی لڑکی نے اس سے دوستی کی اور اس کو نشہ آور چیزوں کا عادی بنا دیا۔ یہ لڑکی جو اسرائیلی خفیہ ایجنسی کی ایک رکن تھی، فیصل بن مساعد کے اوپر بری طرح چھاگئی۔ جب یہودی عورت نے محسوس کیا کہ وہ اپنی آنکھ سے دیکھنے اور اپنے ذہن سے سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہوچکا ہے تو اس نے شہزادہ کا ہمدرد بن کر اس کے اندر یہ جذبہ ابھارا کہ وہ شاہ فیصل کے ظلم اور ناانصافی کا بدلہ لینے کے لئے انھیں قتل کردے۔

مسٹر خالد حسن کے خیال کے مطابق یہود نے شاہ فیصل کو اس لئے قتل کرایا کیوں کہ انھیں خطرہ تھا کہ وہ عرب اتحاد پیدا کرکے ان کے لئے خطرہ بن جائیں گے اور امریکہ کو مجبور کریں گے کہ وہ اسرائیل کو ۱۹۶۷ کی سرحدوں پر دوبارہ واپس لے جائے۔

یہ ایک مثال ہے جس اندازہ ہوتا ہے کہ ان واقعات کی حقیقت کیا ہے جن کو ہم "دشمنان اسلام کی سازش" کا نام دیا کرتے ہیں۔ یہ سازشیں خود مسلمانوں کے اپنے کمزور پہلوؤں کا استعمال ہیں نہ کہ محض یک طرفہ سازش۔

اسلام کے دشمن اسلام کے خلاف اپنی سازشوں میں صرف اس وقت کامیاب ہوتے ہیں جب کہ وہ مسلمانوں کے اندر اپنے لئے کوئی موافق عنصر کو پالیں۔ اس اپنے اندر کے عنصر کو درست کر دیجئے اور پھر کسی دشمن کی کوئی سازش آپ کے خلاف کامیاب نہیں ہوگی۔

تدبیر نہ کہ اشتعال

۲۰ فروری ۱۹۹۱ کو مئو کے عبدالجبار صاحب (۶۴ سال) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ ہر فساد کا واحد حل حکیمانہ تدبیر ہے۔ اگر حکمت کا طریقہ اختیار کیا جائے تو کبھی کوئی فساد نہ ہوگا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے ذاتی تجربہ کے کئی واقعات بتائے۔

مئو کے محلہ مرزا ہادی پورہ میں عبدالحکیم گرہست صاحب رہتے ہیں۔ ان کے گھر کے پاس ایک مسجد ہے جو "جامع مسجد احناف" کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۸۱ کا واقعہ ہے۔ رات کے وقت کسی نے خنزیر کا مرا ہوا بچہ اس مسجد میں ڈال دیا۔ صبح کو فجر کی نماز کے لیے لوگ مسجد آئے تو دیکھا کہ وہاں خنزیر پڑا ہوا ہے۔

خبر مشہور ہوتے ہی سارے مئو میں سنسنی پھیل گئی۔ ۸ بجے تک عبدالحکیم گرہست کے مکان پر بھیڑ لگ گئی۔ مسلمان بڑی تعداد میں جمع ہوگیے۔ لوگ سخت مشتعل تھے۔ اور قریب تھا کہ کوئی کارروائی کر بیٹھیں اور پھر سارے شہر میں فساد کی صورت پیدا ہو جائے۔ مگر عبدالحکیم گرہست صاحب نے لوگوں کو سختی سے روکا اور پرامن رہنے کی تاکید کی۔

اس کے بعد انھوں نے پولیس کو ٹیلی فون کیا۔ فوراً پولیس جائے واردات پر پہونچ گئی۔ پولیس والوں نے صدر دفتر اعظم گڈھ کو بھی ٹیلی فون کر دیا تھا۔ چنانچہ وہاں سے بھی افسران آگئے۔ پولیس افسروں نے آکر مسلمانوں کو سمجھایا اور کہا کہ آپ لوگ پرامن رہیں، ہم کو کارروائی کرنے کا موقع دیں۔ اس کے بعد پولیس والوں نے خنزیر کو وہاں سے اٹھوایا۔ اور فائر بریگیڈ کو بلا کر دور تک پانی سے اچھی طرح دھو دیا۔ اس کے بعد معاملہ وہیں کا وہیں ختم ہوگیا۔ کسی قسم کے فساد کی نوبت نہیں آئی۔ جب کہ اس طرح کے ایک واقعہ پر اکثر پورا شہر فساد کی زد میں آجاتا ہے۔

اس طرح کے مواقع پر بہترین عقل مندی یہ ہے کہ مسلمان امن پسندی کا ثبوت دیں۔ وہ خود کوئی جارحانہ کارروائی نہ کریں۔ بلکہ معاملہ کو پولیس کے حوالے کر دیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو یقینی ہے کہ کسی قسم کا فساد نہیں ہوگا۔ خنزیر ڈالنے والے اس لیے خنزیر ڈالتے ہیں کہ مسلمان مشتعل ہو کر کوئی جارحانہ کارروائی کر دیں تاکہ انھیں مکمل فساد کرنے کا موقع مل جائے۔ اس "سازش" کا توڑ یہ ہے کہ مسلمان بالکل خاموش رہیں اور پولیس کو اطلاع دینے کے سوا کوئی اور کارروائی نہ کریں۔ یہ فساد کے بم کو ناکارہ کر دینے کے ہم معنی ہوگا۔

فرضی خطرہ

قدیم مکہ میں ایک شخص تھا۔ اس کا نام روایات میں الحارث بن عثمان بن نوفل بن عبد مناف بتایا گیا ہے۔ اس کے سامنے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب توحید کی دعوت پیش کی تو اس نے کہا:

انا لنعلم ان الذی تقول حق۔ ولکنا ان اتبعناک خفنا ان تخرجنا العرب من ارض مکۃ (التفسیر المظہری)

ہم جانتے ہیں کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ بلاشبہ حق ہے۔ لیکن اگر ہم آپ کی پیروی کریں تو ہم کو ڈر ہے کہ عرب ہم کو مکہ کی سرزمین سے نکال دیں گے۔

اس کا جواب دیتے ہوئے قرآن میں کہا گیا کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم آپ کے ساتھ اس ہدایت کا اتباع کریں تو ہم کو ہماری زمین سے اچک لیا جائے گا (وقالوا ان نتبع الھدی معک نتخطف من ارضنا (القصص ۵۷)

مکہ کے لوگوں کی سرداری اور معاش دونوں کا خاص ذریعہ یہ تھا کہ مکہ کے تمام قبیلوں کا بت انھوں نے کعبہ میں رکھ دیا تھا۔ اس طرح انھیں تمام قبائل عرب کی سرداری حاصل ہوگئی تھی۔ اسی کے ساتھ یہ تھا کہ عرب کے مختلف قبیلے اپنے اپنے بتوں پر نذر چڑھانے کے لیے مکہ آتے تھے۔ یہ تمام نذرانے مکہ والوں کو ملتے تھے۔ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک خدا کا پیغام ان کے سامنے پیش کیا تو ان کی فطرت نے اس کے برحق ہونے کی تصدیق کی۔ مگر ان کا ذہن اس سوال میں اٹک گیا کہ اگر وہ کہیں کہ خدا صرف ایک ہے۔ بقیہ تمام دیوتا فرضی ہیں تو وہ اچانک تمام قبائل سے کٹ جائیں گے۔ اس کے بعد ان کی سرداری بھی چھن جائے گی اور ان کی معاش بھی۔

ٹھیک یہی صورت موجودہ زمانہ میں ہندستانی مسلمانوں کی ہے۔ ان کے سامنے قرآن کی بات رکھی جائے تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ قرآن کے مطابق یہی صحیح بات ہے۔ مگر فوراً ہی کچھ سوالات سامنے آکر انھیں اس کی طرف سے شبہ میں ڈال دیتے ہیں —— اگر ہم صبر واعراض کا طریقہ اختیار کریں تو ہندو ہمارے اوپر دلیر ہو جائے گا۔ اگر ہم سیاسی شور وغل نہ کریں تو ملک میں ہونے والے سیاسی عمل سے ہم کٹ جائیں گے، اگر ہم مطالبہ اور احتجاج کا طریقہ چھوڑ دیں تو ہم اپنے دستوری حقوق سے محروم ہو کر رہ جائیں گے۔ وغیرہ

اس قسم کی تمام باتیں بلاشبہ شیطانی وسوسہ ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

نظرانداز کرو

سرپرسی کاکس (Sir Percy Cox) ایک انگریز تھا۔ وہ ۱۸۶۴ میں پیدا ہوا، اور ۱۹۳۷ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ۱۸۸۴ سے ۱۸۹۰ تک برٹش فوجی افسر کی حیثیت سے انڈیا میں رہا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد عراق برٹش مینڈیٹ کے تحت آگیا۔ اس کے بعد کاکس کو ۱۹۲۰ میں عراق بھیجا گیا۔ وہ وہاں برٹش ہائی کمشنر کی حیثیت سے ۱۹۲۳ تک مقیم رہا۔

سرپرسی کاکس کا قیام بغداد میں تھا۔ ایک روز صبح کو وہ اپنی رہائش گاہ میں تھا کہ صبح کے وقت قریب کی مسجد سے آواز سنائی دینے لگی۔ یہ موذن کی آواز تھی جو فجر کی اذان پکار رہا تھا۔ کاکس کے لیے یہ ایک نئی آواز تھی جو اس نے اب تک نہیں سنی تھی۔ اس کو اندیشہ ہوا کہ یہ باغیوں کا کوئی گروہ تو نہیں ہے جو نعرہ لگا رہا ہے۔ اس نے اپنے آدمی کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیسی آواز ہے۔ بتانے والے نے بتایا کہ یہ مسلمانوں کی اذان ہے۔ وہ روزانہ اپنی مسجد میں اسی طرح اذان پکارتے ہیں تاکہ لوگ اس کو سن کر مسجد میں نماز کے لیے آجائیں۔

سرپرسی کاکس نے سنجیدہ لہجہ میں پوچھا کہ اس سے ہمارے ایمپائر کو کوئی خطرہ تو نہیں۔ بتایا گیا کہ نہیں۔ اس نے جواب دیا: پھر انھیں چھوڑ دو، وہ جو کر رہے ہیں کرتے رہیں۔

میں کہوں گا کہ مسلمانوں کو یہی پالیسی سڑک کے نعروں کے بارہ میں اختیار کرنا چاہیے۔ دوسرے فرقہ کے لوگ جلوس نکالتے ہیں۔ اس میں وہ "دل آزار نعرے" لگاتے ہیں۔ کوئی فرقہ پرست لیڈر پارک میں جلسہ کرکے "اشتعال انگیز" الفاظ بولتا ہے۔ اس سے مسلمان بھڑک کر کارروائی کرتے ہیں اور اس کے بعد فساد ہو جاتا ہے۔

ایسے مواقع پر مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ سوچیں کہ کیا یہ الفاظ ان کے لیے کوئی عملی خطرہ ہیں۔ کیا وہ انھیں کوئی جسمانی یا مادی نقصان پہونچا رہے ہیں۔ مسلمان جب اس طرح سوچیں گے تو انھیں معلوم ہوگا کہ اس قسم کے الفاظ ان کے لیے کوئی عملی خطرہ نہیں۔ یہ معلوم ہونے کے بعد انھیں چاہیے کہ سرکاکس کی طرح وہ کہہ دیں: پھر انھیں چھوڑ دو، وہ جو کچھ بولتے ہیں بولتے رہیں۔ ہم تو ان کو نظرانداز کرکے اپنا تعمیری کام جاری رکھیں گے۔

بہتر حل

۲ اکتوبر ۱۹۸۹ کو تامل ناڈو کے حکیم محمد صفدر شریف (۴۵ سال) سے ملاقات ہوئی:

H.M. Safdar Shareef, 26, Nadeemullah Makkan Street, Salem-636001

انھوں نے سیلم پور کے ایک قصبہ تمم پٹی (Tammampatti) کا ایک واقعہ بتایا۔ یہاں کی آبادی ۱۰ ہزار ہے جس میں تقریباً ۵ فی صد مسلمان بستے ہیں۔ تمم پٹی میں ۲۶ فروری ۱۹۸۹ کو ہندوؤں کا ایک مذہبی جلوس نکلا۔ یہ جلوس ایک مندر سے شروع ہو کر ایسی سڑک سے گزرنے والا تھا جس پر ایک مسجد واقع ہے۔ مسلمانوں کو اس روٹ پر اعتراض ہوا۔ انھوں نے کہا کہ جلوس میں باجا اور شور ہوگا۔ اس سے ہماری عبادت میں خلل پیدا ہوگا۔

اس موقع پر ایک ہیڈ کانسٹبل مسلمانوں سے ملا۔ اس نے کہا کہ فریق ثانی کی طرف سے امن کو برہم کرنے کی پوری تیاری ہے۔ مگر اس کا حل یہ ہے کہ آپ لوگ بالکل خاموشی اختیار کرلیں۔ ہرگز کوئی مداخلت نہ کریں۔ اس کے بعد پولس اپنے آپ ان سے نپٹ لے گی۔

مسلمانوں نے اس مشورہ کو مان لیا۔ انھوں نے مقررہ وقت پر مسجد میں اندر سے تالا لگایا اور نمازیوں سے کہہ دیا کہ آپ چپ چاپ اپنی نماز ادا کریں۔ جلوس وہاں رات کو عشار کی نماز کے وقت پہونچا۔ وہ لوگ باجا بجاتے ہوئے اور نعرہ لگاتے ہوئے مسجد والی سڑک پر پہونچے۔ مسجد میں ان کی آوازیں آرہی تھیں۔ مگر مسلمانوں نے کوئی روک ٹوک نہ کی۔ اس وقت پولس سامنے آئی۔ اس نے جلوس والوں سے کہا کہ تم لوگ مسجد کے سامنے باجا نہ بجاؤ۔ اور چپ چاپ یہاں سے گزر جاؤ۔ مگر وہ لوگ نہیں مانے۔ پولس نے پہلے آنسو گیس چھوڑا۔ مگر مجمع بہت بڑا تھا، قابو میں نہ آیا۔ اس کے بعد پولس نے فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے نتیجہ میں کئی لوگ زخمی ہوئے اور دو ہندو نوجوان مر گیے۔ اب جلوس منتشر ہوگیا۔

ایسے تمام مواقع پر یہی مسئلہ کا واحد حل ہے۔ ان مواقع پر مسلمان جب خود مداخلت کی کوشش کرتے ہیں تو مسئلہ ہندو۔مسلم بن جاتا ہے۔ مسلمان اگر خاموش رہیں تو مسئلہ ہندو۔پولیس رہے گا، اور پھر پولیس زیادہ بہتر طور پر وہ کام کردے گی جس کو مسلمان صرف ناقص طور پر کرنا چاہتے ہیں۔

پہلا جھٹکا

امام ابوداؤد نے ادب کے تحت یہ حدیث (رقم ۴۷۸۴) نقل کی ہے کہ عبداللہ ابن بحیر الصنعانی کہتے ہیں کہ ہم عروہ بن محمد السعدی کے پاس گیے۔ اس وقت ایک شخص نے ان سے بات کی اور ان کو غضب ناک کردیا۔ اس کے بعد وہ اٹھے اور وضو کیا۔ پھر انھوں نے کہا کہ میرے باپ نے میرے دادا عطیہ سے نقل کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غصہ شیطان سے ہے۔ اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے۔ اور آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے۔ پس تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو وہ وضو کرلے (فاذا غضب احدکم فلیتوضأ)

اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ آدمی کو جب غصہ آئے تو وہ اگر کھڑا ہے تو وہ بیٹھ جائے۔ اور اگر وہ بیٹھا ہے تو وہ لیٹ جائے۔ وہ اپنی زبان سے کہے کہ اے اللہ، میں شیطانِ رجیم سے تیری پناہ چاہتا ہوں (اللّٰھم انی اعوذ بك من الشیطٰن الرجیم)

جب کوئی شخص آپ کو برا کہے یا آپ کے خلاف زیادتی کا کوئی کلمہ کہہ دے تو فوری طور پر آپ کے دل کو سخت جھٹکا لگتا ہے۔ آپ کے اندر غصہ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اس وقت اگر پہلے جھٹکے کو برداشت کرلیا جائے تو ایک لمحہ کے بعد اندر کی آگ بجھ جائے گی۔ اور آپ ایک نارمل انسان کی مانند ہوجائیں گے۔ اس کے برعکس اگر پہلے جھٹکے کو برداشت نہ کرتے ہوئے ردِّ عمل کا طریقہ اختیار کیا جائے تو ردِّ عمل اور جوابی ردِّ عمل کی صورت میں سلسلہ بڑھنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ غصہ ٹکراؤ تک پہونچ جاتا ہے اور ٹکراؤ ہلاکت اور تباہی تک۔

حدیث میں جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ گویا معاملہ کو پہلے جھٹکے پر ختم کرنے کی کچھ علامتی تدبیریں ہیں۔ حالات کے لحاظ سے اس قسم کی کوئی بھی تدبیر اختیار کی جاسکتی ہے۔ مثلاً غصہ کے وقت اپنے مقام سے ہٹ جانا۔ کمرہ سے نکل کر کھلی فضا میں ٹہلنے لگنا، ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس لے کر پی لینا، وغیرہ۔ کسی بھی طرح اگر آپ نے پہلے جھٹکے کو سہہ لیا تو اس کے جلد ہی بعد آپ محسوس کریں گے کہ آپ کے سینہ میں غصہ کا ہیجان ختم ہوچکا ہے۔ آپ ایک معتدل انسان بن چکے ہیں جس طرح آپ غصہ سے پہلے ایک معتدل انسان تھے۔

نیا روس

اے پی کی ایک خبر ٹائمس آف انڈیا (۱۶ مارچ ۱۹۸۹، سکشن ۲) کے صفحہ اول پر چھپی ہے۔ اس کے مطابق تاشقند (سوویت روس) میں خلاف معمول مسلمانوں کا ایک جلوس نکلا۔ آنسوؤں اور اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ کئی ہزار مسلمانوں نے ۱۴ مارچ ۱۹۸۹ کے ساتویں صدی عیسوی کے قرآنی نسخہ کی واپسی پر خوشی منائی اور اس کا خیر مقدم کیا۔ سرکاری طور پر ملحد روس میں اس قسم کا مذہبی جوش شاید ہی کبھی دیکھا گیا ہو۔ یہ قرآنی نسخہ وہ ہے جس کو حضرت عثمان نے تیار کرایا تھا۔ کئی سو سال پہلے یہ نسخہ روس کے شہنشاہ زار کو ملا۔ وہ ان کی راجدھانی سینٹ پیٹرس برگ میں محفوظ رہا۔ ۱۹۱۷ کے بالشویک انقلاب کے بعد وہ تاشقند کے سرکاری میوزیم میں منتقل کر دیا گیا۔ قرآن کا یہ نسخہ اب تک الماریوں میں بند تھا۔ اب اس کو عوامی زیارت کے لیے کھول دیا گیا ہے (صفحہ ۱۱)

یہ واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ نئے روسی حکمراں گورباچوف کے بعد کس طرح اشتراکی روس میں مذہبی امور کے لیے نئے آزاد مواقع کھل گئے ہیں۔ روس میں اشتراکی انقلاب (۱۹۱۷) کے بعد سے پورے ستر سال تک وہاں مذہبی آزادی کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ مگر اوپری پابندیوں کے نیچے لوگوں کے دلوں میں اور ان کے گھروں میں مذہب بدستور زندہ رہا۔ یہاں تک کہ خود روس کے اشتراکی حکمرانوں کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ مذہب سے لڑنا حقیقت واقعہ سے لڑنا ہے۔ اس طرح کی لڑائی میں حقیقت واقعہ تو نہیں بدلتی البتہ لڑنے والے کے حصہ میں بے فائدہ ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔ چنانچہ انھوں نے مذہب کے معاملہ میں اپنی پالیسی بدل دی۔

تاہم روسی مسلمان ان نئے مواقع سے صرف اس وقت فائدہ اٹھا سکتے ہیں جب کہ وہ حکمت اور تدبر کے ساتھ اس کو استعمال کریں۔ اگر انھوں نے غیر حکیمانہ اور غیر دانشمندانہ انداز اختیار کیا تو مواقع بدستور موجود ہوں گے مگر مسلمان اس کا فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔

ہر آزادی محدود آزادی ہے۔ خواہ اشتراکی ملک ہو یا جمہوری ملک، خواہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک، ہر نظام اپنے شہریوں کو محدود آزادی ہی دیتا ہے۔ جو لوگ اس راز کو جانیں، وہ ہر جگہ کامیاب رہیں گے اور جو لوگ اس راز کو نہ جانیں وہ ہر جگہ ناکام۔

قضا و قدر

مارک ٹوین (Mark Twain) ایک انگریزی ادیب اور ناول نگار تھا۔ وہ ۱۸۳۵ میں امریکہ میں پیدا ہوا۔ اور وہیں ۱۹۱۰ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے اپنی آخر عمر میں ایک بار کہا کہ اب میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ اور اپنی زندگی میں بہت سی چیزوں کے لیے فکرمند ہوا ہوں۔ مگر ان میں سے زیادہ تر کبھی وقوع میں نہیں آئیں :

I am an old man and have known a great many troubles, but most of them never happened.

راقم الحروف کا تجربہ بھی یہی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں اور دوسروں کی زندگی میں بہت سے ایسے مواقع دیکھے ہیں جب کہ ایک آدمی کسی صورت حال کے پیش آنے کی وجہ سے سخت پریشان ہوگیا۔ حتیٰ کہ مستقبل کے اندیشہ کی بنا پر اس نے اپنے حال کو برباد کرلیا۔ غم سے نڈھال ہوکر اپنی صحت تباہ کرلی۔ مگر وقت گزرنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ اندیشہ بجائے خود صحیح نہ تھا جس کی وجہ سے آدمی نے اپنے آپ کو اتنا زیادہ پریشانی میں مبتلا کیا تھا۔

اسلام میں اس کا بہترین حل قضا و قدر کا عقیدہ ہے۔ مفصل کلمہ میں یہ بات بطور ایمان شامل کی گئی ہے کہ خیر اور شر دونوں اللہ کی طرف سے آتے ہیں (وبالقدر خیرہ وشرہ)

"کوشش کرنا بندہ کا کام ہے، اور تکمیل تک پہنچانا اللہ کا کام" اور یہ کہ "جو کچھ ہوتا ہے، اللہ کی طرف سے ہوتا ہے" یہ عقیدہ انسان کے لیے موجودہ دنیا میں ایک بے حد عظیم تحفہ ہے۔ وہ انسان کے اندر یہ طاقت پیدا کرتا ہے کہ وہ نقصان کو سہے اور حادثات کو برداشت کرسکے۔

موجودہ دنیا امتحان کی مصلحت کے تحت بنی ہے۔ اس لیے یہاں عین اس کے تخلیقی نقشہ کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی زندگی میں ناموافق حالات پیش آتے ہیں۔ اس کو نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر یہ عقیدہ آدمی کے اندر بیٹھ جائے کہ جو ہوا وہی ہونے والا تھا، اس کے سوا کچھ اور ہونا ممکن نہ تھا تو آدمی کی زندگی نہایت سکون کی زندگی بن جائے، وہ راضی برضا ہوکر ہر حال میں پوری طرح مطمئن رہے۔

حاکم اور محکوم

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ چوتھے خلیفۂ راشد ہیں۔ ان سے پہلے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حالات درست تھے، مگر حضرت علی کے زمانہ میں حالات بگڑ گئے۔ اس سلسلہ میں ایک شخص سے آپ کی گفتگو اس طرح نقل کی گئی ہے :

سألَ رجلٌ علیًا رضی اللہ عنہ ما بالُ المسلمین اختلفوا علیك ولم یختلفوا علیٰ ابی بکر و عمر۔ فقال : لِأنّ ابابکرٍ و عمرَ کانا والِیَین علیٰ مثلی و انا الیومَ والٍ علیٰ مثلك، یُشیرُ إلیٰ وازعِ الدین (مقدمہ ابن خلدون ۲۱۱)

ایک شخص نے علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ مسلمانوں کا کیا حال ہے کہ وہ آپ سے اختلاف کر رہے ہیں حالانکہ انھوں نے ابوبکرؓ اور عمرؓ سے اختلاف نہیں کیا تھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس لیے کہ ابوبکر اور عمر میرے جیسے کے اوپر حاکم تھے اور میں آج تمہارے جیسے کے اوپر حاکم ہوں۔ ان کا اشارہ لوگوں کے دینی رجحان کی طرف تھا۔

خلیفہ چہارم علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومتِ صالحہ کس طرح وجود میں آتی ہے۔ اور اس کے قیام کے اصول و شرائط کیا ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صالح نظام حکومت قائم ہونے کے لیے صرف صالح حکمراں کا ہونا کافی نہیں۔ بلکہ یہ بھی لازمی طور پر ضروری ہے کہ ماتحت عوام میں بقدر ضرورت صلاح کی کیفیت پائی جا رہی ہو۔ اس قول کے مطابق، خلیفہ اول اور خلیفۂ ثانی کی کامیاب حکومت کا راز یہ تھا کہ ان کے زمانہ میں اصحاب رسول بڑی تعداد میں موجود تھے اور معاشرہ پر انھیں کا مزاج غالب تھا۔ مگر خلیفہ چہارم کے زمانہ میں نومسلموں کی کثرت کے بعد اصحاب رسول اقلیت بن گئے اور معاشرہ پر ان لوگوں کا غلبہ ہوگیا جو اصحاب رسول جیسا ذہن اور مزاج نہیں رکھتے تھے۔

حکمراں افراد کی تبدیلی سے پہلے معاشرہ کے افراد کی تبدیلی ضروری ہے۔ معاشرہ اگر بُرا ہو تو صحابیٔ رسول جیسے حکمراں کی موجودگی بھی صالح نظام کے قیام کی ضمانت نہیں بن سکتی۔

یہودی کردار

یہودی کردار دراصل اعتراف نہ کرنے کا دوسرا نام ہے۔ یہ وہ انسان ہے جو کسی بھی مرحلہ میں دوسرے کو تسلیم نہیں کرتا۔ نہ ابتدائی مرحلہ میں اور نہ آخری مرحلہ میں۔ اس کردار کی مثال قرآن میں کتے سے دی گئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ ایسا انسان کتے کی مانند ہے کہ اس کو چھوڑ دو تب بھی ہانپے اور باندھے رکھو تب بھی ہانپے۔ یعنی وہ دوسرے کے فضل کا اعتراف نہ اس وقت کرتا جب کہ وہ تصوراتی حیثیت رکھتا تھا اور نہ اس وقت کرتا جب کہ اس کی شخصیت ایک واقعہ بن چکی ہو۔ (اعراف ۱۷۵)

اس کی وضاحت کے لیے سورہ یوسف کی مثال لیجئے۔ اس سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ حضرت یوسف جب چھوٹے تھے تو ان کے سوتیلے بھائیوں کو ان سے جلن ہوگئی۔ انھوں نے چاہا کہ انھیں مار ڈالیں۔ یہاں تک کہ وہ ان کو گھر سے دور ایک سنسان مقام پر لے گیے اور وہاں ان کو ایک اندھے کنوئیں میں ڈال دیا۔ بظاہر حضرت یوسف کو اس اندھے کنوئیں میں اپنی موت آپ مرجانا چاہیے تھا مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا کیے کہ وہ اس سے نکل کر مصر پہونچے۔ وہاں دوبارہ آپ کے لیے ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ آپ مصر کی حکومت میں اعلیٰ مقام پر فائز ہوگیے۔

اس کے بعد دوبارہ وہ اسباب پیدا ہوئے جس نے حضرت یوسف کے بھائیوں کو حضرت یوسف کے دربار میں اس حال میں پہونچایا کہ حضرت یوسف بڑے تھے اور وہ ان کے سامنے چھوٹے بن کر کھڑے ہوئے تھے۔ اس وقت جب سوتیلے بھائیوں کو معلوم ہوا کہ جس نوجوان کو انھوں نے اندھے کنوئیں میں ڈالا تھا وہ مصر پہونچ کر یہاں کے تخت پر بیٹھا ہوا ہے تو ان کی زبان سے بے اختیار نکلا: خدا کی قسم، اللہ نے تم کو ہم سے اوپر کر دیا (تاللّٰہ لقد اٰثرك اللّٰہ علینا) حضرت یوسف کے بھائیوں نے اگرچہ پہلے مرحلہ میں حضرت یوسف کا اعتراف نہیں کیا تھا مگر دوسرے مرحلہ میں وہ ڈھ پڑے اور کھلے دل سے حضرت یوسف کے فضل کا اعتراف کرلیا۔

حضرت یوسف کے بھائی اگر یہودی ذہنیت کے ہوتے تو وہ کتے کی طرح پہلے بھی ہانپتے اور بعد کو بھی ہانپتے۔ یعنی پہلے اگر وہ جلن میں مبتلا ہوئے تھے تو اب وہ کہہ دیتے کہ مصر کے مشرک بادشاہ کی خوشامد کرکے اس نے مصر میں یہ عہدہ حاصل کیا ہے۔ وہ حضرت یوسف کے معاملہ میں پہلے جس طرح بے انصاف بنے ہوئے تھے بعد کو بھی وہ ان کے حق میں بے انصاف ثابت ہوتے۔

حقیقت پسند بنئے

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری ان کی منفی ذہنیت ہے۔ وہ دنیا کی تمام قوموں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ وہ غیر اقوام کی تمام کارروائیوں کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ ان کے خلاف دشمنی کی بنا پر کی گئی ہیں۔ اس منفی ذہن نے ان کی پوری سوچ کو غیر حقیقت پسندانہ بنا دیا ہے۔ آپ درخت کے نیچے ہیں اور اوپر سے پکا ہوا پھل آپ کے سر پر گر پڑتا ہے، اب اگر آپ یہ سوچیں کہ درخت نے آپ کی ضد میں آپ کے سر پر اپنا پھل گرایا ہے تو کبھی آپ معاملہ کا صحیح حل تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

مثال کے طور پر امریکا فلسطینی مسلمانوں کے مقابلہ میں اسرائیلی یہودیوں کا ساتھ دیتا ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ امریکا مسلمانوں کا دشمن ہے اور اس دشمنی کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن کا ساتھ دے رہا ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ یہ دنیا مفادات کی دنیا ہے۔ امریکہ اس لئے اسرائیل کا ساتھ دیتا ہے کہ اس سے اس کا مفاد وابستہ ہے نہ کہ محض کسی کی ضد یا دشمنی کی وجہ سے۔

اسرائیل کی مدد سے امریکہ دو طرفہ مفاد حاصل کر رہا ہے۔ ایک یہ ہے کہ اس طرح وہ تیل پیدا کرنے والے خلیجی ممالک کو مسلسل دباؤ کی حالت میں رکھے ہوئے ہے۔ اس صورت حال کی بنا پر یہ ممالک مجبور ہیں کہ وہ امریکہ سے امریکہ کی شرائط پر معاملہ کریں نہ کہ خود اپنی شرائط پر۔

دوسرا فائدہ کاروباری فائدہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں ترقی یافتہ ملکوں کا ایک نہایت محفوظ بزنس یہ ہے کہ وہ کمزور یا غیر ترقی یافتہ ممالک کو امداد کے نام پر قرض دیں اور اس پر ان سے سود وصول کریں۔ امداد کی رقم کی واپسی تو قسطوں میں ہوتی ہے مگر سود کی رقم ہر سال پوری کی پوری ادا کی جاتی ہے۔ یہ قرضے ترقیاتی کاموں میں بھی دئے جاتے ہیں مگر ان کی سب سے بڑی مد جدید ہتھیاروں کی خریداری ہے۔ ترقیاتی قرضے تو دوسرے ملکوں سے بھی ملتے ہیں مگر جنگی ہتھیاروں کی تجارت امریکہ کی اجارہ داری ہے۔ اسرائیل اور عربوں میں مسلسل جنگ کی حالت امریکہ کو موقع دے رہی ہے کہ وہ اسرائیل کے ہاتھ قیمتی ہتھیار قرض کی بنیاد پر فراہم کرے اور اس پر اس سے بھاری سود وصول کرے۔ چنانچہ ایک اقتصادی رپورٹ کے مطابق اسرائیل امریکی قرضوں پر سود کی جو رقم ادا کرتا ہے اس کی سالانہ مقدار ۹۱۰ ملین ڈالر ہے۔ عرب ممالک امریکہ سے مہنگے داموں جو ہتھیار خریدتے ہیں ان کی مقدار اس کے علاوہ ہے۔

ایک مشورہ

یوسف اسلام ایک انگریز نومسلم ہیں۔ ان کا پچھلا نام کیٹ اسٹیونس (Cat Stevens) تھا۔ ۱۹۷۷ میں انھوں نے لندن کی ایک مسجد میں اسلام قبول کیا۔

لندن کے انگریزی ماہنامہ دی مسلم (مئی۔ جون ۱۹۸۰) میں یوسف اسلام صاحب کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے۔ انٹرویو لینے والے شخص نے ان سے پوچھا کہ انگلینڈ کے اخبارات مسلسل اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں، اس کا حل کیا ہے۔ یوسف اسلام صاحب نے جواب دیا: لوگ اتنے نادان نہیں ہیں کہ ہر چیز جو اخبار میں چھپے اس پر یقین کرلیں۔ لوگ اپنی رائیں خود بناتے ہیں۔ تاہم اگر وہ مسلمانوں کو مذکورہ برائی میں ملوث دیکھیں گے تو عین ممکن ہے کہ وہ اخبار کی رپورٹ پر یقین کرلیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اصل چیز صورت واقعہ ہے نہ کہ اخبار کی خبر۔ اگر مسلمانوں کی عمومی زندگی اس سے مختلف ہو جو اخبار میں کسی "دشمن اسلام" نے چھاپی ہے تو کوئی بھی پڑھنے والا اس کو کسی قسم کی اہمیت نہیں دے گا۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے اخبار میں یہ چھاپے کہ ہندستان میں جہالت کی شرح سب سے زیادہ عیسائیوں میں ہے۔ پارسیوں میں سب سے زیادہ فقیر ہوتے ہیں۔ سردار قوم سب سے زیادہ بزدل قوم ہے، تو اس قسم کی باتوں سے کوئی بھی اثر نہیں لے گا۔ کیوں کہ یہ باتیں معلوم واقعات کے سراسر خلاف ہیں۔

اسی طرح اگر لوگوں کی نظر میں مسلمانوں کی تصویر اچھی بن جائے تو ان کے بارہ میں لوگوں کے برے بیانات اپنے آپ بے اثر ہو کر رہ جائیں گے۔

اگر لوگوں کی نظر میں مسلمانوں کی عملی تصویر یہ ہو کہ وہ حقیقت پسند ہوتے ہیں۔ وہ آپس میں متحد رہتے ہیں۔ وہ لین دین میں بے انصافی نہیں کرتے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر مشتعل نہیں ہوتے۔ وہ انسان کی جان و مال اور عزت کا احترام کرتے ہیں۔ اگر آج لوگوں کے نزدیک مسلمان ہونے کا مطلب یہ بن جائے تو لوگ اخبارات کی مخالفانہ سرگرمیوں کو کوئی اہمیت نہ دیں گے۔ وہ اس قسم کی رپورٹوں اور خبروں کو اتنا غیر اہم سمجھیں گے کہ سرخی دیکھنے کے بعد شاید وہ اس کا مطالعہ بھی نہ کریں۔

ایک تقابل

پرنسپل نرنجن سنگھ ایم ایس سی (۱۸۹۳-۱۹۷۸) ماسٹر تارا سنگھ کے بھائی تھے۔ (وہ نئی دہلی (ایسٹ پٹیل نگر) میں رہتے تھے۔ ۱۱ اگست ۱۹۷۳ کو ان سے میری تفصیلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس ملاقات کی روداد الجمعیۃ ویکلی (۳۱ اگست ۱۹۷۳) میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کا ایک جزء یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

امرتسر میں ۱۹۱۹ میں آل انڈیا کانگرس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ پرنسپل نرنجن سنگھ اس میں شریک تھے۔ انھوں نے بتایا کہ اس اجلاس میں بال گنگا دھر تلک، موتی لال نہرو، اینی بسنٹ، اور دوسرے بڑے بڑے قومی لیڈر موجود تھے۔ مہاتما گاندھی بھی اگرچہ اس اجلاس میں شریک تھے۔ مگر بظاہر وہ اتنے غیر اہم دکھائی دیتے تھے کہ اسکول کے لڑکوں نے جب دوسرے شاندار لیڈروں کے ساتھ انھیں اسٹیج پر بیٹھا ہوا دیکھا تو کہا: یہ گھاس کاٹنے والا کہاں سے آگیا۔

تلک نے اس اجلاس میں کامل آزادی کا رزولیوشن پیش کیا۔ دوسرا رزولیوشن گاندھی جی کا تھا۔ اس میں ڈومینین اسٹیٹس کی تجویز رکھی گئی تھی۔ دونوں کی تقریروں کے بعد ووٹنگ ہوئی تو گاندھی جی کو ۲۱۷ ووٹ اور تلک کو ۱۲۳ ووٹ ملے۔ گاندھی جی کا رزولیوشن کثرت رائے سے منظور ہو گیا۔

پرنسپل نرنجن سنگھ نے یہ قصہ بتانے کے بعد کہا کہ تلک کے مقابلہ میں گاندھی جی کی یہ جیت اس وقت بڑی حیرت ناک تھی۔ اسٹیج سے جب نتیجہ کا اعلان کیا گیا تو لڑکوں نے دوبارہ نعرہ لگایا: وہ گھسیارہ جیت گیا، وہ گھسیارہ جیت گیا۔

بال گنگا دھر تلک ایک انقلابی ذہن کے آدمی تھے۔ وہ ہمیشہ بلند بانگ انداز (high-profile) میں بولتے تھے۔ گاندھی جی اس کے برعکس ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔ وہ دھیمے انداز (low-profile) میں کلام کرتے تھے۔ چنانچہ تلک (اور مسلمانوں کے اکثر لیڈر) پہلے ہی مرحلہ میں یہ چاہتے تھے کہ انگریزوں سے کامل آزادی کی مانگ کریں۔ جب کہ گاندھی جی حالات کی رعایت کرتے ہوئے تدریجی انداز میں آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ ابتدائی مرحلہ میں بہت سے لوگوں کو تلک جیسے افراد عظیم معلوم ہوتے تھے اور گاندھی بظاہر حقیر دکھائی دیتے تھے۔ مگر جب تاریخ نے آخری فیصلہ کیا تو دنیا نے دیکھا کہ گاندھی قائد کے مقام پر کھڑے ہوئے ہیں اور تلک جیسے لوگوں کو صرف پچھلی صف میں جگہ ملی ہے۔

توازن ، تدریج

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ "توازن" قومی ترقی کے لئے شاہ کلید ہے۔ یعنی متوازن عمل کے ذریعہ ہی ہم قومی ترقی کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ قومی ترقی کے عمل کے لئے کلیدی لفظ تدریج ہے۔ نہ کہ توازن۔

توازن بھی ایک اصول ہے اور تدریج بھی ایک اصول۔ مگر ہر ایک کا مقام استعمال الگ ہے۔ شاعر کی زبان میں ہر بات کا ایک محل ہوتا ہے اور ہر نکتہ کا ایک مقام :

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مکانے دارد

جو لوگ قومی ترقی کے عمل میں توازن کو شاہ کلید بتاتے ہیں وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں اصرار کر رہے ہیں کہ ہم کو ہر محاذ پر بیک وقت ہمہ جہتی عمل کرنا ہوگا۔ ذہنی بیداری اور تعلیم جیسے کاموں کے ساتھ عین اسی وقت سیاسی عمل اور حقوق طلبی کی مہم بھی پوری طاقت کے ساتھ جاری کرنا ہوگا۔ ورنہ ہم زندگی کی دوڑ میں ناقابل عبور حد تک پیچھے ہو جائیں گے۔

حتی کہ ان حضرات کا کہنا ہے کہ "اگر کوئی قوم صرف تعلیم یا اقتصادیات کے محاذ کو لے کر بیٹھ جائے اور اپنے حقوق کو حاصل کرنے اور ریاست میں دوسروں کے شانہ بشانہ چلنے کی کوشش نہ کرے تو وہ حقوق سے تو محروم ہی رہے گی، خود تعلیم اور اقتصادیات کو حاصل کرنے کے مواقع بھی اس کو نہیں مل سکتے۔"

اس قسم کے مضامین یہ مان کر لکھے جاتے ہیں کہ ابھی تک ہم کو قومی اور سیاسی حقوق حاصل نہیں ہوئے ہیں۔ ان کو حاصل کرنا ابھی باقی ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ مذکورہ قسم کے قائدین اور دانشوروں کی اپنی اولاد تعلیمی اور اقتصادی میدان میں اعلیٰ ترقیات حاصل کر رہی ہیں۔ اور وہ فخر کے ساتھ اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ ملت کی تعلیمی اور اقتصادی ترقی کے لئے تو ضروری ہے کہ پہلے سیاسی حقوق کی منزل طے کی جائے مگر خود ان حضرات کی اپنی اولادیں اس منزل کے طے ہونے سے پہلے ہی تمام ترقیاں حاصل کر رہی ہیں۔

اس قسم کی باتیں کرنے والوں کا حال یہ ہے کہ انھوں نے خود اپنے بیٹوں کو سمندر پار کے

ملکوں میں تعلیم و ترقی کے لئے بھیج رکھا ہے یا ان کو ملک کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے ہوسٹلوں میں داخل کر رکھا ہے جہاں وہ ملی سیاست کے ماحول سے الگ رہ کر تعلیمی ترقی کے مراحل طے کر رہے ہیں۔ وہ انھیں قومی حقوق کی سیاست سے پوری طرح دور رکھتے ہیں۔ اپنے بیٹوں کے لئے ترقی کا راز وہ سیاست سے علیحدگی میں سمجھتے ہیں۔ اور قوم کے بیٹوں کے لئے ترقی کا راز سیاست کے طوفان میں غوطہ خوری ہیں۔

ان حضرات کی یہ دہرا پالیسی بتاتی ہے کہ یا تو انھیں اپنی بات پر یقین نہیں، یا ان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے بیٹوں کے معاملہ میں سنجیدہ ہیں اور قوم کے بیٹوں کے معاملہ میں غیر سنجیدہ۔

اب توازن اور تدریج کے معاملہ کو ایک اصولی مثال کے ذریعہ سمجھئے۔ ایک شخص دو ہزار روپیہ مہینہ کماتا ہے۔ اگر وہ ایسا کرے کہ اس میں سے ایک ہزار روپیہ تفریحی مدوں میں خرچ کر دے تو اس سے کہا جائے گا کہ توازن کے ساتھ خرچ کرو۔ یعنی اپنی آمدنی کے لحاظ سے اپنا بجٹ بناؤ۔ جو مد زیادہ اہم ہے اس میں زیادہ رقم لگاؤ اور جو مد کم اہم ہے اس میں کم رقم خرچ کرو۔ آمد اور خرچ میں ہم آہنگی قائم کرنے کا مسئلہ ہو تو اس کے لئے کلیدی لفظ توازن ہوگا۔

اب دوسری مثال لیجئے۔ ایک شخص کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اب اگر توازن کے اصول کو منطبق کرتے ہوئے باپ ایسا کرے کہ جس طرح وہ بچہ کی غذا اور حفاظت کا انتظام کرتا ہے اسی طرح وہ اول روز سے اس کے کان میں سیاست کے اسباق بھی داخل کرنا شروع کر دے۔ وہ اس کو جنس کے رموز سمجھانے کے لئے بھی ایک معلم مقرر کر دے۔ اگر کوئی باپ اس طرح اپنے بچہ کی متوازن تربیت شروع کر دے تو یہ بلاشبہہ ایک لغو فعل ہوگا۔ کیوں کہ یہ زندگی کا معاملہ ہے۔ اور زندگی کا ارتقاء ہمیشہ تدریج کے اصول پر ہوتا ہے نہ کہ توازن کے اصول پر۔

توازن بجائے خود ایک اعلیٰ اصول ہے۔ مگر زندگی کی تعمیر کے معاملہ میں کلیدی لفظ توازن نہیں ہے بلکہ تدریج ہے۔ تدریج کے اصول پر عمل کر کے ہی ہم ترقی کی منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔ توازن کے اصول پر عمل کرنے کی صورت میں ہم کہیں نہیں پہنچیں گے۔ خود ہماری قریبی تاریخ میں اس کی واضح مثال موجود ہے۔

اورنگ زیب (۱۷۰۷ - ۱۶۱۸) سے لے کر اب تک کی تاریخ بتاتی ہے کہ برصغیر ہند کے مسلمان سترھویں صدی کے آخر سے لے کر بیسویں صدی کے آخر تک پورے تین سو سال سے

سیاست کے محاذ پر مسلسل زور آزمائی کر رہے ہیں۔ اس طویل مدت میں ایک دن کے لئے بھی انھوں نے یہ "غیر متوازن" طریقہ اختیار نہیں کیا کہ اپنی ساری طاقت صرف ذہنی بیداری کے محاذ پر لگادیں اور سیاست کے عملی محاذ کو خالی چھوڑ دیں۔ اس تین سو سالہ متوازن عمل کے باوجود ملت کی بربادی میں صرف اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ ملت کا احیاء اب تک کسی بھی درجہ میں واقعہ نہ بن سکا۔ کیا یہ تجربہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ۲۳ سالہ عمر نبوت میں مکمل طور پر تدریجی انداز میں عمل فرمایا۔ چنانچہ ابتدائی ۱۳ سال تک آپ پوری طرح سیاست اور جہاد کے میدان سے دور رہے۔ اس مدت میں آپ کی ساری کوشش اس امر پر مرتکز رہی کہ آپ لوگوں کے اندر ایمان کی اسپرٹ مکمل طور پر بیدار کر دیں۔ گویا نصف سے زیادہ مدت میں آپ نے عملی سیاست سے "صبر" کا طریقہ اختیار فرمایا نہ کہ اس میں داخل ہونے کا۔

موجودہ زمانہ میں جاپان اس طریق کار کی ایک مثال ہے۔ ۱۹۴۵ کے بعد اس نے قومی حقوق کی سیاست کو یکسر ترک کر دیا اور صرف سائنسی تعلیم اور ٹکنکل ریسرچ کے میدان میں اپنی ساری توجہ لگا دی۔ حالات بتاتے ہیں کہ جاپان نے ۳۰ سالہ "غیر متوازن" محنت سے وہ کامیابی حاصل کر لی جو مسلمان ۳۰۰ سالہ "متوازن" محنت کے بعد بھی حاصل نہ کر سکے۔

ہندستان میں عیسائی فرقہ عملی سیاست سے بالکل الگ رہتا ہے۔ مگر تعلیم کے میدان میں وہ تمام فرقوں سے آگے ہے۔ مسلمان تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد مسلسل سیاست کے ہنگاموں میں مشغول رہے۔ اس کے باوجود، ایجوکیشن منسٹری کی رپورٹ کے مطابق، مسلمان سب سے زیادہ تعلیمی پسماندگی میں مبتلا ہیں۔ حتی کہ تعلیم کے میدان میں وہ ہریجنوں سے بھی زیادہ پیچھے جا چکے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں صحیح طریقہ تدریج کا ہے نہ کہ توازن کا۔ تجربہ اور اصول دونوں اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ ساری قوت ابتدائی تعمیر کے محاذ پر لگا دی جائے۔ اس وقت ہم تاریخ کے آغاز میں ہیں، ہم تاریخ کے اختتام میں نہیں ہیں۔ اور جو لوگ تاریخ کے آغاز میں ہوں ان کے لئے عمل کا اصول صرف ایک ہے۔ اور وہ وہی ہے جس کو الاقدم فالاقدم کہا گیا ہے۔ اسی کا دوسرا نام تدریج ہے۔

امکانات

وزیر اعظم ہند مسٹر راجیو گاندھی نے جون ۱۹۸۵ میں امریکہ کا دورہ کیا تھا۔ اس موقع پر امریکہ میں " فیسٹول آف انڈیا " کا اہتمام کیا گیا۔ وہاں جو مختلف پروگرام کئے گئے ان میں سے ایک کی نگراں مس مورا موائنی ہن تھیں۔ ٹائمس آف انڈیا اور ہندستان ٹائمس (۸ جون ۱۹۸۵) میں مس مورا موائنی ہن کی ایک تصویر چھپی ہے۔ امریکی خاتون ایک ہندستانی لڑکی کو اپنے پاس بیٹھائے ہوئے ہیں۔ تصویر کے نیچے جو مضمون درج ہے اس کی چند سطریں یہ ہیں :

> Maura Moynihan, who is fluent in Hindi, is one of the project coordinators for Aditi. Maura's father, Dr. Daniel Patrick Moynihan, is a former U.S. ambassador to India.

یعنی مورا موائنی ہن جو کہ روانی کے ساتھ ہندی بولتی ہیں وہ آدیتی پروگرام کی نگرانوں میں سے ایک ہیں۔ مورا ـــــ ڈاکٹر ڈینیل پیٹرک موائنی ہن کی صاحبزادی ہیں جو کہ امریکہ کی طرف سے ہندستان کے سفیر رہ چکے ہیں۔

یہ واقعہ ہندستان میں ایک نئے دور کی آمد کی علامت ہے۔ آزادی سے پہلے ہندستان میں جو مغربی اشخاص آئے تھے ان کے بارے میں عام طور پر یہ پڑھنے میں آتا ہے کہ وہ رواں اردو بولتے تھے۔ اب مغرب کے جو افراد ہندستان آکر کچھ دن قیام کرتے ہیں ان کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ روانی کے ساتھ ہندی بولتے ہیں۔

آزادی سے پہلے مختلف تاریخی اسباب کی بنا پر یہ حال تھا کہ اردو بولنے والی قوم کو ممتاز درجہ حاصل تھا۔ باہر سے آنے والے لوگوں سے اس کا کافی ربط رہتا تھا۔ اردو زبان اور اردو قوم کی اہمیت اس وقت اتنی مسلم تھی کہ مغرب سے آنے والے لوگ اپنی کامیابی کے لئے ضروری سمجھتے تھے کہ وہ اردو زبان سیکھیں۔

اب صورت حال بدل گئی ہے۔ اردو بولنے والی قوم آزاد ہندستان میں ہر لحاظ سے غیر اہم

ہوگئی ہے۔ دوسری طرف ہندی بولنے والی قوم نے یہاں ہر اعتبار سے اہمیت کا درجہ حاصل کرلیا ہے چنانچہ مغرب کے نئے آنے والوں کا رابطہ اب ہندی بولنے والے گروہ سے قائم ہوتا ہے۔ وہ ہندستان آ کر انھیں کی زبان سیکھتے ہیں۔

اردو بولنے والوں نے مواقع سے فائدہ نہیں اٹھایا یہاں تک کہ قانون قدرت کے تحت وہ تمام مواقع سے محروم کر دئے گئے۔

قدیم ہندستان کا اندازہ کرنے کے لئے یہاں دو حوالے نقل کئے جاتے ہیں۔ مہاتما گاندھی نے اپنے "اخبار" ہریجن" کی اشاعت ۲۹ اکتوبر ۱۹۳۸ میں لکھا تھا:

> "ہندو ایسے ہزاروں ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے اور جو بجا طور پر اردو کے عالم کہے جاسکتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک پنڈت موتی لال نہرو اور دوسرے ڈاکٹر تیج بہادر سپرو ہیں"۔

دوسرا حوالہ سابق وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو کے شادی کارڈ کا ہے۔ پنڈت نہرو کی شادی ۱۹۱۶ میں ہوئی تھی۔ اس وقت ان کی شادی کا جو دعوت نامہ چھاپا گیا تھا وہ اردو زبان میں تھا۔ یہ دعوت نامہ آج بھی الٰہ آباد میوزیم کے نہرو سکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس دعوت نامہ کے الفاظ یہ تھے:

> "تمنا ہے کہ بتقریب شادی برخوردار جواہر لال نہرو ساتھ دختر پنڈت جواہر مل کول بمقام دہلی بتاریخ ۷ فروری ۱۹۱۶ تقاریب مابعد تواریخ ۸ - ۹ فروری ۱۹۱۶ جناب مع عزیزان شرکت فرماکر مسرت و افتخار بخشیں۔
>
> پنڈت موتی لال نہرو، آنند بھون ، الٰہ آباد

نادر مثال

انگریزی ہفت روزہ گارجین میں ایک خبر چھپی ہے جس کا عنوان ہے ـــــ ایک ریاضی داں جس نے ایک لاکھ پچاس ہزار پاؤنڈ کے انعام کو رد کر دیا:

The mathematician who turned down a £150,000 prize

فرانس کے ریاضی کے داں الگزنڈر گراتھنڈیک (Alexandere Grothendieck) جن کو اس سے پہلے متعدد سائنسی اعزازات مل چکے ہیں، ۱۹۸۶ میں انھیں سویڈن کی رائل اکاڈمی نے کرافورڈ انعام (Crafoord prize) انعام دیا جو نوبل انعام کے برابر معزز سمجھا جاتا ہے۔ اس اعزاز کے ساتھ ایک لاکھ پچاس ہزار پاؤنڈ (تقریباً ۲۷ لاکھ روپیہ) کی رقم بھی شامل تھی۔ مگر فرانسیسی سائنسداں نے اس انعام کو لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنے انکاری خط میں اس کا تین سبب بتایا ہے۔ اول یہ کہ مالی اعتبار سے مجھے اس رقم کی ضرورت نہیں۔ دوسرے یہ کہ انعام کے اس طریقے سے مجھے اتفاق نہیں کہ غیر مشہور لوگوں کو نظر انداز کرکے صرف کچھ مشہور لوگوں کو اعزازات دئے جاتے رہیں۔ تیسری وجہ ان کے الفاظ میں یہ ہے:

> The work which has earned for me the Royal Academy's kindly attention goes back 25 years to a period when I was part of the scientific community. I quit this community in 1970. Now in the past two decades, the ethics of the scientific profession have become so degraded that wholesale plundering of ideas has become almost the general rule among scientists. It is at any rate tolerated by all, including the most glaring and iniquitous cases. Under the circumstances, agreeing to play along with the practice of granting prizes and rewards would also be endorsing a spirit and a development in the scientific world that I see as deeply unhealthy. It is this third reason which in my view is by far the most serious.
>
> *Guardian Weekly*, Manchester, May 15, 1988

وہ تحقیق جس نے مجھے رائل اکیڈمی کی عنایت سے سرفراز کیا ہے، وہ ۲۵ سال پہلے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس وقت میں سائنٹفک کیمونٹی کا ایک حصہ تھا۔ میں نے اس کیمونٹی کو ۱۹۷۰ میں چھوڑ دیا۔ اب پچھلے ۲۰ برسوں میں سائنسی پیشہ کی اخلاقیات میں اتنا زیادہ تنزل آچکا ہے کہ افکار کی قزاقی اب سائنس دانوں کے درمیان تقریباً عام بات ہے۔ اس صورتحال کو آج تمام لوگ برداشت کر رہے ہیں۔

حتیٰ کہ بے انصافی کے انتہائی کھلے ہوئے واقعات میں بھی۔ ان حالات میں انعام دینے کے عمل میں شرکت پر راضی ہونا، سائنسی دنیا میں ہونے والے ایک ایسے عمل کی تصدیق کرنا ہے جس کو میں بہت زیادہ غیر صحت مند سمجھتا ہوں۔ یہی تیسری چیز ہے جو میری نظر میں سب سے زیادہ سنگین ہے۔

انعام کی رقم کو اپنی ذات کے لئے نہ لینا بجائے خود کوئی بہت بڑا واقعہ نہیں۔ موجودہ زمانہ میں اس طرح کے واقعات کثرت سے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر مدر ٹریسا کو بہت سے بڑے بڑے مالی انعام بشمول نوبل انعام ملے۔ مگر انھوں نے ان تمام انعامات کو معذوروں کے ادارہ کو دے دیا۔ مگر فرانسیسی سائنس داں نے جس چیز کا ثبوت دیا ہے وہ انتہائی نادر ہے۔ یہ اصول پسندی کی خاطر خود اپنی کمیونٹی کا ناقد بننا ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کسی نہ کسی گروہ سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اس گروہ کے لوگوں میں بے اصولیاں دیکھتا ہے مگر وہ ان پر گرفت نہیں کرتا۔ وہ ان کو غلط جانتے ہوئے انھیں برداشت کرتا رہتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ایسا کرنے کے بعد میں اپنے گروہ سے کٹ جاؤں گا۔ اور اپنے گروہ سے کٹنا اس دنیا میں اپنے آپ کو بے زمین بنالینا ہے۔

یہ اصول پسندی کی اعلیٰ ترین قسم ہے کہ آدمی اپنے گروہ کی غلطیوں پر چپ نہ رہ سکے۔ حتیٰ کہ اپنی اس اصولی حیثیت کی حفاظت کے لئے وہ اپنے گروہ کی طرف سے ملنے والے مفادات سے اپنے آپ کو محروم کرلے۔

ایسے لوگ آپ کو بے شمار ملیں گے جو غیر کمیونٹی کے خلاف بولنے کے مجاہد بنے ہوئے ہوں۔ مگر وہ شخص کہیں نظر نہیں آتا جو خود اپنی کمیونٹی کے خلاف زبان و قلم سے جہاد کرے۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ غیر کمیونٹی کے خلاف لسانی جہاد کرنے سے لیڈری ملتی ہے۔ جب کہ اپنی کمیونٹی کے خلاف لسانی جہاد کرنے والا اپنے ماحول میں نکو بن جاتا ہے۔ وہ ملی ہوئی قیادت کو بھی کھو دیتا ہے۔

گہرا کام

لندن میں ۱۸۸۳ میں فیبین سوسائٹی (Fabian Society) قائم ہوئی۔ اس کا مقصد صنعتی انقلاب سے پیداشدہ معاشی نابرابری کو ختم کرنا تھا۔ اور سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ سوشلزم کے انداز کا نظام لانا تھا۔ اس سوسائٹی میں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوئے ان میں سے ایک جارج برنارڈشا (۱۹۵۰-۱۸۵۶) تھا۔ برنارڈشا بہت موثر تقریر کرتا تھا۔ اس نے اپنی تقریروں اور مضامین کے ذریعہ اس تحریک کے گرد ایک بھیڑ جمع کرلی اس کے بعد اس نے عوامی مظاہرہ کا منصوبہ بنایا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک جلوس نکالا۔ اس جلوس میں زیادہ تر درمیانی طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ یہ لوگ جب مارچ کرتے ہوئے لندن کے ان علاقوں میں پہونچے جہاں بڑے بڑے دولت مند رہتے تھے تو ان کے کچھ افراد تشدد پر اتر آئے اور توڑ پھوڑ کرنے لگے۔

اس پہلے تجربہ کے بعد ہی برنارڈشا جلوس اور مظاہرہ کا سخت مخالف ہوگیا۔ اس نے کہا کہ عوام کو "پُرامن مظاہرہ" کا پابند رکھنا انتہائی حد تک مشکل ہے۔ اس لیے ہم اپنے مقصد کے لیے مظاہرہ کے بغیر جدوجہد کریں گے۔ اس کے بعد فیبین سوسائٹی پریس، اجتماعات، علمی ریسرچ وغیرہ جیسے غیر مظاہراتی طریقوں کی پابند رہ کر کام کرنے لگی۔ فیبین سوسائٹی نے جارج برنارڈشا اور اس کے ساتھیوں کی رہنمائی میں تدریجی طریقہ کار کی ناگزیریت (Inevitableness of gradualism) پر زور دیا۔ اس تحریک کے لوگ سوشلزم کو مانتے ہیں مگر وہ ارتقائی سوشلزم پر عقیدہ رکھتے ہیں نہ کہ انقلابی سوشلزم پر:

The Fabians put their faith in evolutionary Socialism rather than in revolution (EB–IV720).

غیر مظاہراتی طریق عمل اختیار کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ موجودہ دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ اس کام میں اپنے آپ کو روکنا پڑتا ہے۔ توسیع کے بجائے استحکام پر قانع ہونا پڑتا ہے۔ شہرت اور مقبولیت کے مواقع ہوتے ہوئے اپنے آپ کو گمنامی میں دفن کرنے کے لیے راضی ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ فیبین سوسائٹی کے ساتھ یہ سب کچھ پیش آیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ فیبین سوسائٹی

نے برطانیہ میں اپنی ایک زبردست تاریخ بنائی ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ برطانی عظمت کو قائم رکھنے کے لیے اسے اپنی ذاتی عظمت سے دستبردار ہونا پڑا۔

چنانچہ فیبین سوسائٹی کبھی برطانیہ کی عوامی تحریک نہ بن سکی۔ ۱۹۴۶ کا زمانہ اس کے عروج کا زمانہ شمار کیا جاتا ہے۔ مگر اس عروج کے زمانہ میں بھی فیبین سوسائٹی کے ممبروں کی تعداد ساڑھے آٹھ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ وہ ہمیشہ "خواص" کی تحریک شمار کی جاتی رہی۔ اس طریق کار کے بارہ میں اس کے اندر رائے کے اختلافات بھی ہوئے۔ اس کے کچھ ممبروں نے اصرار کیا کہ تحریک کو عوامی انداز پر چلایا جائے۔ مگر سوسائٹی کے رہنماؤں نے اس کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ فیبین سوسائٹی نے اپنی فکری سرگرمیوں کے ذریعہ برطانیہ کے ذہین طبقہ پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔ ملک کی عام آبادی میں اس کے ارکان کی تعداد اگرچہ ایک فی صد سے بھی کم تھی مگر یہ تمام لوگ اعلیٰ ذہنی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اگلے مرحلہ میں برطانیہ کی لیبر پارٹی میں شریک ہوگئے۔ وہ لیبر پارٹی کا دماغ بن گئے۔ چنانچہ ۱۹۴۵ کے انتخابات میں لیبر پارٹی برطانیہ میں برسراقتدار آئی تو اس کے ممبرانِ پارلیمنٹ کی نصف تعداد وہ تھی جو فیبین سوسائٹی سے تعلق رکھتی تھی۔ وزیر اعظم اٹیلی بھی اس کے ایک ممبر تھے۔

۱۹۴۵ سے پہلے برطانیہ میں سرونسٹن چرچل کی پارٹی برسراقتدار تھی۔ چرچل وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز تھے۔ انھوں نے برطانی مقبوضات کو آزاد کرنے کا مطالبہ یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ: میں یہاں اس لیے نہیں ہوں کہ سلطنت برطانیہ کے خاتمہ کی تقریب کی صدارت کروں۔ مگر فیبین سوسائٹی کے افراد کے زیر اثر لیبر پارٹی نے پورے معاملہ پر ازسرنو غور کرنا شروع کیا۔ ان کے حقیقت پسندانہ انداز فکر نے انھیں بتایا کہ نوآبادیاتی مقبوضات کو آزاد کرنا برطانیہ کے لیے کھونے سے زیادہ پانے کے ہم معنی ہے۔ فیبین دماغ کے تحت ہی برطانیہ کے لیے یہ ممکن ہوا کہ ۱۹۴۷ میں ہندستان کو پُرامن طور پر آزاد کر کے برصغیر میں اپنے مفادات کو ازسرنو محفوظ کر لے۔

عوامی اشو کھڑا کر کے بھیڑ اکھٹا کر لینا بہت آسان ہے۔ مگر اس قسم کی بھیڑ کبھی تاریخ نہیں بناتی۔ تاریخ بنانے کے لیے ہمیشہ اعلیٰ ذہن درکار ہوتے ہیں۔ اعلیٰ ذہن کو جمع کرنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ عوامی انداز کے ہنگاموں سے بچا جائے اور تحریک کو اول سے آخر تک سنجیدہ فکری انداز میں چلایا جائے۔

بے خبری

مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب "آزادئ ہند" (India Wins Freedom) کے ۳۰ صفحات مصنف کی وصیت کے مطابق مہر بند کر دیئے گئے تھے۔ اب تیس سال پورے ہونے کے بعد وہ چھاپے گئے ہیں۔ ان صفحات میں بتایا گیا ہے کہ جواہر لال نہرو (سابق صدر کانگرس) کی دو غلطیاں بڑی حد تک تقسیم ہند کا سبب بنیں۔

جواہر لال نہرو سے پہلی غلطی ۱۹۳۷ کے الکشن کے بعد ہوئی۔ یہ الکشن انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ کے تحت ہوا تھا۔ اس الکشن میں مسلم لیگ کو پورے ملک میں سخت دھکا لگا تھا۔ صرف دو صوبوں (بمبئی اور یوپی) میں وہ کچھ کامیابی حاصل کر سکی تھی۔ الکشن کے نتائج سے مسلم لیگ کی علٰحدگی پسندی کے رجحان پر زد پڑی۔ اس نے کانگرس کے ساتھ وزارت میں شامل ہونے کی پیش کش کی۔ مسلم لیگ چاہتی تھی کہ اس کے دو لیڈر، چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں کو ریاستی کیبنٹ میں لے لیا جائے۔ مگر نہرو نے دونوں میں صرف ایک کو لینے پر رضامندی ظاہر کی۔ نہرو کی یہ تجویز مسلم لیگ کے لیے قابلِ قبول نہ تھی۔ چنانچہ وہ کانگریس کے قریب آکر دوبارہ اس سے دور ہو گئی۔

جواہر لال نہرو کی دوسری سیاسی غلطی وہ ہے جو انھوں نے ۱۹۴۶ میں کی۔ اس وقت مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے کیبنٹ مشن پلان کے تحت متحدہ ہندستان کی تجویز کو منظور کر لیا تھا۔ اس طرح مسلم لیگ دوبارہ تقسیم کے نظریہ سے ہٹ کر متحدہ ہندستان کے نظریہ کے قریب آگئی تھی۔ مگر نہرو نے صدر کانگریس کی حیثیت سے جولائی ۱۹۴۶ میں ایک پریس کانفرنس کی۔ اس میں انھوں نے اعلان کر دیا کہ کانگریس آئندہ کیبنٹ مشن پلان کو تبدیل (Modify) کر سکتی ہے۔ مسٹر جناح اس بات پر سخت ناراض ہوئے۔ وہ کانگریس سے ہمیشہ کے لیے دور ہو گیے جس کا آخری نتیجہ ملک کی تقسیم (۱۹۴۷) کی صورت میں برآمد ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ کیبنٹ مشن پلان آزاد ہندستان کے constitution کی بنیاد تھا۔ اس کو منقسم ہندستان کے بجائے متحد ہندستان کے تصور پر بنایا گیا تھا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ مسٹر جناح نے اس کے بعد کہا کہ اگر کانگریس کیبنٹ مشن کی پابند نہ ہو اور اس کے نقشہ کو دستورساز

اسمبلی میں اپنی اکثریت کے زور پر بدل دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اقلیتیں صرف اکثریت کے رحم و کرم پر ہوں گی :

Jinnah argued that if the Congress did not stick to the plan as accepted and changed the scheme through its majority in the constituent assembly, that would mean minorities would be placed at the mercy of the majority.
(*Indian Express*, October 30, 1988)

مولانا آزاد کے " تیس صفحات " میں جب میں نے یہ بات پڑھی تو مجھے قرآن کی ایک آیت یاد آگئی۔ اس آیت کے الفاظ یہ ہیں : كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ (کتنے چھوٹے گروہ ہیں جو بڑے گروہ پر غالب آتے ہیں، اللہ کے اذن سے)

میں نے سوچا کہ کیسے عجیب تھے وہ مسلم لیڈر جن کو نہرو کا بیان معلوم تھا مگر انھیں خدا کا بیان معلوم نہ تھا۔ انھیں اقلیت اور اکثریت کی یہ منطق معلوم تھی کہ دستور ساز اسمبلی میں تعداد کی کمی انھیں اکثریتی فرقے کے ماتحت بنا دے گی۔ مگر وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ اس سیاسی منطق کے اوپر بھی ایک منطق ہے اور وہ یہ طاقت رکھتی ہے کہ خود اکثریت کے اوپر اقلیت کو بالا کر دے۔

مسئلہ کا حل

ستمبر ۱۹۸۹ میں میں ایک بیرونی سفر پر تھا۔ اس سفر کے دوران میری ملاقات ایک شیعہ بزرگ محمد عباس کاظمی سے ہوئی۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ کے انقلاب میں وہ لاہور چلے گئے اب وہ ایک پاکستانی شہری کی حیثیت سے لاہور میں رہتے ہیں۔

گفتگو کے دوران میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے برصغیر ہند کا ۱۹۴۷ سے پہلے کا زمانہ بھی دیکھا ہے، اور ۱۹۴۷ کے بعد کا بھی۔ یہ بتائیے کہ دونوں زمانوں میں آپ نے کیا فرق پایا۔ انھوں نے غم انگیز لہجہ میں جواب دیا ــــ بس یہ فرق ہے کہ غیر منقسم ہندستان میں ہندو اور مسلمان کے درمیان جھگڑے ہوتے تھے، اب پاکستان میں شیعہ اور سنی کے درمیان وہی جھگڑے ہو رہے ہیں (الرسالہ مارچ ۱۹۹۰، صفحہ ۳۲ ـ ۳۳)

اسی نوعیت کا ایک شیعہ سنی جھگڑا کراچی میں ۱۴ جولائی ۱۹۹۱ کو ہوا۔ شیعہ فرقہ کا ایک جلوس سنیوں کی مسجد کے سامنے سے گزرا۔ اس پر سنیوں کو اعتراض ہوا۔ انھوں نے مطالبہ کیا



Policemen in Karachi wielding lathis against Sunni Muslims who tried to block a procession by Shia Muslims outside the Karachi Mosque on Sunday. — AP/PTI

کہ جلوس کی روٹ بدلی جائے۔ شیعہ لوگ روٹ بدلنے پر راضی نہیں ہوئے۔ اس پر دونوں میں لڑائی شروع ہوگئی جس میں پولیس کو مداخلت کرنی پڑی۔ مقابل کی تصویر (ٹائمس آف انڈیا ۱۶ جولائی ۱۹۹۱) میں پولیس سنی فرقہ کے لوگوں پر لاٹھی چارج کر رہی ہے جو شیعہ جلوس کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پاکستان اس لئے بنوایا گیا تھا کہ غیر منقسم ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جھگڑے ہوتے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کے لیڈروں نے کہا کہ ہمیں ایک خطہ چاہئے جہاں سب مسلمان ہوں۔ تاکہ وہاں جھگڑے نہ ہوں اور ہم امن وسکون کے ساتھ رہ سکیں۔ مگر جب پاکستان بن گیا تو معلوم ہوا کہ مسلم لینڈ میں بھی وہی تمام جھگڑے جاری ہیں جو صرف ہندو لینڈ کی خصوصیت سمجھے جاتے تھے۔

اصل یہ ہے کہ جھگڑے کا تعلق ہندو لینڈ اور مسلم لینڈ سے نہیں۔ جھگڑے کا تعلق جھگڑا کرنے والوں کے مزاج سے ہے۔ اگر لوگوں کے اندر تحمل کا مزاج ہو تو کہیں جھگڑا نہیں ہوگا۔ اور اگر تحمل کا مزاج نہ ہو تو ہر جگہ جھگڑا ہوگا، خواہ وہ کوئی بھی جگہ کیوں نہ ہو۔

زندگی خلاف مزاج باتوں کو برداشت کرنے کا نام ہے۔ اس برداشت کے بغیر کہیں بھی امن وسکون کا ماحول نہیں بن سکتا۔ خاندان کے اندر بھی اس کی ضرورت ہے۔ بستی کے اندر بھی اور پورے ملک کے اندر بھی۔ ایک فرقہ کے سماج میں بھی اسی سے امن قائم ہو سکتا ہے اور کئی فرقہ کے سماج میں بھی۔

جہاں بھی کچھ انسان مل کر رہیں، خواہ وہ ایک مذہب اور کلچر کے ہوں یا کئی مذہب اور کلچر کے۔ وہاں لازماً ایک دوسرے کے درمیان ٹکراؤ کے مواقع پیدا ہوں گے۔ ان مواقع کی پیدائش کو بند نہیں کیا جا سکتا، البتہ ان کو نقصان کی حد تک جانے سے روکا جا سکتا ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ جب ٹکراؤ کی نوبت آئے تو اس کو حسن تدبیر سے دفع کرنے کی کوشش کی جائے۔ اعراض اور صبر کے ذریعہ اس کو اس کے ابتدائی مرحلہ میں ختم کر دیا جائے۔ اس کے سوا جو بھی صورتیں ہیں وہ سب مسئلہ کو بڑھانے کی صورتیں ہیں نہ کہ مسئلہ کو گھٹانے کی صورتیں۔

جو چیز غیر فطری ہو اس کو آپ کوشش کر کے ختم کر سکتے ہیں۔ مگر ایک فطری چیز کو ختم کرنا

کسی حال میں ممکن نہیں۔ سماج کے اندر مختلف افراد اور گروہوں کے درمیان اختلاف کا پیش آنا عین فطری ہے، اس لئے اس کو کسی بھی طرح ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ اس کو انگیز کیا جائے۔ اعراض اور صبر کی تدبیروں سے اس کو اپنے لئے بے ضرر بنا دیا جائے۔

تقسیم (۱۹۴۷) سے پہلے کے دور میں جلوس پر جھگڑے کا ایک واقعہ بمبئی میں ہوا۔ ہندوؤں کا ایک جلوس باجا بجاتا ہوا ایک مسجد کے سامنے سے گزرا۔ اس پر مسجد کے مسلمان متولی نے اعتراض کیا۔ بات بڑھی۔ یہاں تک کہ معاملہ عدالت تک پہنچ گیا۔ متولی نے انگریز عدالت کے سامنے اپنا یہ دعویٰ پیش کیا کہ ہندوؤں کو اس کی مسجد کے سامنے سے جلوس نکالنے سے روک دیا جائے۔ مقدمہ چلا۔ بمبئی کے ایک مشہور مسلم رہنما نے اس کیس کی وکالت کی۔ ان کی وکالت کامیاب رہی۔ انگریز جج نے یہ فیصلہ دیا کہ مذکورہ مسجد کے سامنے عدالتی حکم کے تحت یہ بورڈ لگا دیا جائے کہ اس کے سامنے ہندوؤں کو جلوس نکالنے کی اجازت نہیں۔

مذکورہ مسلم رہنما اس کے بعد مسلمانوں کے درمیان خوب مقبول ہوئے۔ ان کو مسلمان اپنا عظیم رہنما اور مسلم ملت کا نجات دہندہ سمجھنے لگے۔ مگر یہ صرف ناسمجھی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قیادت نہیں تھی۔ بلکہ برعکس رہنمائی تھی۔ مذکورہ رہنما اگر دانش مند ہوتے تو وہ مسلمانوں سے کہتے کہ جلوس کے مسئلہ کا حل اس کو ختم کرنا نہیں ہے بلکہ اس کو برداشت کرنا ہے۔ اس قسم کی چیزیں ہر سماج میں جاری رہیں گی۔ حتی کہ خالص مسلم سماج میں بھی۔ اس لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان کو نظر انداز کیا جائے نہ کہ بے فائدہ طور پر ان سے الجھا جائے۔

ایک بچہ نے پھول توڑا۔ اس کا ہاتھ کانٹے سے زخمی ہوگیا۔ وہ روتا ہوا اپنے باپ کے پاس آیا۔ اب یہ باپ کی نادانی ہوگی اگر وہ پھول کے درخت سے کانٹے کا وجود ختم کرنے کی مہم چلائے۔ اس کے برعکس اس کو چاہئے کہ خود اپنے بیٹے سے کہے کہ اس دنیا میں ہر پھول کے ساتھ کانٹا موجود رہے گا۔ اس لئے تم کانٹے کے ساتھ جینا سیکھو نہ یہ کہ کانٹے کا وجود مٹانے کی بے فائدہ کوشش کرو۔

بمبئی کے واقعہ میں مسلم قیادت اگر مسلمانوں کو صحیح رہنمائی دیتی تو آج مسلمانوں کی تاریخ دوسری ہوتی۔ مگر غلط رہنمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان سو سال سے جلوس کے جھگڑوں میں مبتلا ہیں، ہندستان میں بھی اور اسی طرح پاکستان میں بھی۔ تعمیر کے بہترین امکانات کے درمیان وہ بے تعمیر حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔

نقصان در نقصان

مولانا اختر احسن اصلاحی (وفات ۱۹۵۷) مدرسۃ الاصلاح کے صدر مدرس تھے۔ ایک بار انھوں نے ایک مسلمان عالم کا نام لے کر کہا کہ وہ عربی زبان پر نہایت عمدہ قدرت رکھتے ہیں۔ اور فلاں عرب سفارت خانہ میں کام کرتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں ان کو ادب عربی کے استاد کی حیثیت سے اپنے مدرسہ میں بلاؤں۔ مگر میں ان کو سفارت خانہ والی تنخواہ نہیں دے سکتا۔ اس لیے میں اپنے مدرسہ کے لیے ان کو حاصل بھی نہیں کر سکتا۔

یہ بات ۴۰ سال پہلے کی ہے۔ اب یہ صورت حال چالیس گنا سے بھی زیادہ بڑھ چکی ہے۔ آج ہماری تمام بہترین صلاحیتیں اغیار کے قبضہ میں ہیں۔ مسلم اداروں کو ان کا کوئی حصہ حاصل نہیں۔

تیسری دنیا (Third world) کی اصل کمزوری یہ ہے کہ اس میں سب تیسرے درجہ کے لوگ بھرے ہوئے ہیں۔ یہاں جتنے اعلیٰ درجہ کے افراد تھے، اور جو اونچی تعلیم پائے ہوئے تھے، وہ ملینوں (Millions) کی تعداد میں یورپ اور امریکہ کے ملکوں میں جاکر آباد ہو گئے ہیں۔ کیوں کہ وہاں ان کو زیادہ پیسہ اور زیادہ بہتر مواقع حاصل ہیں۔ یہی تمام مسلم قوموں کا حال ہے۔ اور یہی غیر مسلم اقوام کا حال بھی۔

ہندستان اور پاکستان کے مسلم اداروں کو دیکھیے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ان اداروں کی کارکردگی اچھی نہیں۔ ان اداروں میں کام کا وہ معیار نہیں رہا جو پہلے وہاں پایا جاتا تھا۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اعلیٰ ذہن تقریباً سب کے سب بیرونی ملکوں میں چلے گیے۔ اب صرف کم تر صلاحیت کے لوگ باقی رہ گیے ہیں جو مسلم اداروں کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اور جن اداروں میں کمتر صلاحیت کے لوگ بھرے ہوئے ہوں ان کی کارکردگی کا معیار کمتر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اعلیٰ کام ہمیشہ اعلیٰ آدمی کرتے ہیں۔ جب اعلیٰ آدمی ہی نہ رہیں تو اعلیٰ کام کیسے ہو سکتا ہے۔

اس صورت حال کا سب سے زیادہ عبرت ناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے اکابر سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت تک مغربی اقوام کو سب سے بڑی لعنت بتاتے رہے۔ انھوں نے ملت کے تمام بہترین وسائل اس محاذ پر لگا دیے کہ ان بیرونی اقوام کی غلامی سے ملت کو رہائی دے سکیں۔ مگر جب

ناقابل بیان قربانیوں کے بعد بیرونی قومیں ہمارے ملکوں سے واپس چلی گئیں تو اب یہ حال ہے کہ ہمارے تمام بہترین افراد اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر خود مغربی ملکوں میں پہونچ گئے اور اب وہ انھیں قوموں کے زیر سایہ زندگی گزارنے کو فخر سمجھ رہے ہیں جن کو ان کے اکابر نے اسلام اور مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی لعنت قرار دیا تھا۔ کیسے عجیب تھے یہ اکابر اور کیسے عجیب ہیں اکابر کے یہ اخلاف۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان ترقی اور کامیابی چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کو انسان کے اندر سے کبھی ختم نہیں کیا جاسکتا۔ ماضی کے رہنماؤں نے اگر ایسا کیا ہوتا کہ جن بے شمار وسائل کو وہ مغربی قوموں کے خلاف لڑائی میں استعمال کرتے رہے ان کو وہ خود اپنے ملک کی علمی اور تمدنی ترقی میں استعمال کرتے تو دردناک مہاجرت کا یہ واقعہ، کم از کم اتنے بڑے پیمانہ پر ہرگز پیش نہ آتا۔ ایسی صورت میں حوصلہ مند افراد خود اپنے ملک میں وہ مواقع پالیتے جن کو استعمال کرکے وہ اعلیٰ ترقی حاصل کرسکیں۔

تیسری دنیا میں آزادی عمل کے مواقع نہ ہونا۔ اعلیٰ معیار کے تعلیمی اداروں کا فقدان، اپنے حوصلوں کے مطابق ترقی کے راستہ میں بڑھتے رہنے والے حالات کی غیر موجودگی، یہ وہ چیزیں ہیں جو اس واقعہ کو ظہور میں لارہی ہیں جس کو مشرقی ذہن کا مغربی دنیا کی طرف نکاس (Brain drain) کہا جاتا ہے۔

اجتماعی حالات بے حد نازک ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ بے شمار پیچیدگیاں وابستہ ہوتی ہیں۔ اجتماعی زندگی میں کوئی اصلاحی کام کرنا الجھے ہوئے دھاگے کو سلجھانے کے ہم معنی ہے۔ ایسی حالت میں جو لوگ اجتماعی زندگی میں نعروں کی سیاست لے کر کھڑے ہوجائیں وہ یا تو حد درجہ غیر سنجیدہ ہیں یا حد درجہ نادان۔

بے خبری

نومبر ۱۹۸۸ میں جزیرہ مالدیپ میں ایک واقعہ ہوا۔ مالدیپ کا ایک تاجر جس کا نام عبداللہ لطفی ہے، اس نے پڑوسی ملک سری لنکا میں اپنا خفیہ دفتر قائم کیا۔ وہاں اس نے دہشت پسند نوجوانوں کا ایک دستہ تیار کیا اور ان کو ہتھیار دے کر کشتیوں کے ذریعہ مالدیپ (Male) کے ساحل پر ۳ نومبر ۱۹۸۸ کو اتار دیا۔ اس کا مقصد مالدیپ میں "فوجی انقلاب" لانا تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم کی رہائش گاہ کو گھیر لیا۔ اور اس کی دیواروں کو گولی کا نشانہ بنانا شروع کیا۔

مالدیپ بحر ہند کا ایک بہت ہی چھوٹا ملک ہے۔ اس کے پاس اپنی کوئی فوج نہیں ہے۔ عبداللہ لطفی کا خیال تھا کہ وہ غیر مسلح مالدیپ کو نہایت آسانی سے فتح کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر سکتا ہے۔ مگر اس کو مکمل ناکامی ہوئی۔ اس کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور اب وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مالدیپ کی جیل میں ہے۔

مالدیپ کے حالات بظاہر لطفی کے موافق تھے۔ اس کے باوجود اس کو اپنے مقصد میں ناکامی کیوں ہوئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ لطفی معاملہ کے ایک پہلو کو جانتا تھا، مگر وہ اس کے دوسرے پہلو سے بالکل بے خبر تھا۔ اس کو یہ معلوم تھا کہ مالدیپ کے پاس اپنی کوئی فوج نہیں ہے۔ مگر وہ اس دوسری حقیقت سے بے خبر رہا کہ جدید مواصلات کے اس دور میں مالدیپ نہایت آسانی سے باہر کے ملک سے فوج منگا سکتا ہے جو اس کا بچاؤ کر سکے۔

مالدیپ کا ٹیلیفونی نظام نہایت عمدہ ہے۔ وہ سٹلائٹ کے ذریعہ کسی بھی ملک سے فوری طور پر ربط قائم کر سکتا ہے۔ چنانچہ جیسے ہی لطفی نے مالدیپ کے صدارتی محل پر حملہ کیا، مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم نے ہندستان کی حکومت سے ٹیلیفون پر رابطہ قائم کیا۔ انھوں نے نئی دہلی کو صورت حال سے باخبر کرتے ہوئے یہ درخواست کی کہ وہ فوراً ان کی مدد کے لیے اپنی فوجیں بھیج دیں۔

ہندستان کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ اس حادثہ نے ہندستان کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ بحر ہند میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کر سکے۔ وہ مالدیپ کے معاملہ میں مداخلت کر کے اس علاقہ میں اپنے آپ کو فوجی نجات دہندہ کی حیثیت سے پیش کر سکے۔ چنانچہ صدر مالدیپ کی درخواست ملنے

کے بعد چھ گھنٹہ کے اندر ہندستانی فوج مالدیپ (Male) کے ہوائی اڈہ پر اتر گئی۔ اس نے چند گھنٹوں کے آپریشن میں لطفی اور اس کے ساتھیوں کو عین اس وقت گرفتار کر لیا جب کہ وہ اپنی سمندری کشتیوں کے ذریعہ سری لنکا کی طرف بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مامون عبد القیوم کی حکومت بحال ہوگئی۔

دہلی کے انگریزی ہفت روزہ انڈیا ٹوڈے (۳۰ نومبر ۱۹۸۸) نے اس معاملہ کی تفصیلی رپورٹ دی ہے۔ اس نے بجا طور پر لکھا ہے کہ مالدیپ پر حملہ کرنے والے اپنے حملہ میں کامیاب ہو سکتے تھے، اگر انھوں نے احتیاطی تدبیر پر عمل کیا ہوتا۔ اور ٹیلی فون اکسچینج اور ہوائی اڈہ پر قبضہ کر کے ان کو ناقابل استعمال بنا دیتے:

The attackers could have made it if they had taken care to neutralize the telephone exchange and the airport (45).

عبد اللہ لطفی کو شاید قدیم صدارتی محل کا علم تھا۔ جس کی حیثیت صرف مقامی قلعہ کی ہوتی تھی۔ اس کو جدید صدارتی محل کا علم نہ تھا جو مواصلات کے سائنسی وسائل کے ذریعہ پورے عالم سے مربوط ہوتا ہے۔ قدیم شاہی محل کے لیے سمندر اور پہاڑ حائل ہو جاتے تھے۔ مگر جدید شاہی محل کی راہ میں کوئی سمندر یا کوئی پہاڑ حائل نہیں۔ وہ خلائی مواصلات کے ذریعہ پیغام رسانی کر سکتا ہے، اور فضائی سواریوں کے ذریعہ اپنے لیے مدد بلا سکتا ہے۔

مالدیپ کا یہ واقعہ علامتی طور پر جدید مسلم تاریخ کی تصویر ہے۔ وہ موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں کے ناکام اقدامات کی حقیقت کو بتا رہا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے بے شمار اقدامات کیے مگر ان کے تمام اقدامات بلا استثنار ناکام رہے۔ اس کی وجہ دوبارہ وہی تھی جو عبد اللہ لطفی کے مذکورہ واقعہ میں نظر آتی ہے۔ ہمارے رہنماؤں نے معاملہ کے ایک پہلو کو جانا مگر وہ معاملہ کے دوسرے پہلو سے بالکل بے خبر رہے۔ اور موجودہ دنیا میں جو لوگ اس قسم کی بے خبری کا ثبوت دیں، ان کے اقدامات کے لیے بدترین ناکامی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

شما حذر بکنید

ریاض کے عربی ہفت روزہ الـدعوۃ (۳۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ، ۲۸ دسمبر ۱۹۸۹) میں قصۃ تحمل عبرۃ کے زیر عنوان ایک واقعہ شائع ہوا ہے۔ اس میں بہت بڑی نصیحت ہے۔ اس کے لکھنے والے طائف کے ایک عرب استاذ ابراھیم ع ن ہیں۔ اس میں انھوں نے اپنا ایک ذاتی تجربہ بیان کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ مجھ کو مطالعہ کا بہت زیادہ شوق تھا۔ ہر روز میں پانچ گھنٹے سے زیادہ مطالعہ کرتا تھا۔ کوئی جریدہ یا مجلّہ یا نئی کتاب میں پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ میں ان کو حرف بہ حرف پڑھتا تھا۔ یہاں تک کہ مطالعہ میری روزانہ زندگی کا ایک لازمی جزء بن گیا۔ مگر آج میں بالکل اندھا ہوں۔ اب میں کوئی بھی چیز اپنی آنکھ سے نہیں پڑھ سکتا۔

ایسا کیوں کر ہوا۔ اس کی وجہ ان کے الفاظ میں یہ تھی کہ وہ بعض امور میں مفرط (حد سے تجاوز کرنے والے) بن گیے۔ چنانچہ وہ گاڑی بہت تیز دوڑاتے تھے۔ اور اسی کے نتیجہ میں یہ حادثہ پیش آیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک روز میں اپنی گاڑی بہت زیادہ تیز دوڑا رہا تھا۔ انتہائی تیزی کی بنا پر میری گاڑی راستہ سے ہٹ گئی۔ وہ گیند کی طرح لڑھک گئی اور سڑک کے کنارے ایک بھاری کھمبے سے جا کر ٹکرا گئی۔

میرے سر میں سخت چوٹیں آئیں۔ اس کے بعد لمبے عرصہ تک میں اسپتال میں زیر علاج رہا۔ ڈاکٹروں کی زبردست کوشش اور جدید ترین طبی ذرائع کے استعمال کے باوجود میں دوبارہ اچھا نہ ہو سکا۔ اس کے نتیجہ میں میں نے اپنی آنکھ کھو دی۔ میں نے اپنی آنکھ کے علاج کے لیے ساری ممکن کوشش کر ڈالی۔ مگر میری بینائی واپس نہ آسکی۔ اب یہ حال ہے کہ میں بالکل اندھا ہو چکا ہوں۔ اب میں اپنے شوق مطالعہ کو پورا کرنے پر قادر نہیں جو چھوٹی عمر سے میری زندگی میں شامل ہو گیا تھا۔ اور آخر تک میری روزانہ زندگی کا جزء بنا رہا۔

یہ مضمون اس جملہ سے شروع ہوتا ہے کہ کوئی شخص نعمت کی قدر اس وقت تک نہیں پہچانتا جب تک وہ اسے کھو نہ دے (لا احد یدرك قیمة النعمة حتی یفقدها)

اور اس فقرہ پر ختم ہوتا ہے کہ میں یہاں اپنا قصہ اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ شاید وہ دوسروں کے لیے نصیحت ہو (واسوق حکایتی ھذا لعل فیھا العبرۃ للآخرین)

اس واقعہ میں جو سب سے بڑا سبق ہے، وہ یہ ہے کہ ـــــ اس دنیا میں ایک کام کو کرنے کے لیے دوسرے کام کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ پورب کی طرف سفر کرنے کے لیے پچھم کی طرف سفر کرنے سے اپنے آپ کو باز رکھنا پڑتا ہے۔ اس دنیا میں جو شخص "چھوڑنے" کے لیے تیار نہ ہو وہ "پانے" کے بارہ میں اپنے حوصلوں کو پورا نہیں کر سکتا۔

اگر آپ مطالعۂ کتاب کا فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اپنی گاڑی کو ہلکی رفتار سے چلائیے تاکہ وہ حادثہ کی شکار نہ ہو۔ اگر آپ تعلیم و تجارت کے میدان میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو جھگڑے کی باتوں سے اپنے آپ کو دور رکھیے، ورنہ آپ کا تمام منصوبہ دوسروں سے ٹکراؤ کے نتیجہ میں چور چور ہو جائے گا۔ اگر آپ صالح نظریات کی بنیاد پر انسانی زندگی کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو حکمرانوں سے سیاسی نزاع نہ کیجیے، ورنہ اصل تعمیری کام تو نہ ہوگا، البتہ حکمرانوں کے خلاف جھوٹی لڑائی میں آپ کا سارا وقت اور آپ کا سارا اثاثہ برباد ہو جائے گا۔

اگر کوئی نادان آدمی خواہ مخواہ لڑ مرنے ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنالے تو ایسے آدمی کو اس حکمت کا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر جس آدمی کا مقصد یہ ہو کہ وہ دنیا کے مواقع کو استعمال کرکے ایک کامیاب زندگی کی تعمیر کرے گا، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ زندگی کی اس حکمت کو آخری حد تک پکڑے اور کسی بھی حال میں اسے نہ چھوڑے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو آخر میں اس کے حصہ میں اس کے سوا اور کچھ نہ آئے گا کہ وہ دوسروں کو اپنی بربادی کا قصوروار ٹھہرا کر ان کے خلاف احتجاج کرتا رہے، جب کہ وہاں اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی اس کا احتجاج سننے کے لیے بھی موجود نہ ہو۔

تنظیم

سوامی وشنو دیوانندا ہندستان کے مشہور گرو ہیں۔ وہ اپنا مشن ڈیوائن لائف سوسائٹی (Divine Life Society) کے نام سے چلاتے ہیں۔ دنیا کے تقریباً ہر بڑے شہر میں ان کا سنٹر قائم ہے۔ وہ اکثر اپنے ذاتی ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کو اُڑن سوامی (flying Swami) کہا جاتا ہے۔ ان کے اعلان کے مطابق، ان کا مقصد دنیا کو امن اور محبت کا پیغام دینا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۱۸ جون ۱۹۹۲)

ساری دنیا میں ان کے شاگردوں (disciples) کی تعداد ۵۰ ہزار سے زیادہ ہے جن میں بہت سے ممتاز افراد بھی شامل ہیں، مثلاً جارج ہیریسن (George Harrison) اور پیٹر سیلرس (Peter Sellars) اور روی شنکر، وغیرہ۔ ان کی غیر معمولی کامیابی کا راز کیا ہے، ان کے ایک تعلیم یافتہ شاگرد نے کہا کہ سوامی کی دنیوی کامیابی اس لیے ہے کہ وہ نہایت عمدہ ناظم ہیں:

The Swami's worldly success is because he is
a very good organiser. (p. 14)

یہ ایک حقیقت ہے کہ کامیابی کا بہت زیادہ تعلق نظم یا تنظیم سے ہے۔ خاص طور پر کوئی بڑا کام کبھی تنظیم کے بغیر انجام نہیں دیا جاسکتا۔ تنظیم نہیں تو بڑا کام بھی نہیں۔

تنظیم کیا ہے۔ تنظیم یہ ہے کہ ہر کام مقرر اصول کے مطابق کیا جائے۔ کام سے تعلق رکھنے والے تمام لوگوں پر یہ واضح ہو کہ ان کے حقوق کیا ہیں اور ان کے فرائض کیا۔ ہر آدمی جس کو کوئی کام سونپا جائے وہ پوری طرح قانون اور ضابطہ کے تحت سونپا جائے۔ جو فیصلہ کیا جائے وہ نہ صرف سب کے علم میں ہو بلکہ اس کی معقولیت کو بھی لوگ جانتے ہوں۔ تمام وابستہ افراد یہ محسوس کریں کہ وہ کام میں شریک ہیں اور وہ اس کے ایک ناگزیر جزء کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر آدمی اپنے آپ کو نظام کا پابند سمجھتا ہو۔

نظم دراصل ناظم کا بدل ہے۔ جب ناظم موجود نہ ہو تو لوگوں کو احساس ہونا چاہیے کہ وہ بالواسطہ طور پر مقرر نظم کی صورت میں وہاں موجود ہے۔

کامیاب تنظیم کی بہترین آئیڈیل مثال شہد کی مکھی کا چھتہ ہے ۔ جو شخص کامیاب تنظیم قائم کرنا چاہتا ہو اس کو شہد کی مکھی کے چھتہ کا مطالعہ کرنا چاہیے ۔ شہد کی مکھی انسان کو صرف شہد فراہم نہیں کرتی ۔ وہ شہد کا ایک اعلیٰ کارخانہ قائم کرکے انسان کو یہ سبق بھی دیتی ہے کہ اجتماعی منصوبوں کی تنظیم کس طرح کی جانی چاہیے ۔

موجودہ زمانہ میں مینجمنٹ ایک مستقل سبجکٹ ہے ۔ اس کو ایک مستقل سائنس کے طور پر پڑھایا جاتا ہے ۔ ساری دنیا میں مینجمنٹ کی تعلیم اور اس کی تحقیق کے لیے نہایت بڑے بڑے ادارے قائم ہیں ۔

سادہ طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کامیاب تنظیم کے لیے ضروری ہے کہ فرد اور اجتماعی ادارہ، شاخ اور مرکز، نیچے کے لوگ اور اوپر کے لوگ، سب کے درمیان برابر تال میل ہو۔ بلا انقطاع ان کے درمیان ربط جاری رہے ۔ ہر ایک جال کی مانند دوسرے افراد سے جڑا رہے ۔

مزید یہ کہ ہر سطح پر نگرانی اور احتساب کا نظام قائم ہو ۔ بہتر کارکردگی پر کارکنوں کا اعتراف کیا جائے اور ناقص یا غلط کارکردگی پر فوراً متعلقہ شخص کی گرفت کی جائے ۔

تنظیم اجتماعی کام کی انجینیرنگ ہے ۔ جتنی اچھی تنظیم اتنا ہی اچھا اجتماعی ادارہ ۔

تجارت کا میدان

ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تسعۃُ اعشارِ الرزقِ فی التجارۃ (کنز العمال) یعنی روزی کے ۹۰ فی صد حصے تجارت میں ہیں۔

یہ حقیقت قدیم روایتی زمانہ میں ایک قسم کی پیشین گوئی کی حیثیت رکھتی تھی۔ کیوں کہ قدیم زمانہ میں اصل اہمیت زراعت کی تھی نہ کہ تجارت کی۔ مگر آج پیغمبر کا یہ کلام ایک ثابت شدہ حقیقت بن چکا ہے۔ موجودہ زمانہ میں نئے طریقوں کی دریافت نے تجارت کی وسعت بہت زیادہ بڑھا دی ہے۔ آج تجارت دوسرے ذرائع معاش پر بدرجہا زیادہ فائق ہو چکی ہے۔ اس کی ایک مثال ہندستان کے پارسی ہیں۔ ہندستان میں پارسیوں کی تعداد بمشکل ایک لاکھ ہے۔ مگر تجارت کے میدان میں عمل کرکے انھوں نے ملک کی دولت کے ایک بہت بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا۔

موجودہ زمانہ میں تجارت کی فوقیت صرف ملازمت اور زراعت جیسے روایتی ذرائع ہی پر قائم نہیں ہوئی ہے، بلکہ اس نے سیاست اور فوج اور ہتھیار جیسی چیزوں پر بھی فیصلہ کن غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ اس کی ایک مثال جاپان ہے۔ جاپان نے اپنی تجارتی ترقی کے ذریعہ یہاں تک بالاتری حاصل کی کہ اس نے امریکہ کی فوجی اور سیاسی طاقت کو اپنے مقابلہ میں بے اثر بنا دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو دیکھئے اور اس کے بعد موجودہ مسلمانوں کی روش پر غور کیجئے۔ ہندستان کے مسلمان آج سب سے زیادہ جس بات کی شکایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ان کو سرکاری ملازمت میں نہیں لیا جاتا۔ ملازمتوں اور داخلوں کے کوٹہ میں ان کے لیے رزرویشن نہیں ہے۔

مسلمانوں کی یہ روش پیغمبر اسلامؐ کے خلاف عدمِ اعتماد کے اظہار کے ہم معنی ہے۔ پیغمبر اسلامؐ صلی اللہ علیہ وسلم تو یہ فرما رہے ہیں کہ رزق کا ۹۰ فی صد حصہ تجارت میں ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کی اسی تعلیم کا یہ نتیجہ تھا کہ صحابہ اور تابعین بہت بڑے پیمانہ پر تجارتوں میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ صحابہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خشکی اور تری میں تجارت کیا کرتے تھے (انّ الصحابۃ کانوا یتجرون فی البرّ والبحر۔)

مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان پیغمبرؐ کے اس کلام کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ تجارت کا میدان ان کے لیے پوری طرح کھلا ہوا ہے مگر وہ اس میں محنت نہیں کرتے۔ اس کے برعکس وہ اس ذریعۂ معاش کی طرف اپنی نظریں لگائے ہوئے ہیں جو پیغمبر کے ارشاد کے مطابق، معاشی ذرائع کے صرف دس فی صد حصہ پر مشتمل ہیں۔ وہ اس ذریعہ معاش کو عملاً چھوڑے ہوئے ہیں جو ۹۰ فی صد معاشی ذرائع سے تعلق رکھتا ہے۔

موجودہ مسلم رہنماؤں نے ایسے اخبار اور رسالے نکال رکھے ہیں جن کا کام یہ ہے کہ وہ ہر ہفتہ یا ہر مہینہ مسلمانوں کو اس بات کی خبر دیں کہ فلاں سروس میں ان کا تناسب اتنا کم ہے اور فلاں داخلہ میں وہ اتنی کم تعداد میں لیے گیے ہیں۔ اس قسم کے پرچے نکالنے والے بیک وقت دو جرم کر رہے ہیں۔ ایک طرف وہ پیغمبر اسلامؐ کی، نعوذ باللہ تحقیر کر رہے ہیں۔ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم اپنے ارشاد سے مسلمانوں کو یہ رہنمائی دے رہے ہیں کہ اگر تمہارے لیے دس فی صد ذرائع والے میدان میں مواقع نہیں ہیں تو اس کی پروا نہ کرو۔ تم اس میدان میں داخل ہو جاؤ جو ذرائع معاش کے ۹۰ فی صد حصہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور جو آج بھی تمہارے لیے پوری طرح کھلا ہوا ہے۔ مگر مسلمانوں کے جھوٹے لیڈر رسول کی آواز پر اپنی آواز بلند کر کے چیخ رہے ہیں کہ اصل معاشی میدان تو ملازمتوں کا میدان ہے اور وہاں مسلمانوں کے لیے دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔

قرآن کے مطابق، جو شخص رسول کی آواز پر اپنی آواز بلند کرے اس کے اعمال حبط ہو جاتے ہیں (الحجرات ۲) اس آیت کی روشنی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے نام نہاد لیڈر حبطِ اعمال کے اس قانون کی زد میں آگیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ۵۰ سالہ چیخ پکار مکمل طور پر بے فائدہ ثابت ہوئی۔ وہ اپنے دعویٰ کے مطابق، ملازمتوں کی فہرست میں، مسلمانوں کا اضافہ کرنے میں کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

مسلمانوں نے اگر بالفرض اس ملک میں "۱۰ فی صد" رزق والے میدان کو کھو دیا ہو تب بھی "۹۰ فی صد" رزق والا میدان اب بھی ان کے لیے کھلا ہوا ہے۔ ان کو چاہیے کہ وہ اس دوسرے وسیع تر میدان میں داخل ہو جائیں۔ اس کے بعد انھیں اپنے ماحول کے خلاف تعصب اور امتیاز کی شکایت نہ ہو گی۔

قول سدید

یا ایها الذین آمنوا اتقوا اللہ وقولوا قولاً سدیداً۔ یصلح لکم اعمالکم ویغفر لکم ذنوبکم ومن یطع اللہ ورسولہ فقد فاز فوزاً عظیما (۳۳/۷۰-۷۱)	اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو۔ اللہ تمہارے اعمال کو درست کر دے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔

قرآن کی اس آیت میں اہل ایمان کو قول سدید کا حکم دیا گیا ہے۔ قول سدید کا مطلب ہے درست بات، ٹھیک بات۔ دوسرے لفظوں میں مطابق واقعہ بات۔ یعنی کوئی معاملہ جیسا ہے ٹھیک ویسا ہی اس کو بیان کرنا۔ بتایا گیا ہے کہ اگر تم نے قول سدید کا اہتمام کیا تو تمہارے اعمال درست ہو جائیں گے اور تم اللہ کی مدد سے کامیاب رہو گے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تمام معاملات بگڑے ہوئے ہیں۔ اس کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ ان کے یہاں قول سدید کا اہتمام باقی نہیں رہا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان ایسے رہنما اٹھے جو یا تو شاعر تھے یا خطیب یا انشا پرداز، اور شاعر اور خطیب اور انشا پرداز کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ غیر سدید انداز میں کلام کرتا ہے۔

مثال کے طور پر اقبال (۱۹۳۸-۱۸۷۷) کو مسلمانوں کے درمیان "مفکر اسلام" کا درجہ حاصل ہے۔ موجودہ مسلمانوں پر غالباً سب سے زیادہ اثر اقبال کا ہوا ہے۔ اقبال بنیادی طور پر شاعر تھے۔ اس لیے ان کا بیشتر کلام قول غیر سدید کا نمونہ ہے۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کے ذہن کو، قرآن کے الفاظ میں، غیر اصلاح یافتہ ذہن بنا دیا ہے۔ اور قرآن کے مطابق غیر اصلاح یافتہ ذہن کے لیے اس دنیا میں کامیابی نہیں۔

مثال کے طور پر اقبال کا ایک شعر ہے جو مسلمانوں کے درمیان بہت زیادہ مقبول ہوا ہے۔ اس میں وہ موجودہ مسلمانوں کے بارہ میں کہتے ہیں :

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا　　آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

یہ شعر سراسر سداد قول کے خلاف ہے۔ اس میں درست گفتاری کی صفت نہیں پائی جاتی۔ اور جس قول میں درست گفتاری کی صفت نہ ہو اس سے درست عمل کا ظہور کسی بھی حال میں ممکن نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ حضرت ابراہیم کے لیے آگ ٹھنڈی ہوگئی۔ مگر وہ نبوت کا معاملہ تھا۔ وہ سادہ معنوں میں صرف ایمان کا معاملہ نہ تھا۔ پیغمبر کے لیے اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ مدعو کے مقابلہ میں اس کی کامل حفاظت کی جائے تاکہ وہ ان کے اوپر اتمام حجت کی حد تک دعوت کا کام کر سکے۔ حضرت ابراہیم کے لیے آگ کا معاملہ اس سنت الٰہی سے تعلق رکھتا تھا۔ جب مخالفین نے آپ کو آگ میں پھینک دیا اور آگ آپ کے اوپر ٹھنڈی ہوگئی تو اس کا ٹھنڈا ہونا مذکورہ شعر کے مطابق "ایمان" کے زور پر نہ تھا بلکہ خدا کے مخصوص حکم کی بنا پر تھا۔ چنانچہ قرآن میں اس کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ۔

جس چیز کا تعلق خدا کے خصوصی حکم سے تھا اس کا تعلق اس شعر میں ایمان سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے ساری بات بدل گئی۔ اس معاملہ کا صحیح تصور آدمی کو خدا کی قدرت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جب کہ مذکورہ شاعرانہ تصور آدمی کے اندر جھوٹا بھرم پیدا کر کے اس کو بے معنی ٹکراؤ کی طرف لے جاتا ہے۔

اقبال نے حضرت ابراہیم کے معاملہ کو ایمان کا معاملہ بنا کر مسلمانوں کے اندر یہ ذہن بنایا کہ ایمان کو لے کر اگر تم آگ میں کود پڑو تو آگ تمہارے لیے گلزار ہو جائے گی۔ بھڑکتے ہوئے شعلے تمہارے ایمان کے زور پر ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔

اس غلط سوچ کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان آج بار بار "آگ" میں کود رہے ہیں۔ مزید یہ کہ جب آگ انھیں جلاتی ہے تو اپنے غلط ذہن کی بنا پر وہ دوبارہ اس کو دشمنوں کے خانہ میں ڈال دیتے ہیں۔ حالانکہ اس کو انھیں اپنی اور اپنے رہنماؤں کی نادانی کے خانہ میں ڈالنا چاہیے۔ ایسے ہر تجربہ کو انھیں فریاد کا مسئلہ بنانے کے بجائے نصیحت کا مسئلہ بنانا چاہیے۔ فریاد سے جھنجلاہٹ پیدا ہوتی ہے اور نصیحت سے اصلاح۔

یوٹرن کی ضرورت

سینٹ لوئی (Saint Louis) امریکہ کا ایک شہر ہے۔ یہاں کی سڑکوں پر اگر آپ چلیں تو ایک مقام پر آپ جلی حرفوں میں ایک بورڈ دیکھیں گے جو ٹریفک محکمہ کی طرف سے وہاں لگایا گیا ہے۔ اس بورڈ پر لکھا ہوا ہے ــــــ اگر تم غلط سمت میں چل پڑے ہو تو خدا یوٹرن کی اجازت دیتا ہے:

If you're headed in the wrong direction, God allows U-turns.

یوٹرن کا مطلب ہے انگریزی حرف یو (U) کی صورت میں واپسی۔ اگر آپ سڑک پر پچھم کی طرف اپنی گاڑی دوڑا رہے ہوں۔ پھر آپ کو معلوم ہو کہ آپ الٹے رخ پر سفر کر رہے تھے۔ اس کے بعد آپ اپنی گاڑی کو روکیں اور سفر کا رخ بدلنے کے لئے اپنی گاڑی کو موڑ کر اس کا انجن پچھم کے بجائے پورب کی طرف کر دیں تو اسی کو ٹریفک اصطلاح میں یوٹرن کہا جاتا ہے۔

یوٹرن کا یہ اصول صرف سڑک کے سفر کے لئے نہیں ہے، بلکہ یہی اصول زندگی کے وسیع تر سفر کے لئے بھی ہے۔ زندگی میں بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی مطلوب رخ کے برعکس رخ پر دوڑنے لگتا ہے۔ اس وقت ضروری ہو جاتا ہے کہ عمل کا رخ موڑنے کے لئے یوٹرن کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

یوٹرن (U-turn) کا یہ طریقہ فطرت کا طریقہ ہے اور وہ خود اسلام میں بھی بتایا گیا ہے۔ وہ رسول اور اصحاب رسول کی سنتوں میں سے ایک اہم سنت ہے۔ مثلاً عمرۂ حدیبیہ (٦ ھ) کے سفر میں اسلامی قافلہ کا نشانہ یہ تھا کہ مکہ میں داخل ہو کر عمرہ کریں۔ مگر قریش کی طرف سے مزاحمت پیش آنے کے بعد آپ نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ آپ حدیبیہ کے مقام سے لوٹ کر مدینہ واپس چلے آئے۔ یہ گویا یوٹرن کی ایک عملی مثال تھی۔

اسی طرح غزوہ موتہ (٨ ھ) میں جب کئی صحابہ کی شہادت کے بعد حضرت خالد کو اسلامی لشکر کا سردار بنایا گیا تو حالات کا جائزہ لینے کے بعد انھوں نے طے کیا کہ میدان جنگ سے لوٹ کر مدینہ چلے جائیں۔ اصحاب رسول کا یہ واپسی کا سفر بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے یوٹرن کی ایک مثال ہے۔

یوٹرن کا اصول جس طرح سڑک کے سفر کو نتیجہ خیز اور بامقصد بنانے کے لئے ضروری ہے، اسی طرح زندگی کے سفر میں بھی اس کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ زندگی کا سفر بھی اسی وقت بامقصد

اور نتیجہ خیز بنتا ہے جب کہ آدمی حسب ضرورت یو ٹرن لینے کے لئے تیار رہے۔

زندگی کا سفر ہمیشہ خاردار اور ناہموار وادیوں میں طے ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنے ذہنی آئیڈیل کو خارجی حالات سے ہم آہنگ کرنے کے لئے بار بار نیا فیصلہ لینا پڑتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے ابتدائی اندازہ کے مطابق اقدام کا ایک نقشہ بناتا ہے۔ مگر عملی تجربہ کے بعد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نقشہ اولاً درست ہونے کے باوجود پیش آمدہ حالات میں قابل عمل نہیں تھا۔

ایسے موقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی تدبیر کار کے اعتبار سے یو ٹرن لے۔ یعنی ابتدائی اصول پر اپنے یقین کو، برقرار رکھتے ہوئے اپنی حکمت عملی کو حالات کے تقاضے کے پیش نظر تبدیل کرے۔ اس طرح ایسا ہوتا ہے کہ ابتدائی اندازہ میں جو نقشۂ کار اقدام کی صورت میں وضع کیا گیا تھا، حالات کے گہرے مطالعہ کے بعد اس کو بظاہر پسپائی میں تبدیل کرنا پڑتا ہے۔

تاہم جس طرح سڑک کے سفر میں یو ٹرن کا مطلب حقیقۃً سمت سفر کی تبدیلی ہوتا ہے نہ کہ خود سفر کو موقوف یا معطل کرنا۔ اسی طرح زندگی کے سفر میں بھی یو ٹرن کا مطلب سفر کو روکنا یا پسپائی اختیار کرنا نہیں ہے۔ بلکہ یہ تمام تر عمل کا رخ بدلنے کے ہم معنی ہے۔ یہ فرق دراصل اتجاہ (direction) کے اعتبار سے ہے نہ کہ خود عمل اور اقدام کے اعتبار سے۔ کیوں کہ عمل یا اقدام تو بہر حال دونوں صورتوں میں جاری رہتا ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس یہی ہے۔ آج مسلمان بھی ٹھیک اسی قسم کی صورتحال سے دوچار ہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے احیاء اسلام اور احیاء ملت کے لئے بے شمار جانی اور مالی قربانیاں دیں۔ مگر ان کی تمام قربانیاں رائیگاں ہو کر رہ گئیں۔

کوششوں کا اس طرح بے نتیجہ ہو جانا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ خود کوشش میں کسی بنیادی خامی کی موجودگی کا ثبوت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوششوں کا جو رخ اختیار کیا گیا وہ صحیح رخ نہ تھا۔ ایسی حالت میں انتہائی ضروری ہو گیا ہے کہ نیا فیصلہ لیا جائے۔ یو ٹرن کے ذریعہ اپنی کوششوں کے رخ کو صحیح سمت میں موڑ دیا جائے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو اب یہی یو ٹرن لینا ہے۔ بعض اسباب سے موجودہ زمانہ میں ساری

دنیا کے مسلمانوں میں منفی سوچ ابھر آئی۔ اس سوچ کو ہمیں بدلنا ہے اور دوبارہ مسلمانوں کے اندر مثبت سوچ پیدا کرنا ہے۔ یہی ان کے لئے یوٹرن ہے، اور اسی میں ان کی تمام ترقیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

اس منفی ردعمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری قومیں مسلمانوں کو دشمن کے روپ میں دکھائی دینے لگیں۔ انھوں نے ان قوموں سے جہاد کے نام پر ٹکراؤ شروع کر دیا۔ مفروضہ دشمنوں کے خلاف یہ جہاد کہیں شکایت اور احتجاج کی صورت میں جاری ہے اور کہیں جنگ اور ٹکراؤ کی صورت میں۔ مگر غیر معمولی کوشش اور بے پناہ قربانی کے باوجود مسلمانوں کی یکطرفہ بربادی بتاتی ہے کہ ہمارے رہنماؤں کا یہ فیصلہ حالات کے مطابق نہ تھا۔ یہ الٹے رخ پر سفر کرنے کے ہم معنی تھا۔

اب مسلمانوں کی رستگاری اور کامیابی کی ایک ہی صورت ہے، اور وہ بلاشبہ یوٹرن ہے۔ یعنی اپنی سوچ اور اپنی کوشش کے رخ کو بدلنا۔ جہاد کے رخ سے پلٹ کر دعوت کے رخ پر اپنی محنتیں صرف کرنا۔ یہی عقل کا تقاضا ہے اور یہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

اسلامی عمل (Islamic activism) دراصل دعوتی عمل (Dawa activism) ہے۔ اسلام کا اقدامی عمل دعوت ہے نہ کہ جہاد بمعنی ٹکراؤ۔ اسلام کا مقصد دوسری قوموں کو خدا کے دین رحمت کا مخاطب بنانا ہے نہ کہ ان کو دشمن قرار دے کر ان سے لڑائی شروع کر دینا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں صبر کی بے حد اہمیت ہے۔ کیوں کہ صبر کے بغیر دعوت کا عمل ممکن ہی نہیں۔ داعی کو مدعو کی زیادتیوں پر یکطرفہ صبر کرنا پڑتا ہے، اس کے بعد ہی دعوت کے عمل کا آغاز ہوتا ہے۔

آج مسلمانوں پر فرض کے درجہ میں ضروری ہو گیا ہے کہ وہ خارجی احتجاج کو چھوڑیں اور اپنی ساری طاقت داخلی تعمیر پر لگا دیں۔ دوسری قوموں کو وہ دشمن کے بجائے مدعو کے روپ میں دیکھیں۔ ہتھیاروں کو چھوڑ کر وہ اسلام کی نظریاتی طاقت پر بھروسہ کریں۔ سیاسی انقلاب کے بجائے اخلاقی انقلاب کو وہ اپنی جدوجہد کا نشانہ بنائیں۔ ٹکراؤ کے بجائے صبر واعراض کی بنیاد پر وہ اپنی ملی پالیسی کی تشکیل کریں۔ قوموں کے خلاف بد دعا کرنے کے بجائے وہ سب کے حق میں دعائے خیر و ہدایت کا اہتمام کریں۔

الٹے رخ پر چل پڑنے والے مسافر کی نجات کا واحد طریقہ یوٹرن ہے۔ اسی طرح جو انسانی قافلہ الٹے رخ پر اپنی محنت صرف کرنے لگے، اس کی کامیابی کا بھی واحد راز یہی ہے کہ وہ یوٹرن لے کر اپنی محنت کے رخ کو درست کرے۔ ورنہ اس دنیا میں اس کے لئے تباہی اور بربادی کے سوا کوئی اور انجام نہیں۔

دانش مندی

دنیا دانش مندی کا امتحان ہے۔ یہاں ہر آدمی آزمائش کے مقام پر کھڑا ہوا ہے۔ جو شخص دانش مندی کا ثبوت دے وہ امتحان میں پورا اترے گا۔ اور جو شخص دانش مندی کا ثبوت نہ دے سکے وہ امتحان میں ناکام ہو گیا۔ اس کے لیے خدا کی اس دنیا میں ابدی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

دانش مندی کیا ہے۔ دانش مندی حقیقۃً کسی آدمی کی اس صلاحیت کا نام ہے کہ وہ غیر معتدل حالات میں معتدل ذہن سے سوچ سکے۔ وہ عملی بحران کے وقت بھی فکری بحران میں مبتلا نہ ہو۔ غیر معتدل حالات ہی میں دراصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ کون شخص فی الواقع دانش مند ہے اور کون شخص دانش مند نہیں۔

زندگی کا سب سے نازک امتحان یہ ہے کہ آدمی واقعات کو ان کے صحیح رُخ سے دیکھ سکے۔ اکثر ناکامیوں کا سبب یہ ہوتا ہے کہ آدمی واقعات کو ان کے صحیح رُخ سے نہیں دیکھتا اس لیے وہ ان کے بارے میں صحیح رائے بھی قائم نہیں کر پاتا۔

مثال کے طور پر اکثر ایک واقعہ کے ساتھ دوسرا واقعہ شامل رہتا ہے۔ ایسے موقع پر آدمی کو جاننا پڑتا ہے کہ کب اسے ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ سے الگ کر کے دیکھنا ہے اور کب اسے ایسا کرنا ہے کہ وہ ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ سے ملا کر دیکھے۔ زندگی میں کبھی پہلی دانش مندی مطلوب ہوتی ہے اور کبھی دوسری دانش مندی۔ یہاں ہم مسئلہ کی وضاحت کے لیے دونوں قسم کی مثالیں نقل کریں گے

دشمن کو رہنما بنانا

قدیم عرب میں موجودہ زمانہ کی طرح راستوں کے نشانات نہیں تھے اور نہ اس وقت آج کل کی طرح سڑکیں پائی جاتی تھیں۔ آدمی مجبور تھا کہ وہ سنسان پہاڑوں اور لق ودق صحراؤں کے درمیان اپنا سفر طے کرے۔ چنانچہ دور کا سفر کرنے کے لیے لوگوں کو رہنما کی ضرورت پڑتی تھی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابو بکر صدیق ؓ کے ہمراہ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت

کا فیصلہ فرمایا تو اس وقت آپ کے سامنے یہی مسئلہ تھا۔ مزید یہ کہ آپ دشمن کی نظروں سے بچنے کی خاطر یہ چاہتے تھے کہ معروف راستہ کو چھوڑ کر غیر معروف راستے سے اپنا سفر طے کریں۔ آپ کو ایک ایسے اچھے رہنما کی ضرورت تھی جو آپ کو مطلوب راستے سے چلا کر بحفاظت مدینہ پہونچا دے۔ اس وقت جو صورت پیش آئی اس کا ذکر سیرت ابن ہشام میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

فاستاجرا عبد اللّٰہ بن ارقط، رجلاً من بنی الدیل بن بکر، وکانت امہ امرأۃ من بنی سھم ابن عمرو وکان مشرکا یدلھما علی الطریق۔

(الجزء الثانی، صفحہ ۹۸)

(رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر نے) عبد اللہ بن ارقط سے اجرت پر معاملہ کیا۔ وہ بنو دیل بن بکر کا ایک شخص تھا اور اس کی ماں بنو سہم بن عمرو سے تعلق رکھتی تھی۔ عبد اللہ بن ارقط ایک مشرک تھا۔ وہ راستہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کی رہنمائی کر رہا تھا۔

عبد اللہ بن ارقط کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ مشرک تھا۔ یعنی وہ رسول اللہؐ کے دشمن گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ وہ صحرائی راستوں کا ماہر تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ارقط کے ان دونوں پہلوؤں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھا۔ اسی لیے یہ ممکن ہوا کہ آپ اس کو اپنے سفر کا رہنما بنائیں۔ اگر آپ اس کے رہنما ہونے کی حیثیت کو اس کے مشرک ہونے کی حیثیت سے الگ کرکے نہ دیکھتے تو کبھی ایسا نہ ہوتا کہ آپ ہجرت جیسے نازک سفر میں اس کو اپنے راستہ کا رہنما بنائیں۔

انتقام نہ لینا

دوسری مثال کے ذیل میں ہم ایک غیر مسلم کا واقعہ نقل کریں گے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اس کا مقابلہ اپنی زندگی سے کرکے دیکھیں کہ کیا وہ دانش مندی کے اس معیار پر پورے اترتے ہیں جو کبھی ایک غیر مسلم تک کے یہاں پایا جاتا تھا۔

سیرت کی کتابوں میں یہ واقعہ حضرت حمزہؓ کے اسلام کے ذیل میں آیا ہے۔ مکی دور میں ایک بار ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صفا کے پاس تھے۔ ابوجہل وہاں سے گزرا۔ ابوجہل نے آپ کو برا بھلا کہا اور آپ کے ساتھ بدزبانی کی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بالکل خاموش رہے۔ عبد اللہ بن جدعان

کی ایک خادمہ نے اس پورے واقعہ کو دیکھا۔ وہ واپس ہوئی تو راستہ میں اس کی ملاقات آپ کے چچا حمزہ بن عبد المطلب سے ہوئی جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔

حمزہ اس وقت شکار سے واپس آرہے تھے اور ان کے ہاتھ میں لوہے کی کمان تھی۔ خادمہ نے ان سے کہا کہ اے ابو عمارہ، کاش آپ دیکھتے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ کے بھتیجے محمدؐ کے ساتھ ابو الحکم بن ہشام (ابوجہل) نے کیا کیا۔ اس نے آپ کے بھتیجے کو یہاں بیٹھا ہوا دیکھا تو ان کے ساتھ بدزبانی کی اور ان کو سخت بُرا بھلا کہا۔ حمزہ کو یہ سن کر غصہ آگیا۔ وہ فوراً ابوجہل کی تلاش میں چل پڑے۔ یہاں تک کہ انھوں نے دیکھا کہ وہ کعبہ کے اندر اپنے آدمیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ تیزی سے اس کے پاس پہونچے اور اپنی کمان اس کے سر پر اتنے زور سے ماری کہ خون بہنے لگا۔

اس کے بعد ابوجہل کے قبیلہ (بنو مخزوم) کے لوگ دوڑے کہ حمزہ کو ماریں۔ مگر ابوجہل نے فوراً انھیں روک دیا۔ اس نے کہا کہ ابو عمارہ (حمزہ) کو چھوڑ دو۔ کیوں کہ خدا کی قسم میں نے ان کے بھتیجے کو بہت زیادہ برا بھلا کہہ دیا تھا (دعوا اباعمارة فانی واللہ قدسبت ابن اخیہ سبًا قبیحًا۔ سیرت ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۳۱۳)

یہ مثال بتاتی ہے کہ ابوجہل نے دو واقعات کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھا۔ اپنی بدزبانی کو اور حمزہ کے مارنے کو۔ اگر وہ اپنی بدزبانی کو الگ کر دیتا اور صرف حمزہ کے مارنے کو دیکھتا تو وہ بھی غصہ ہو جاتا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر حمزہ کو مارنا شروع کر دیتا۔ مگر جب اس نے حمزہ کے فعل کے ساتھ خود اپنے فعل کو ملا کر دیکھا تو اس کو معاملہ برابر سرابر نظر آیا اس لیے اس نے نہ خود حمزہ کو برا کہا اور نہ اپنے ساتھیوں کو ان کے خلاف کارروائی کرنے کی اجازت دی۔

موجودہ دنیا میں حقیقتیں ملی جلی صورت میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی واقعہ کو ایک رخ سے دیکھا جائے تو وہ کچھ نظر آتا ہے اور دوسرے رخ سے دیکھا جائے تو وہ کچھ بن جاتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے آدمی کو عقل دے کر اسے اس امتحان میں ڈالا ہے کہ وہ اپنی عقل کے استعمال سے صحیح رخ کو جانے۔ وہ واقعات کو ان کے صحیح ترین رُخ سے دیکھ سکے۔ اگر آپ واقعہ کو صحیح رخ سے نہ دیکھیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس معاملہ میں آپ کا رویہ بالکل غلط ہو کر رہ جائے گا۔

ایک تقاضا

مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۴-۱۸۵۷) نے جدید اسلامی تعلیم کی تحریک اٹھائی۔ انھوں نے اس زور وشور کے ساتھ اس کی آواز بلند کی کہ ہر طرف اس کا چرچا شروع ہو گیا۔ اس وقت جدت پسند طبقہ نے یہ اعتراض کیا کہ اسلامی تعلیم مسلم نوجوانوں کو پیچھے لے جائے گی۔ کیوں کہ اسلام علم کا مخالف ہے۔ اس کی مثال یہ دی گئی کہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں اسکندریہ (مصر) فتح ہوا۔ اس وقت وہاں ایک بہت بڑا یونانی کتب خانہ تھا جو بطلیموس کے زمانہ سے چلا آرہا تھا۔ مگر یہ مسلمان علم کے اتنے ناقدر شناس تھے کہ انھوں نے اس کتب خانہ کو جلا کر خاک کر دیا۔ دنیا گزشتہ انسانی دماغوں کے ورثہ سے محروم ہو گئی۔

اس وقت مولانا شبلی نے اس مسئلہ کی زبردست تحقیق شروع کی اور پھر اس موضوع پر ایک محققانہ مقالہ شائع کیا۔ اس مقالہ میں انھوں نے تاریخی حوالوں سے ثابت کیا کہ مذکورہ کتب خانہ اسلامی فتح سے بہت پہلے برباد ہو چکا تھا۔ حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہ گیا تھا۔ مولانا شبلی نے تاریخی حقائق کے ذریعہ ثابت کیا کہ اسکندریہ کا کتب خانہ عیسائیوں نے اپنے زمانہ میں برباد کیا تھا۔ بعد کو چھٹی صدی ہجری کے ایک عیسائی مورخ ابو الفرج ملطی نے یہ کیا کہ عیسائیوں کو اس الزام سے بچانے کے لیے اس واقعہ کو غلط طور پر مسلمانوں کی طرف منسوب کر دیا۔ مولانا شبلی کی یہ بات اتنی مدلل تھی کہ بعد کو خود یورپی محققین نے اس کی تائید کی۔

اس مثال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا شبلی نے جو مہم اٹھائی وہ پوری طرح اس کے اہل (Competent) تھے۔ انھوں نے جس طرح جدید اسلامی تعلیم کا غلغلہ بلند کیا اسی طرح وقت کی طرف سے پیش آنے والے سوالات کا اعلیٰ ترین علمی اور عقلی سطح پر جواب بھی دیا۔ اس کے برعکس مثال ان لوگوں کی ہے جو موجودہ زمانہ میں "تحفظ شریعت" کی تحریک لے کر اٹھے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو اس عظیم تحریک کا اہل ثابت نہ کر سکے۔ انھوں نے مداخلت فی الدین کا نعرہ تو بہت لگایا مگر اس جدید ذہنی تقاضہ کو پورا نہ کر سکے کہ

اسلامی قانون کو اعلیٰ علمی سطح پر مدلل کر کے پیش کر دیں۔

۸۶ - ۱۹۸۵ ہندستانی مسلمانوں کے لیے اسلامی شریعت کا سال تھا۔ محمد احمد۔شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ محمد احمد اپنی مطلقہ بیوی کو ماہانہ ۱۸۰ روپیہ گذارہ ادا کریں۔ یہ فیصلہ اسلامی شریعت کے خلاف تھا۔ چنانچہ ہندستانی مسلمانوں کا مذہبی طبقہ اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ ہر طرف مداخلت فی الدین کے نعرے لگنے لگے۔ جلسہ اور جلوس کی سیاست نے اتنا ترقی کی کہ لوگوں کے خیال کے مطابق خلافت تحریک کے بعد اس قسم کی مثال نہیں دیکھی گئی۔ بالآخر ہندستانی مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ مئی ۱۹۸۶ میں مطلقہ مسلم خواتین کے بارے میں ہندستانی پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کر دیا۔

مگر یہ فتح اپنے ساتھ ایک عظیم شکست بھی لے آئی ہے۔ مسلمانوں نے اپنی پرشور تحریک تمام تر صرف مداخلت فی الدین اور تحفظ شریعت کے نام پر چلائی۔ ان کے اصاغر و اکابر میں سے کوئی بھی شخص یہ کام نہ کر سکا کہ مضبوط دلائل کے ساتھ یہ ثابت کرتا کہ اسلام کا قانون ہی درست اور مفید قانون ہے۔ آج کا انسان ہر چیز کو عقل پر پرکھتا ہے۔ اب چوں کہ مسلمان اعلیٰ عقلی معیار پر شرعی قانون کو مدلل نہ کر سکے اس لیے ظاہری فتح کے باوجود ایسا نہ ہو سکا کہ لوگوں کے ذہن پر اسلامی قانون کی عظمت قائم ہوتی۔

مسلمانوں کی ہنگامہ خیز تحریک کا یہ نتیجہ ہوا کہ اسلام کا نکاح و طلاق کا قانون سارے ملک میں زیر بحث آگیا۔ ہر اخبار و رسالہ اس کے بارے میں اظہار خیال کرنے لگا۔ ہر جگہ اس پر بحث ہونے لگی۔ اب ایک طرف ہمارے علما رتھے جو اصرار کر رہے تھے کہ شریعت کے مطابق مطلقہ عورت کو نفقہ نہیں دیا جا سکتا۔ دوسری طرف مسلمانوں کا جدید طبقہ اور غیر مسلم حضرات تھے جو ہندستان کے کریمنل پروسیجر کوڈ کی دفعہ ۱۲۵ کی حمایت کر رہے تھے جس کے مطابق مطلقہ عورت کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے سابقہ شوہر سے ۵۰۰ روپیہ ماہانہ کی حد تک گزارہ وصول کر سکتی ہے۔

اسلام کا قانون بلاشبہ انتہائی معقول اور بہتر قانون ہے۔ مگر ہمارے علمار اس کی معقولیت کو جدید دلائل کے ساتھ ثابت شدہ نہ بنا سکے۔ وہ صرف مداخلت فی الدین کے نام پر

لوگوں کی بھیڑ جمع کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بظاہر دیکھنے والوں کو اسلام کا قانون کم تر اور جدید قانون برتر نظر آیا۔ اسلام کا قانون، علما کی نمائندگی کے مطابق، بس یہ تھا کہ ایک مرد جب چاہے اپنی عورت کو طلاق دے کر اپنے گھر سے رخصت کر دے اور اس کے بعد اس کے اخراجات کی کوئی ذمہ داری مرد کے اوپر نہ رہے۔ دوسری طرف جدید قانون کی تصویر ان کے سامنے یہ آئی کہ وہ طلاق کے بعد بھی عورت کو سہارا دیتا ہے۔ وہ شوہر کی زیادتی کی تلافی اس صورت میں کرتا ہے کہ اس کو قانونی طور پر پابند کرتا ہے کہ وہ اپنی مطلقہ بیوی کو ماہانہ گزارہ ادا کرے۔ ہمارے علما نے جو کچھ کیا، اپنی نیت کے اعتبار سے تحفظ شریعت کے لیے کیا، مگر عملاً وہ اسلام کو کم تر (Degrade) کرنے کے ہم معنی بن گیا۔

اس میں یہ سبق ہے کہ آدمی کو ہمیشہ ایسے کام کو لے کر اٹھنا چاہیے جس کے لیے وہ واقعۃً اہل (Competent) ہو۔ اگر وہ پیش نظر مہم کو سنبھالنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو تو اس کا چپ رہنا اس سے بہتر ہے کہ وہ اقدام کرے۔ کیوں کہ وہ اقدام کر کے بات کو اور بگاڑ دے گا، وہ اس کو بنانے کا سبب نہیں ہو سکتا۔

۴ مئی ۱۹۸۶ کا واقعہ ہے۔ اس دن نئی دہلی کے انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں ایک اجتماع (Dialogue) تھا۔ اس موقع پر راجدھانی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان اور ہندو بلائے گئے۔ پروگرام کے مطابق ایک مشہور مسلمان قائد نے مفصل تقریر کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ شریعت ہم کو جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ ہم کسی قیمت پر شریعت کے اندر مداخلت کو برداشت نہیں کر سکتے۔ قرآن کے مطابق مطلقہ عورت کے لیے نفقہ نہیں ہے۔ اس لیے ہم کسی مسلمان عورت کو یہ اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ وہ ملکی عدالت میں جائے اور وہاں سے ملکی قانون کے مطابق اپنے سابق شوہر سے نفقہ وصول کرنے کا حکم حاصل کرے۔

قائد موصوف نے اس موضوع پر کافی پر جوش تقریر کی مگر وہ یہ نہ کر سکے کہ شریعت کے اصول کو عقلی طور پر اس طرح مدلل کریں کہ لوگ اس کی برتری ماننے پر مجبور ہو جائیں۔ چنانچہ جب انھوں نے تقریر ختم کی تو ایک ہندو بزرگ نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں اس قسم کی باتیں قبول نہیں کی جا سکتیں۔ آپ کو اپنے قانون کی معقولیت بتانی ہوگی۔ صرف ادعا ہرگز کافی نہیں۔ کل

اگر آپ یہ کہیں کہ ہماری شریعت میں لکھا ہوا ہے کہ بہو پر تیل چھڑک کر اس کو جلا دو تو کیا آپ کو اپنی بہو کو جلانے دیا جائے گا۔ اور ملکی قانون اس میں مداخلت نہیں کرے گا۔

ہندو مقرر نے سب کے سامنے علی الاعلان یہ بات کہی۔ مگر قائد موصوف اس کی تردید میں کوئی مدلل بات پیش نہ کر سکے۔

ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ موجودہ زمانہ تعقل کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانہ کا انسان ہر بات کو عقل پر جانچتا ہے اور اس کو اسی وقت قبول کرتا ہے جب کہ وہ عقلی معیار پر پوری اترے۔ ایسی حالت میں اگر ہم کسی اسلامی اشو کو عوامی سطح پر اٹھائیں اور اس کے عنوان پر ہنگامہ خیز سیاست چلائیں تو ہمیں پیشگی طور پر یہ جاننا چاہیے کہ آج کل کا انسان اس کے حق میں عقلی دلیل مانگے گا۔ وہ اس کو قابل لحاظ ماننے کے لیے یہ مطالبہ کرے گا کہ اس کو معقول اور مدلل بنا کر پیش کرو۔ اگر ہم ایسا نہ کر سکیں تو ہم جدید انسان کی نظر میں اسلام کو کمتر اور حقیر بنا کر رکھ دیں گے خواہ بطور خود ہم یہی سمجھتے رہیں کہ ہم نے اسلام کا جھنڈا پارلیمنٹ کی دیواروں پر گاڑ دیا ہے۔

پانی پت کے قریب ایک گاؤں میں ۲۸ دن کا ایک بچہ چرایا گیا اور اس کو "دیوی جی" کے نام پر قربان کر دیا گیا۔ قربانی کرنے والوں کا عقیدہ تھا کہ اس طرح ان کی مراد پوری ہو جائے گی۔ (ٹائمس آف انڈیا ۹ ستمبر ۱۹۸۶) اس طرح کے واقعات اخباروں میں برابر آتے رہتے ہیں۔ اسی طرح افریقہ کے بعض قبائل اپنے توہماتی عقیدہ کے تحت اپنی عورتوں کے چہرے گرم لوہے سے داغتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ساری عمر کے لیے ان کے چہرے بگڑ جاتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ اگر اپنے رواجوں کو قانون کی صورت دینے کے لیے ہنگامے کریں اور ووٹ پسند حکمراں ان کے حق میں قانون بھی بنا دیں تب بھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ آج کی دنیا میں ان کو باعزت مقام حاصل ہو جائے۔ اسلام کا قانون بلاشبہ معقول ترین قانون ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں اس کی معقولیت پر پردہ پڑ گیا ہے۔ آج اصل ضرورت یہ ہے کہ ان پردوں کو ہٹا کر اسلام کی تعلیمات کی معقولیت کو دوبارہ نمایاں کیا جائے۔ جس دن اسلام کو یہ فکری عظمت حاصل ہو گی، بقیہ تمام عظمتیں اپنے آپ اس کو حاصل ہو جائیں گی۔

نیا دور

ٹائمس آف انڈیا (۲ جنوری ۱۹۹۲) میں صفحہ ۱۰ پر نقطۂ نظر (Viewpoint) کے کالم کے تحت مسٹر چندرابی کھنڈوری کی یاد داشت چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے : (The Muslim Role)
مسٹر کھنڈوری لکھتے ہیں کہ وہ لوگ جنھوں نے انڈیا کی آزادی کے وقت مولانا ابوالکلام آزاد کو دیکھا تھا، انھیں یاد ہوگا کہ اس وقت وہ بٹوارہ کے المیہ پر بری طرح رو رہے تھے :

Those who watched Maulana Azad on the eve of independence remember him weeping bitterly at the tragedy of partition. (Chandra B. Khanduri)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو ملک کے بٹوارہ کا کتنا زیادہ غم تھا۔ وہ یہ یقین کرنے میں حق بجانب تھے کہ بٹوارہ ملک کے لیے زہر ہے۔ اس کے نتیجہ میں آزادی ایک نئے قسم کی بربادی کے ہم معنی بن جائے گی۔

اس معاملہ میں واقعہ کا ایک پہلو یہ تھا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے کے ہندستان میں مولانا ابوالکلام آزاد کی بات نہیں چلی۔ مسلمانوں کے درمیان مسٹر محمد علی جناح نے سب سے بڑے قائد کی حیثیت حاصل کرلی۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ مولانا آزاد کے نقشہ کے خلاف انڈیا دو حصوں میں بٹ گیا۔

مگر اس واقعہ کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ وہ یہ کہ ۱۹۴۷ کے بعد ملک میں جو حالات پیدا ہوئے اس نے اچانک مولانا ابوالکلام آزاد کو مسلمانوں کے درمیان رہنما نمبر ایک کی حیثیت دے دی۔ ملک کے تمام مسلمان اب ان کی طرف دیکھنے لگے کہ نئے ہندستان میں وہ انھیں کوئی راہ دکھائیں۔ مگر ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں فعال قائد بننے والے مولانا آزاد ۱۹۴۷ کے بعد کے دور میں ایک غیر فعال قائد بن کر رہ گئے۔ انھوں نے مسلمانان ہند کو نئے حالات کے اعتبار سے کوئی واضح رہنمائی نہ دی۔ حالانکہ ملک کی تقسیم کے بعد مولانا آزاد گیارہ سال تک زندہ رہے۔ اس طرح انھیں کام کرنے کا طویل وقفہ حاصل ہوا۔

اسی سے ملتا جلتا معاملہ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا ہے۔ مولانا مدنی آزادی کے بعد دس سال تک زندہ رہے۔ مولانا سیوہاروی کو آزادی کے بعد پندرہ سال تک جینے

کا موقع ملا۔ مسلمانانِ ہند کے تحفظ کے سلسلہ میں ان لوگوں کی خدمات بلاشبہہ قابل قدر ہیں مگر ان حضرات نے کبھی نئے حالات کے اعتبار سے مسلمانوں کو کوئی واضح اور مثبت رہنمائی نہ دی۔ یہاں تک کہ وہ اس دنیا سے چلے گئے۔

مثال کے طور پر، ۱۹۴۷ سے پہلے مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، سب کے سب یہ کہتے تھے کہ قوم وطن سے بنتی ہے۔ اس لیے اس ملک کے ہندو اور مسلمان دونوں ایک قوم ہیں۔ لیکن حیرت انگیز بات ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد اس معاملہ میں یہ سب حضرات بالکل خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے کبھی یہ مہم نہیں چلائی کہ مسلمانوں میں علیٰحدگی پسندی کا ذہن ختم کریں اور ان کے اندر ہندستانی قومیت کا ذہن بنائیں۔ جب کہ حالات کے اعتبار سے سب سے زیادہ ضروری کام یہی تھا۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ہندستانی مسلمانوں کو سوچ کا ایک رخ مل جاتا، اور ان کے لیے ممکن ہو جاتا کہ وہ حالات سے موافقت کرکے اس ملک میں اپنی زندگی کی تعمیر کر سکیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے ہم خیال دوسرے رہنماؤں کی اس غیر فعالیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۷ کے بعد کے انڈیا میں بھی مسلمانوں کے اندر وہی سوچ جاری رہی جو ۱۹۴۷ سے پہلے کے انڈیا میں انھیں مسٹر جناح نے دی تھی۔ ۱۹۴۷ کے بعد اٹھنے والے نئے لیڈروں میں بھی کوئی اس صلاحیت کا نہ تھا کہ وہ مسٹر جناح اور ان کے ہم نوا ڈاکٹر اقبال کے فکری غلبہ کو توڑ سکے۔ چنانچہ بعد کا دور عملی طور پر پچھلی قیادت کی توسیع بن گیا جو آج تک جاری ہے۔

مسٹر جناح اور ان کے ساتھیوں نے مسلمانوں کو دو قومی نظریہ سکھایا تھا۔ مسلمانوں کا پورا ذہن اس فکر کے تحت بنا تھا کہ ہندو الگ قوم ہیں اور مسلمان الگ قوم۔ اس فکر نے مسلمانوں کو جو طریقہ دیا وہ دوری اور ٹکراؤ کا طریقہ تھا۔ وہ احتجاج اور مطالبات پر مبنی تھا۔ وہ حقوق طلبی کی زبان کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتا تھا۔ وہ یہ تھا کہ مسائل کو نمایاں کیا جائے اور مواقع کو غیر مذکور چھوڑ دیا جائے۔

چنانچہ ۱۹۴۷ کے بعد کا پورا دور اسی سابقہ فکری راستہ پر چل پڑا۔ مسٹر جناح نے چودہ پوائنٹ پر مشتمل اپنے مطالبات پیش کیے تھے۔ نئی لیڈر شپ نے بیس پوائنٹ پر مشتمل اپنے مطالبات پیش کر دیے۔ مسٹر جناح نے علحدہ قومیت کی بات کی تھی، نئی قیادت نے علحدہ تشخص کی بات شروع کر دی، مسٹر جناح نے مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کا ذمہ دار ہندو کو بتایا تھا۔ نئے لیڈروں نے اکثریتی فرقہ

کی محکومت کو مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کا ذمہ دار بتانے پر اپنی ساری طاقت خرچ کر دی۔ مسٹر جناح نے مسلمانوں میں زرد صحافت کو رواج دیا تھا۔ وہ مزید شدت کے ساتھ بعد کے دور میں بھی جاری رہی۔

مسٹر جناح کی غلط رہ نمائی کے نتیجہ میں مسلمانوں نے انتہائی غلط طور پر ہندوؤں کو غیر قوم سمجھ لیا تھا، ۱۹۴۷ کے بعد رہ نمائی کے خلا کی بنا پر مسلمان دوبارہ ہندوؤں کو غیر قوم ہی سمجھتے رہے۔ مسٹر جناح کی غلط رہ نمائی نے مسلمانوں کا یہ ذہن بنایا تھا کہ مشترک ہندستان ان کا وطن نہیں بن سکتا، یہی ذہن بعد کو بھی مسلمانوں میں کم و بیش باقی رہا۔ وہ اب بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر یہی سمجھتے رہے کہ ہندستان ان کا اصلی وطن نہیں ہے۔ اس طرح مسلمان ذہنی طور پر خود اپنے وطن میں بے وطن بن کر رہ گئے۔

میرے نزدیک، موجودہ مسلم قیادت، بے ریش اور باریش دونوں، تقریباً بلا استثنا، مسٹر جناح کے قیادتی انداز کی توسیع ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ ہر ایک بنیادی طور پر وہی بات کہہ رہا ہے جو مسٹر جناح نے اور ان کے فکری ہم نوا ڈاکٹر اقبال نے کہی تھی۔ دونوں کے درمیان الفاظ کا فرق ہو سکتا ہے، مگر ان میں حقیقت کا کوئی فرق نہیں۔

اور ہندو بھی

گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو ہندو بھی عملاً مسٹر جناح کے راستہ پر چل پڑے۔ ۱۹۴۷ کے بعد وہ بھی مسٹر جناح کے فکری پیرو بن گئے۔ انھوں نے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر مسٹر جناح کے زیر تاثر یہ سمجھ لیا کہ انڈیا میں دو قومیں بستی ہیں۔ ایک ہندو، اور دوسرے مسلمان۔ یہی وہ چیز ہے جو ہندو مسلم تعلقات کے بگاڑ کا اصل سبب ہے۔

انڈیا میں مسلمان ایک ہزار سال سے بھی زیادہ مدت سے آباد ہیں۔ ان کی تعداد پہلے تھوڑی تھی اب بڑھتے بڑھتے تقریباً پندرہ کرور ہو چکی ہے۔ یہ مسلمان کون لوگ ہیں۔ یہ زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو پہلے ہندو تھے۔ بعد کو انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ گویا کہ یہ مسلمان بھی نسلی اعتبار سے اسی طرح انڈین ہیں جس طرح دوسرے ہندو انڈین ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے بجا طور پر لکھا ہے کہ پچھلے ہزار سال کے دوران ہندوؤں میں کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ صرف ہندو لوگ انڈین ہیں، مسلمان انڈین نہیں ہیں۔ ہندو عقیدہ یہ ہے کہ

سچائی ہر مذہب میں پائی جاتی ہے۔ اس لیے جب کوئی ہندو اسلام قبول کرلیتا تو وہ اپنے عقیدہ کے مطابق، یہ سمجھتے تھے کہ وہ سچائی کے ایک حلقہ سے نکل کر سچائی کے دوسرے حلقہ میں چلا گیا ہے۔ اور چونکہ نسلی اعتبار سے وہ ان کی اپنی نسل ہی سے تعلق رکھتا تھا اس لیے وہ ان کے انڈین ہونے پر بھی کوئی شک نہیں کرتے تھے (ڈسکوری آف انڈیا ۸۱ ۔ ۲۸۰)

مغل دور میں بیشتر راجاؤں نے مغلوں کا ساتھ دیا۔ شیواجی نے اورنگ زیب کے خلاف بغاوت کی۔ مگر اس کا تعلق کچھ بھی اس بات سے نہیں تھا کہ اورنگ زیب مسلمان ہے۔ شیواجی کو اورنگ زیب کی صرف بعض پالیسیوں سے اختلاف تھا۔ چنانچہ جے پور کے راجہ کے نام ایک خط میں شیواجی نے لکھا تھا کہ دہلی کے تخت پر اگر اورنگ زیب کے بجائے دارا شکوہ ہوتا تو وہ ہرگز اس کے خلاف لڑائی نہ لڑتے۔ وہ اس کی ماتحتی قبول کر لیتے۔

۱۹۴۰ سے انڈیا کی تاریخ میں ایک نیا دور آتا ہے جب کہ مسٹر محمد علی جناح نے دو قومی نظریہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ قومیت کا تعلق وطن سے نہیں ہے بلکہ مذہب سے ہے۔ اور چونکہ مسلمانوں کا اور ہندوؤں کا مذہب الگ الگ ہے اس لیے دونوں الگ الگ قوم ہیں۔ انھوں نے اپنے اسی دو قومی نظریہ کی بنیاد پر برصغیر ہند میں دو الگ الگ وطن کا مطالبہ کیا۔

مسٹر محمد علی جناح کے اس فکر کے ردعمل میں پہلی بار ہندوؤں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مسلمان الگ قوم ہیں اور ہندو الگ قوم ہیں۔ انتہا پسند ہندو اب مسلمانوں کی وطنی وفاداری پر شک کرنے لگے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمان غیر ملکی ہیں۔ یہ خیال پختہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ پاکستان جیسے مسلم ملک کے مقابلہ میں بریگیڈیر عثمان اور حوالدار عبدالحمید کی غیر معمولی قربانیاں بھی اس فکر کا خاتمہ نہ کر سکیں۔ مسٹر جناح کے ردعمل میں پیدا ہونے والا فکر کسی جوابی فکر سے ٹوٹ سکتا تھا۔ چونکہ ۱۹۴۷ کے بعد کوئی ایسی طاقتور فکری تحریک برپا نہیں ہوئی اس لیے یہ فکر بھی لوگوں کے ذہنوں سے محو نہ ہو سکا۔

انڈیا کے لوگ ہمیشہ سے یہ مانتے آرہے تھے کہ قوم وطن سے بنتی ہے۔ جو لوگ ایک وطن میں ہوں وہ سب ایک قوم ہیں۔ مگر مسٹر جناح کے دو قومی نظریہ سے متاثر ہو کر یہاں کے ہندو یہ سمجھنے لگے کہ چونکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مذہب الگ الگ ہے، اس لیے دونوں الگ الگ قوم ہیں۔

انڈیا کا ہندو مسلم مسئلہ پچاس فی صد اس لیے ہے کہ ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد بھی یہاں کے

مسلمان مسٹر جناح کے علٰحدگی پسندی کے نظریہ سے متاثر رہے۔ اور بقیہ پچاس فی صد اس لیے ہے کہ یہاں کے ہندو بھی کم از کم عملی طور پر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ قوم وطن سے نہیں بنتی بلکہ مذہب سے بنتی ہے۔ اس لیے ہندو الگ قوم ہیں اور مسلمان الگ قوم۔ وہ جناح کو رد کرتے ہیں، مگر وہ جناح کے نظریہ کو پوری طرح قبول کیے ہوئے ہیں۔

دور انقلاب

کسی فکری انقلاب کے لیے حالات کی موافقت ضروری ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد وہ حالات مکمل طور پر پیدا ہو گئے ہیں جب کہ مسٹر جناح کے اس فکری تسلسل کو آخری طور پر توڑ دیا جائے۔ بابری مسجد کے نام پر مسلمانوں کے درمیان جو تحریک اٹھی، وہ مکمل طور پر جناحی پیٹرن پر اٹھنے والی تحریک تھی۔ بابری مسجد کا ڈھایا جانا بلاشبہ ایک ٹریجڈی تھی۔ لیکن اگر بابری مسجد کا انہدام مسٹر جناح کے فکری تسلسل کا انہدام بن جائے تو میں سمجھوں گا کہ اس ٹریجڈی میں بھی ایک تابناک پہلو موجود ہے۔ یہ ناموافق حادثہ اپنے اندر ایک موافق پہلو لیے ہوئے ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (۲ جنوری ۱۹۹۳) میں مسٹر چندر رابی کھنڈوری کا جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں انھوں نے ایک مسلم خاتون ناہید اشرف کے ایک مطبوعہ مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم نے اس مضمون کو پڑھا۔ اس نے مجھ کو، میرے گھر والوں کو اور میرے دوستوں کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ جو چیز ہمارے دلوں میں گھس گئی، وہ مسلم خاتون کے یہ الفاظ تھے کہ اب لیڈروں کو ایک بات اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ کوئی بھی ہندستانی مسلمان اس ملک کو چھوڑنے والا نہیں ہے۔ بس ایک بار کافی تھا، مسلمان مہاتما گاندھی کی طرح مرجائیں گے مگر وہ یہاں سے نہیں جائیں گے۔ خواہ ہمارا کھنڈر ہی یہاں ہماری یاد کے لیے باقی رہ جائے :

> Reading 'Once Was Enough' by Naheed Ashraf moved me, my children and my friends. What penetrated our hearts were the words: 'Now let the leaders keep one thing in mind that no Indian Muslim is going to leave this country. Once was enough...they will rather die like Gandhi...let the ruins keep reminding us...' Naheed shows the greatness of our Muslim community.(p.10)

جاپان میں دوسری عالمی جنگ کے بعد عمل معکوس (reverse course) کے نام سے ایک

تحریک اٹھی۔ اس کا مقصد جاپانیوں کے قبل از جنگ ذہن کو بدل کر ان میں نیا تعمیری ذہن پیدا کرنا تھا۔ آج ہمیں بھی اسی قسم کے ایک عمل معکوس کی ضرورت ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ یہ عمل معکوس اب انڈیا کے ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کے اندر شروع ہو چکا ہے۔

اب ہمیں ایک طرف ہندستانی مسلمانوں کو بتانا ہے کہ تم اور ہندو دو قوم نہیں ہو بلکہ ایک قوم ہو۔ ہمیں ان کے اندر نفرت کے بجائے محبت کی ہوائیں چلانا ہے۔ ہمیں مسلمانوں کو بتانا ہے کہ تم کو ٹکراؤ کے بجائے ایڈجسٹمنٹ کی پالیسی کو اختیار کرنا چاہیے۔ ہمیں ان کے اندر یہ شعور ابھارنا ہے کہ نئے انڈیا میں ان کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا کسی دوسرے کا۔ البتہ یہ حصہ ان کو میرٹ کی بنیاد پر ملے گا نہ کہ رزرویشن اور مطالبہ کی بنیاد پر۔ ہمیں مسلمانوں میں نئی تعمیری صحافت کو وجود میں لانا ہے، ایسی صحافت جو منصفانہ واقعہ نگاری پر مبنی ہو، جو مسائل سے زیادہ مواقع کو نمایاں کرنے میں دلچسپی رکھتی ہو۔

اسی قسم کی تحریک ہندوؤں کے درمیان چلنا بھی ضروری ہے۔ ہندو بھائیوں سے یہ کہنا ہے کہ وہ جناحی طرز فکر کو چھوڑ دیں، اور اپنے ماضی والے فکر کو دوبارہ اختیار کر لیں۔ وہ جناح کے مذہب کے بجائے خود اپنی روایات والے اس مذہب پر آجائیں جس کا اہم ترین پہلو تعدد میں وحدت کو دیکھنا ہے۔ مسٹر چندرا بی کھنڈوری نے اپنا مذکورہ مضمون ان الفاظ پر ختم کیا ہے کہ ضرورت ہے کہ ہم اپنے مشترک کلچر کے مطابق اپنی روایتی عقلیت اور رواداری کی طرف لوٹ آئیں :

In consonance with our composite culture, we need, therefore, to return to our traditional rationality and tolerance.

یہ الفاظ کسی ایک شخص کے الفاظ نہیں ہیں۔ وہ کروروں ہندوؤں کے دل کی ترجمانی ہیں۔ اس کا ایک اظہار وہ ہے جو ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے حادثہ کے بعد بار بار پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا میں ہمارے سامنے آتا رہا ہے۔

یہی بھارت کا ضمیر ہے۔ بھارت کا ضمیر جو ۶ دسمبر سے پہلے عارضی طور پر سو گیا تھا، اب وہ پوری طاقت کے ساتھ جاگ اٹھا ہے۔ اور ضمیر جب جاگ اٹھے تو وہ اپنی تکمیل سے پہلے دوبارہ کبھی نہیں سوتا۔ تاریخ کا تجربہ ہے کہ ضمیر کی آواز ہر دوسری آواز پر غالب آتی ہے۔ اور انڈیا کا معاملہ بلاشبہہ فطرت کے اس عالمی قانون سے مستثنیٰ نہیں۔

مجھے یقین ہے کہ انڈیا میں اب نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے، فی الحال یہ آغاز زیادہ تر ایک تاریخی عمل (historical process) کی صورت میں ہے۔ مگر دھیرے دھیرے انشاءاللہ وہ شعور کا درجہ اختیار کرے گا۔ اور جب وہ شعور کے درجہ میں پہنچے گا تو اس کا عمل بھی زیادہ تیز اور موثر ہو جائے گا۔ اس واقعہ کو بہر حال ظہور میں آنا ہے۔ اس کے اور ہمارے درمیان ضروری مدت کے سوا کوئی بھی دوسری چیز حائل نہیں۔

انسانی زندگی میں جب بھی کوئی نیا دور آتا ہے تو وہ ہمیشہ اس طرح آتا ہے کہ اس میں پچاس فی صد حصہ تاریخی عوامل ادا کرتے ہیں، اور بقیہ پچاس فی صد حصہ خود اس انسانی گروہ کو ادا کرنا ہوتا ہے جس کے درمیان وہ انقلاب آرہا ہو۔

آج ہم اسی امتحانی دور میں ہیں۔ اس وقت ہمارا کام یہ ہے کہ موجودہ حالات میں ابھرنے والے تاریخی عوامل کو پہچانیں اور پھر حکمت اور دانش مندی کے ساتھ انھیں اپنے حق میں استعمال کریں۔ اگر ہم نے اپنے حصہ کا یہ ۵۰ فی صد کام درست طور پر انجام دے دیا تو اس کے بعد مطلوبہ نئے دور کا آنا اتنا ہی یقینی ہو جائے گا جتنا گردش زمین کے قانون کے تحت تاریک شام کے بعد روشن صبح کا نمودار ہونا۔

دو طریقے

تحریک چلانے کے دو طریقے ہیں ۔ ایک دعوت کا طریقہ ، اور دوسرا طریقہ وہ ہے جس کو موجودہ زمانہ میں انقلابی (Revolutionary) طریقہ کہا جاتا ہے ۔ دعوتی طریقہ کا نمونہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ملتا ہے ۔ اور انقلابی طریقہ کا نمونہ وہ ہے جو کمیونسٹ پارٹیوں کے یہاں پایا جاتا ہے ۔

آج کل کے مسلمانوں میں انقلابی طریقہ بہت مقبول ہو رہا ہے ۔ ہر جگہ کے مسلمان انقلابی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اپنے مفروضہ حریف کے خلاف نبرد آزما ہیں ۔ جن لوگوں کے حالات گولی اور بم استعمال کرنے کی اجازت دیتے ہیں وہ گولی اور بم استعمال کر رہے ہیں ۔ اور جن لوگوں کے حالات میں اس حد تک جانے کا موقع نہیں ہے ، وہ لفظی بمباری کے ذریعہ اپنی انقلابی مہم چلانے میں مشغول ہیں ۔

دعوت کا طریقہ نبیوں کا طریقہ ہے اور پیغمبر آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے ۔ اس کے برعکس نام نہاد انقلابی طریقہ مارکس اور لینن کی سنت ہے ۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کو ہر سنجیدہ آدمی جانتا ہے ، اسلامی الفاظ یا اسلامی اصطلاحات بول کر اس کو بدلا نہیں جا سکتا ۔

پھر کیا وجہ ہے کہ تمام مسلمان "انقلابی طریقہ" کی طرف دوڑ رہے ہیں ۔ کسی کو بھی "دعوتی طریقہ" سے دلچسپی نہیں ۔ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انقلابی طریقہ ردّ عمل کا طریقہ ہے ، اور دعوتی طریقہ صبر اور اعراض کا طریقہ ۔ اور ردّ عمل کے مقابلہ میں صبر و اعراض بلاشبہ مشکل ترین کام ہے ۔

انقلابی طریقہ کی بنیاد دوسروں سے نفرت پر ہے اور دعوتی طریقہ کی بنیاد دوسروں سے محبت پر ۔ انقلابی طریقہ عاجلانہ کارروائی کا طریقہ ہے اور دعوتی طریقہ انتظار کا طریقہ ۔ انقلابی طریقہ میں دوسروں کو پتھر مارا جاتا ہے اور دعوتی طریقہ میں خود پتھر کھانے کے لیے تیار ہونا پڑتا ہے ۔ انقلابی طریقہ میں شہرت ملتی ہے اور دعوتی طریقہ میں گم نامی ۔ انقلابی طریقہ میں خواہش رہنما ہوتی ہے اور دعوتی طریقہ میں کتاب و سنّت کو رہنما بنانا پڑتا ہے ۔ انقلابی طریقہ میں نشانہ خارج میں ہوتا ہے اور دعوتی طریقہ میں نشانہ داخل میں ۔

ربانی انسان

اسلامی تحریک کا مقصد حکومتوں کو توڑنا یا کسی قسم کا " نظام " قائم کرنا نہیں ہے۔ اسلامی تحریک کا مقصد انسان بنانا ہے۔ اسلامی تحریک کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایک انسان کو ربانی انسان بنادے۔ جب اس قسم کے انسان کسی سماج میں بڑی تعداد میں تیار ہوجائیں، تو ان کے مجموعی ارادہ سے جو چیز ظہور میں آتی ہے اسی کا نام اسلامی نظام ہے۔

اسلام کا نشانہ فرد ہے۔ اسلام ایسے انسان پیدا کرنا چاہتا ہے جو خدا کو ایک زندہ اور حاضر وناظر ہستی کی حیثیت سے پالیں۔ وہ دنیا میں خدا کی کاریگری کو دیکھ کر حیران رہ جائیں۔ وہ اس کے انتہاء انصاف کو سوچ کر اس کے شکر کے جذبہ سے نہا اٹھیں۔ وہ اس کی قوت وعظمت کو محسوس کرکے دہل جائیں۔ وہ اس کی پکڑ کے احساس سے ڈھ پڑیں۔

خدا کی موجودگی کا احساس ان کے اوپر اتنا زیادہ طاری ہو کہ ان کو اس سے حیا آنے لگے۔ کوئی برا کام کرتے ہوئے ان کو ایسا لگے جیسے خدا کی نگاہیں اس کو برچھی کی طرح چھید رہی ہیں۔ کسی کے اوپر ظلم کرتے ہوئے انھیں دکھائی دے کہ خدا کے فرشتے خدا کی جہنم کو لیے ہوئے کھڑے ہیں اور اس کی تمام ہولناکیوں کے ساتھ اس کو ان کے اوپر انڈیل دینا چاہتے ہیں۔

ایمان کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ خوف اور امید کے درمیان ہوتا ہے۔ مومن ایک طرف خدا کے خوف سے کانپتا ہے۔ اسی ساتھ وہ اس کی رحمت کا امیدوار بھی رہتا ہے۔ حتی کہ اہل ایمان کے دل میں خدا کی جنت کا شوق اتنا بڑھتا ہے کہ وہ خدا کی جنت کے تصور سے رقص کرنے لگتے ہیں۔ اپنی کوتاہیوں کا احساس اگر ان کے اندر خشیت کی تھرتھری پیدا کرتا ہے تو اسی کے ساتھ اللہ کی رحمت اور صمدیت کا احساس ان کو جنت کے لہلہاتے ہوئے باغوں کا مشاہدہ اسی دنیا میں کرادیتا ہے۔

حکومتوں سے ٹکرانا اور سیاسی انقلاب کے نعرے لگانا کوئی کام نہیں۔ اصل کام یہ ہے کہ ایسے انسان پیدا کیے جائیں جو خدا کی زمین پر خدا کے خوف اور خدا کی محبت سے سرشار ہوکر چلنے لگیں۔ ایسے انسان ہی دنیا میں انسانیت کی بہار لاتے ہیں اور جہاں ایسے انسان نہ ہوں، وہاں خزاں کے سوا کوئی اور چیز وجود میں آنے والی نہیں۔

تین قسم

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انسان تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک، ربانی عالم۔ دوسرے، وہ جو نجات کے راستہ کا طالب ہو۔ تیسرے، وہ ناکارہ اور پست لوگ جو ہر زور سے بولنے والے کے پیرو بن جائیں (الناس ثلاثۃ۔ عالمٌ ربانیٌّ۔ ومتعلم علیٰ سبیلِ نجاۃٍ۔ وھمجٌ رَعاعٌ اتباعُ کلِّ ناعق) لسان العرب ۱/۴۰۴

عالم ربانی وہ ہے جو اپنے رب کو پا گیا ہو اور اس کی زندگی میں وہ اوصاف پیدا ہو گئے ہوں جو رب العالمین کی معرفت سے ایک آدمی کے اندر پیدا ہونے چاہئیں۔

دوسرا شخص وہ ہے جو سچا متعلم ہو۔ سچا متعلم بے فائدہ باتوں میں اپنا دماغ نہیں الجھاتا۔ وہ نجات اور فلاح کا متلاشی ہوتا ہے۔ اور اس تلاش میں اپنی پوری توجہ لگا دیتا ہے۔

یہ دونوں قسم کے لوگ صحیح انسانی راستہ پر ہیں۔ وہ اپنے راستہ سے بھٹکے نہیں۔ وہ وہی سوچتے ہیں جو انھیں سوچنا چاہیے، اور وہی کر رہے ہیں جو انھیں کرنا چاہیے۔

اس کے بعد وہ لوگ ہیں جو حقیقت کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ ایک بات اور دوسری بات کا فرق نہیں جانتے۔ وہ سچے کلام اور جھوٹے کلام میں تمیز نہیں کر سکتے۔ ان کے نزدیک اہمیت کی بات یہ نہیں ہوتی کہ کون شخص حق کی طرف بلاتا ہے۔ اس کے بجائے ان کے یہاں ساری اہمیت اس کی ہوتی ہے کہ کون زیادہ زور سے چیختا ہے۔ کون زیادہ شاندار کلام کا مظاہرہ کرتا ہے۔ کون زیادہ بڑے بڑے الفاظ بولنے کا کرتب دکھا رہا ہے۔

انسان کی یہ تینوں قسمیں پہلے بھی پائی جاتی تھیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں مزید شدت سے وہ پائی جا رہی ہیں خاص طور پر تیسری قسم کے انسان کی مثال موجودہ زمانہ میں عام ہو گئی ہے۔ اس کا ایک خاص سبب پریس ہے۔ پریس کے دور نے اس قسم کے لوگوں کو یہ موقع دے دیا ہے کہ وہ پست اور ناکارہ ہونے کے باوجود غوغائی عمل کر کے شہرت حاصل کر لیں۔ اور پھر عوام کی بھیڑ اپنے گرد جمع کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

حضرت علیؓ کا قول موجودہ حالات پر مزید اضافہ کے ساتھ چسپاں ہوتا ہے۔

آپ ڈاکٹر ہیں

۲۴ مئی ۱۹۹۲ کو حیدرآباد کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان سید عارف الدین قادری (۳۴ سال) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ میں جناب ریاض احمد صدیقی (فتح منزل) کے پڑوس میں رہتا ہوں۔ وہ ہمیشہ ہم کو صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم داعی ہیں اور دوسرے لوگ ہمارے مدعو ہیں۔ اور داعی کو مدعو کے مقابلہ میں ہمیشہ صبر ہی کرنا پڑتا ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہا کہ عارف بھائی، آپ پاگلوں کے ڈاکٹر ہیں۔ اگر کوئی پاگل آپ کو پتھر مار دے تو کیا آپ بھی اس کو پتھر سے ماریں گے۔ نہیں۔ آپ اس کا علاج کریں گے، کیوں کہ آپ ڈاکٹر ہیں اور وہ مریض۔

ایک شخص آپ کو گالی دے یا آپ کے اوپر کیچڑ پھینکے تو اس کے مقابلہ میں آپ کے ردعمل کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ آپ اس کو وقار کا مسئلہ بنالیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ اس کو علاج کا مسئلہ بنائیں۔ اگرچہ واقعہ ایک ہی ہے۔ مگر دونوں صورتوں میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف جذبات آپ کے اندر ابھریں گے۔

پہلی صورت میں آپ کے اندر انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھے گا۔ آپ چاہیں گے کہ اس کو سزا دیں۔ اس کو کچل ڈالیں۔ اس کی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش کریں تاکہ اس کو ہمیشہ یاد رہے۔ جوابی کارروائی کے بغیر کسی طرح آپ کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوگا۔

دوسری صورت میں آپ کو اس سے ہمدردی پیدا ہوگی۔ آپ اس کو حریف نہیں بلکہ مریض سمجھیں گے۔ آپ اس کو شریر کی نظر سے نہیں بلکہ معذور کی نظر سے دیکھیں گے۔ آپ کی توجہ اس پر نہیں ہوگی کہ اس نے آپ کے ساتھ کیا کیا ہے، بلکہ آپ کی ساری توجہ اس پر مرتکز ہو جائے گی کہ آپ کس طرح اس کی برائی کو دور کریں اور اس کو ایک اصلاح یافتہ انسان بنا دیں۔

جو آدمی پہلی نوعیت کا کردار ادا کرے اس کے صبح و شام فرشتوں کی صحبت میں گزرنے لگتے ہیں۔ اور جو آدمی دوسری نوعیت کا کردار ادا کرے وہ شیطان کا ہم صحبت ہے۔ شیطان برا ہے۔ جو لوگ شیطان کی صحبت اختیار کریں وہ خود بھی برے بن جائیں گے۔ فرشتے پاکباز ہیں، جو لوگ فرشتوں کی صحبت اختیار کریں وہ خود بھی پاکباز بن جائیں گے۔

اعلان، اقدام

حق کا اعلان ہر حال میں مطلوب ہے، خواہ سننے والا اس کو سنے یا نہ سنے، خواہ مخاطب اس کو مانے یا نہ مانے۔ مگر حق کے لیے عملی اقدام کا معاملہ سراسر مختلف ہے۔ وہ نتیجہ کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر نتیجہ نکلنے کا یقینی امکان ہو تو اقدام کیا جائے گا۔ ورنہ اقدام سے باز رہ کر صرف صبر کیا جاتا رہے گا۔

اعلان اور اقدام کا یہ فرق قرآن و سنت میں واضح طور پر ملتا ہے۔ مثلاً قرآن میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ لوگوں کو حق بات کی یاد دہانی کراؤ۔ تم صرف یاد دہانی کرنے والے ہو۔ تم لوگوں کے اوپر داروغہ نہیں ہو۔ (الغاشیہ) یعنی نتیجہ نکلے یا نہ نکلے، ہر حال میں تبلیغ حق کا کام کرتے رہو۔ تمہارا کام پہنچا دینا ہے، نتیجہ نکالنا تمہارے ذمہ نہیں۔ یہ وہ بات ہے جو تبلیغ کے بارہ میں کہی گئی۔

دوسری طرف روایات میں آتا ہے کہ مکہ کے زمانے میں حضرت ابو بکر نے عملی اقدام کی بات کی تو آپ نے فرمایا: یا ابا بکر انا قلیل (اے ابو بکر ہم تھوڑے ہیں) اسی طرح حضرت عمرؓ نے عملی اقدام کے لیے کہا تو آپ نے دوبارہ فرمایا: یا عمر انا قلیل (اے عمر ہم تھوڑے ہیں) سیرت ابن کثیر، جلد اول۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہ قلّت تعداد اور قلّت وسائل کی وجہ سے ابھی ہم اس حالت میں نہیں ہیں کہ فریق ثانی کے خلاف اقدام کر کے کوئی واقعی نتیجہ برآمد کر سکیں۔ اس لیے ابھی ہم کوئی عملی اقدام نہیں کریں گے۔ ابھی ہم پیغام رسانی پر قانع رہ کر بقیہ امور میں صبر کی روش پر قائم رہیں گے۔

بولنے سے پہلے سوچنا ضروری ہے۔ اسی طرح ضروری ہے کہ آدمی کرنے سے پہلے کرنے کی تیاری کرے۔ جو شخص سوچے بغیر بولے وہ فضول گوئی کا مرتکب ہوگا۔ اسی طرح جو شخص ضروری تیاری کے بغیر اقدام کرے، اس کا اقدام نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ ایسا اقدام ایک قسم کی خودکشی ہے۔ وہ موت کی چھلانگ ہے نہ کہ زندگی کی طرف سفر۔

دعوت کی اہمیت

وان احد من المشرکین استجارك فاجره حتی یسمع کلام اللہ ثم ابلغہ مامنہ ذالك بانھم قوم لایعلمون (التوبۃ)

اور اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اس کو اس کی امن کی جگہ پر پہونچا دو۔ یہ اس لیے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے۔

عرب کے مشرکین جن سے آخری درجہ میں حالت جنگ قائم ہو چکی ہے، ان کے بارہ میں یہاں حکم دیا گیا کہ اگر ان میں سے کوئی شخص تمہارے پاس آئے اور اسلام کی بابت جاننا چاہے تو اس کو اپنی حفاظت میں رکھ کر موقع دو کہ وہ اسلام کو سمجھے۔ نہ دشمنی کی وجہ سے اس کو قتل کرو اور نہ جاسوس سمجھ کر اس کو بھگا دو۔ وہ پرسکون طور پر تمہارے درمیان رہے اور اسلام کی تعلیمات کو سمجھے۔ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں:

(ذالك بانھم قوم لایعلمون) ای انما شرعنا امان مثل ھولاء لیعلموا دین اللہ وتنتشر دعوۃ اللہ فی عبادہ

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۳۳۲)

(اس لیے کہ وہ علم نہیں رکھتے) یعنی اس قسم کے لوگوں کے لیے امان کا طریقہ ہم نے اس لیے مقرر کیا تاکہ وہ اللہ کے دین کو جانیں اور اللہ کی دعوت اس کے بندوں میں پھیلے۔

اس سورہ میں ایک طرف مشرکین سے برأت کا اعلان ہے اور ان کے قتل کا حکم ہے۔ گویا ان کی دشمنی اس آخری درجہ پر پہونچ چکی ہے جب کہ برداشت کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ مگر اس وقت بھی یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ اگر ان میں کا ایک شخص اسلام کی تحقیق کرنا چاہے تو اس کو تحقیق کا پورا موقع دیا جائے۔ ایک شخص کے دل میں اگر قبول حق کا کوئی جذبہ ہے تو اس جذبہ کو بروئے کار آنے کا موقع ملنا چاہیے۔ شدت کے باوجود نرمی، غصہ کے باوجود انصاف کی یہی صلاحیت ہے جو کسی شخص کو خدا کے دین کا داعی بناتی ہے۔

دعوت کا اصول

بینک کی آمدنی کا انحصار کسٹمر پر ہوتا ہے۔ یعنی وہ شخص جو بینک میں اپنی رقم جمع کرے یا بینک سے قرض لے۔ چنانچہ بینک کا یہ اصول ہے کہ اپنے کسٹمر کی آخری حد تک عزت کی جائے۔ بینک کے ملازموں کو ٹریننگ کے دوران بتایا جاتا ہے کہ کسٹمر ہمارے لیے بادشاہ کی حیثیت رکھتا ہے :

Customer is the king.

کسٹمر اگر کوئی نامناسب بات کہے اور بینک ملازم اس سے اس پر بحث کرنے لگے تو اندیشہ ہے کہ کسٹمر بدک کر واپس چلا جائے گا۔ اس لیے بینک ملازموں کو سکھایا جاتا ہے کہ تم کسٹمر سے کسی بات پر نہ الجھو۔ یہ سمجھ لو کہ کسٹمر ہمیشہ صحیح ہوتا ہے :

Customer is always right.

یہ طریقہ جو بینک اپنے کسٹمر کے ساتھ اختیار کرتا ہے، وہی طریقہ داعی اپنے مدعو کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔ داعی اپنے مدعو سے کسی بات پر نہیں الجھتا۔ داعی یک طرفہ طور پر اپنے مدعو کی تلخ باتوں کو برداشت کرتا ہے تاکہ اس کے اور مدعو کے درمیان ہمدردی کی فضا قائم ہو سکے۔

دعوت کی لازمی شرط صبر ہے۔ اگر صبر نہیں تو دعوت بھی نہیں۔ صبر کوئی پسپائی یا خود سپردگی نہیں۔ یہ ایک اعلیٰ مقصد کی خاطر اپنے جذبات پر قابو پانا ہے۔ یہ خدا کے دین کے تقاضوں کے لیے اپنی ذات کے تقاضوں کو قربان کرنا ہے۔

مدعو وہ ہے جو ابھی گمراہی میں پڑا ہوا ہو۔ اور جو لوگ گمراہی میں پڑے ہوئے ہوں، ان سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ حق کے اصولوں پر عمل کریں گے۔ وہ تو ابھی اپنی خواہش کے پرستار ہیں پھر وہ خدا کی پرستاری والا رویہ کیوں کر اختیار کر سکتے ہیں۔

داعی کو پیشگی طور پر یہ مان لینا چاہیے کہ مدعو کی طرف سے زیادتی کا سلوک ہوگا۔ مدعو کی طرف سے ایسے قول اور فعل کا مظاہرہ ہوگا جو داعی کے جذبات کو برہم کرنے والے ہوں۔ مگر ان سب کے باوجود داعی کو برداشت کے رویہ پر قائم رہنا ہے۔ اس برداشت کے بغیر کوئی شخص کبھی داعی نہیں بن سکتا۔

دعوتی عمل

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر جتنی بھی اصلاحی تحریکیں اٹھیں، ان سب نے اپنی کوششوں کا مرکز صرف مسلمانوں کو بنایا۔ یہ ایک بنیادی غلطی تھی جس کی بنا پر غیر معمولی کوششوں کے باوجود ان کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوسکا۔ کیوں کہ موجودہ مسلمان اپنے زوال کے نتیجہ میں ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح بن چکے تھے۔

ٹھہرے ہوئے پانی میں کثافت آجاتی ہے۔ جب کہ رواں پانی ہمیشہ اپنی تازگی کو باقی رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹھہرے ہوئے پانی میں نیا پانی شامل ہونا بند ہوجاتا ہے۔ یہی حال موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا ہے۔ وہ اب ٹھہرے ہوئے پانی کی مانند ہوچکے ہیں۔ اس لیے اب صرف مسلمانوں کے اندر اصلاحی کام کرنے سے ان کے اندر حقیقی زندگی نہیں آسکتی۔ اس کے لیے نئے خون (New blood) کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ ان کے پرانے پانی میں نئے پانی کا چشمہ شامل کیا جائے۔

مسلمانوں کے ٹھہرے ہوئے پانی کو رواں پانی بنانے کا طریقہ صرف ایک ہے۔ اور وہ دعوت ہے۔ دعوت کے ذریعہ دوسری قوموں کے لوگ آکر مسلمانوں کے دھارے میں ملتے ہیں۔ اس طرح پرانے پانی میں نیا پانی شامل ہوکر اس کو تازہ اور پرکیفیت بنادیتا ہے۔

یہ اہم فائدہ دعوت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ مسلمان دعوت کا کام چھوڑ کر ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح ہوجاتے ہیں۔ اور دعوت کے کام میں مشغول ہوکر اپنے پانی کو رواں پانی بنالیتے ہیں۔ دعوت کا کام خدائی فریضہ کی ادائیگی ہے اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کو زندہ گروہ کی حیثیت سے قائم رکھنے کی ضمانت بھی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ پہلے مسلمانوں کی اصلاح کرنا ضروری ہے۔ مسلمانوں کی اصلاح کے بعد ہی بیرونی دعوت کا کام کیا جاسکتا ہے۔ مگر نقل اور عقل دونوں اعتبار سے یہ ایک بے بنیاد نظریہ ہے (ملاحظہ ہو الرسالہ نومبر ۱۹۸۹، صفحہ ۲۷)

مزید یہ کہ موجودہ حالات میں یہ بالکل ناممکن ہے۔ مسلمان اس وقت اپنے زوال کے دور میں ہیں۔ اس لیے خود ان کی اصلاح کے لیے بھی صرف داخلی کوشش کافی نہیں ہوسکتی۔ مسلمانوں کے پرانے خون میں جب تک نیا خون بڑی مقدار میں شامل نہ کیا جائے ان کے اندر کوئی گہری تبدیلی لانا ممکن نہیں جو لوگ اس راز کو نہ جانیں وہ انسانی زندگی کی الف ب بھی نہیں جانتے۔

بے آمیز حق

ایک ہے عوام کی رعایت کرنا۔ اور دوسرا ہے خدا کی رعایت کرنا۔ جو تحریک عوامی جذبات کی رعایت کرے وہ بہت جلد اپنے ماحول میں عزت اور مقبولیت حاصل کر لیتی ہے۔ اس کا سفر آسانیوں کے جلو میں طے ہوتا ہے۔ دوسری تحریک وہ ہے جو خدا کی مرضی کا لحاظ کر کے اٹھے۔ اس کو اپنے ماحول میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پہلی قسم کی تحریک میں عوام اپنے جذبات سے ہم آہنگی پاکر اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ جب کہ دوسری قسم کی تحریکیں ان کے مانوس ذہنی ڈھانچہ کے خلاف ہوتی ہیں۔ اس سے ان کے مسلمات پر زد پڑتی ہے۔ اس لئے وہ اس کو قبول کرنے پر راضی نہیں ہوتے۔ ان کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی دعوت کو ہمارے مزاج کے موافق بناؤ۔ اور داعی جب ان کے مطالبہ کو پورا نہیں کرتا تو وہ اس کے سخت ترین دشمن بن کر ان کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہی دوسری صورت تھی جو مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آئی۔ آپ خالص توحید کے داعی تھے۔ مگر خالص توحید قریش کے لئے قابل قبول نہ ہو سکی۔ کیوں کہ اس سے ان کے بزرگوں پر زد پڑتی تھی۔ اس میں ان کو اپنی زندگی کا ڈھانچہ بدلنا پڑتا تھا۔ اس میں ان کو ایک ایسی چیز کی طرف اقدام کرنا تھا جس میں انھیں اپنی تمام مصلحتوں کو نظر انداز کر دینا پڑے۔ چنانچہ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کیا کہ آپ مصالحت کا انداز اختیار کریں۔ اپنی بات کو اس انداز سے پیش کریں کہ ہماری بات سے اس کا ٹکراؤ نہ ہو (ہود ۱۱۲، بنی اسرائیل ۷۳، یونس ۱۵)

ان حالات میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے بے آمیز حق کا داعی بننا مشکل ترین کام تھا۔ بشری تقاضے کے تحت یہ خیال آپ کے دل میں آسکتا تھا کہ مخاطب کے ساتھ کچھ مصلحت اور رعایت کا انداز اختیار کیا جائے۔ مگر خدا کا حکم تھا کہ ذرا بھی ان کی رعایت نہ کی جائے۔ صرف حق کی رعایت کی جائے اور خدا کے دین کو پوری طرح بے آمیز صورت میں پیش کیا جائے۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں یہ حدیث آئی ہے۔

قال ابوبکر سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما شیبک قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شیبتنی ھود و اخواتھا

حضرت ابوبکر نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کس چیز نے آپ کو بوڑھا کر دیا۔ آپ نے فرمایا: مجھ کو ہود اور اس کے مثل سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔

اسلوب بیان

غزوہ تبوک بڑے سخت حالات میں ہوا تھا۔ کچھ مسلمان اس میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ اس سلسلہ میں قرآن میں یہ آیت اتری :

ما کان لاھل المدینۃ ومن حولھم من الاعراب ان یتخلفوا عن رسول اللہ ولا یرغبوا بانفسھم عن نفسہ (التوبۃ)

مدینہ والوں اور اطراف میں رہنے والے دیہاتیوں کے لئے زیبا نہ تھا کہ وہ اللہ کے رسول کا ساتھ نہ دیں، اور نہ یہ کہ اپنی جان کو رسول کی جان سے عزیز سمجھیں۔

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے ایک مفسر قرآن لکھتے ہیں :

فھو ان کان فی ظاھرہ عاماً الا انہ خاص بمن کان قادراً علی حمل السلاح وصد طغیان العدو۔ ولیس لہ من العذر ما یمنعہ من الخروج

جہاد کے لئے نکلنے کا یہ حکم اگرچہ بظاہر عام ہے مگر حقیقۃً وہ اس شخص کے لئے خاص ہے جو ہتھیار اٹھانے پر قادر ہو اور دشمن کی سرکشی کو روک سکتا ہو۔ اس کے لئے کوئی ایسا عذر نہ ہو جو اس کو میدان جنگ کی طرف نکلنے سے روکے۔

اللہ تعالی کو معلوم تھا کہ وہ جو بات فرما رہا ہے وہ خاص معنی میں ہے نہ کہ عام معنی میں۔ یعنی اس سے صاحب استطاعت افراد مراد ہیں نہ کہ سارے ہی افراد۔ اس کے باوجود اللہ تعالی نے قانونی اور منطقی زبان اختیار نہیں فرمائی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قانونی اور منطقی زبان دعوتی مقصد کے لئے کار آمد نہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ "کون مجھے اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ وہ لوگوں سے سوال نہیں کرے گا اور میں اس کے لئے جنت کی ضمانت دیتا ہوں" بظاہر اس حدیث میں نہ ایمان کا ذکر ہے اور نہ عبادت کا۔ حالانکہ دونوں ضروری ہیں۔ مگر یہ کوئی کمی کی بات نہیں۔ کیوں کہ یہ دعوتی اور اصلاحی کلام ہے نہ کہ فقہی اور منطقی کلام۔

قانونی اور منطقی زبان میں اگرچہ قطعیت زیادہ ہوتی ہے۔ مگر یہ قطعیت اس قیمت پر حاصل کی جاتی ہے کہ دعوتی زور گھٹ جائے۔ داعی کا مقصد دلوں کو جھنجھوڑنا اور دماغوں کو متحرک کرنا ہے۔ اس لئے اس کے لئے دعوتی زبان ہی مفید ہے نہ کہ قانونی اور منطقی زبان۔

درست کلام

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اطراف عرب کے حکمرانوں کو دعوتی خطوط روانہ فرمائے تھے۔ یہ واقعہ ہجرت کے ساتویں سال پیش آیا۔ اس سلسلے میں حضرت دحیہ کلبی آپ کا مکتوب لے کر قیصر روم کی طرف گئے۔ قیصر روم اس وقت بیت المقدس میں تھا۔ اس نے جب آپ کا مکتوب پڑھا تو حکم دیا کہ عرب کے کچھ لوگ ہمارے ملک میں ہوں تو وہ یہاں حاضر کئے جائیں۔ اتفاق سے ابو سفیان اس زمانہ میں تجارت کی غرض سے اس اطراف میں گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ بلاکر دربار میں لائے گئے۔

قیصر روم نے رسول اللہ صلے اللہ کی شخصیت اور آپ کی تعلیمات کے بارہ میں بہت سے سوالات کئے جن کے جواب ابوسفیان نے دئے۔ یہ مفصل سوال وجواب سیرت کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک سوال یہ تھا کہ "جنھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے وہ عہد کی خلاف ورزی بھی کرتے ہیں"۔ اس کے جواب میں ابوسفیان نے کہا کہ نہیں۔ آج تک انھوں نے عہد کرکے نہیں توڑا۔ مگر آجکل ہمارے اور ان کے درمیان ایک مدت صلح ٹھہری ہے۔ نہیں معلوم کہ اس میں وہ کیا کرتے ہیں"

ابوسفیان کہتے ہیں کہ اس ایک بات کے سوا مجھے کوئی اور بات لگانے کا موقع نہیں ملا۔ مگر، ابن اسحاق کی روایت کے مطابق، خدا کی قسم قیصر نے میری اس بات کی طرف کوئی توجہ نہیں کی (فواللہ ما التفت الیھا منی (سیرت ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۴۹۷)

قیصر نے کیوں توجہ نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بات قابل توجہ نہیں تھی۔ ابوسفیان آپ کے ماضی اور حال کے بارہ میں کوئی بات نہ نکال سکے۔ البتہ انھوں نے مستقبل کے بارہ میں ایک بات کہہ دی۔ ظاہر ہے کہ مستقبل وہ چیز ہے جو ابھی پیش نہیں آیا۔

اگر آدمی کے پاس کوئی بڑی بات کہنے کے لئے نہیں ہے تو لازم ہے کہ وہ چھوٹی بات بھی نہ کہے۔ اگر کوئی حقیقی اعتراض نہیں ہے تو فرضی اعتراض بھی نہ نکالے۔ اگر وہ قطعی دلائل سے کچھ کہنے کو نہیں پاتا تو کمزور دلائل سے بھی کچھ کہنے سے پرہیز کرے۔ اگر وہ کسی کے حال میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں پاتا تو مستقبل کی بنیاد پر اس کو مطعون نہ کرے۔

جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ ایک شخص کو رد کرنے کے لئے ان کے پاس طاقت ور دلیل موجود نہ ہو اس کے باوجود وہ بے بنیاد شوشے نکال کر اس کو مطعون کریں وہ اس طرح صرف اپنے کمینہ پن کا ثبوت دیتے ہیں۔ حقیقت کی نگاہ میں ان کی کوئی قیمت نہیں۔

پچھلے انبیاء

عن عبد الله بن عباس رضی الله عنه قال قَدِمَ رسول الله صلی الله علیه وسلم المدینة فرأی الیهود تصوم عاشوراء۔ فقال لهم ماهٰذا الیوم الذی تصومونه۔ قالوا هذا یوم عظیم۔ انجی الله فیه موسٰی وقومه وغرق فیه عدوهم فصامه موسٰی شکراً فنحن نصومه فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم : فنحن احق واولٰی بموسٰی منکم فصامه رسول الله صلی الله علیه وسلم وامر بصیامه (بخاری، مسلم، ابوداؤد)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ مدینہ آئے۔ آپ نے یہود کو دیکھا کہ وہ عاشورار کے دن روزہ رکھتے ہیں۔ آپ نے ان سے کہا کہ یہ کیسا دن ہے جس میں تم لوگ روزہ رکھتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک بڑا دن ہے۔ اس دن اللہ نے موسٰی اور ان کی قوم کو نجات دی اور آپ کے دشمن (فرعون) کو پانی میں ڈبو دیا۔ اس کے بعد موسٰی نے اس دن شکر کے طور پر روزہ رکھا۔ پس ہم بھی اس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم تم سے زیادہ موسٰی کے حق دار ہیں اور قریب ہیں چنانچہ آپ نے اس دن روزہ رکھا اور دوسرے مسلمانوں کو بھی اس دن روزہ رکھنے کے لئے کہا۔

اس سے معلوم ہوا کہ پچھلے پیغمبروں کا ثابت شدہ عمل مسلمانوں کے لئے بھی اسی طرح قابل تقلید ہے۔ جس طرح وہ ان پیغمبروں کی اپنی امتوں کے لئے قابل تقلید تھا۔

حضرت موسٰی علیہ السلام جب مصر میں مبعوث ہوئے تو وہاں دو قسم کے گروہ پائے جاتے تھے۔ ایک فرعون کی قوم جو قبطی کہی جاتی تھی۔ دوسری بنی اسرائیل کی قوم جو گویا قدیم زمانہ کے مسلمان تھے۔ یہ دونوں گروہ ہدایت سے دور تھے۔ فرعون کی قوم اگر کفر و شرک میں مبتلا تھی تو بنی اسرائیل ہر قسم کے دینی بگاڑ کا شکار تھے۔ حضرت موسٰی بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے۔ آپ کو بنی اسرائیل کی اصلاح کرنا تھا۔ مگر بنی اسرائیل کی اصلاح کے انتظار میں آپ نے قوم فرعون پر دعوت حق کا کام موقوف نہیں کیا۔ آپ نے بیک وقت دونوں کام شروع کئے۔ گویا یہ طریقہ غیر پیغمبرانہ طریقہ ہے کہ مسلمانوں کے بگاڑ کو عذر بنا کر غیر مسلموں میں دعوت کا کام نہ کیا جائے۔

ہماں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا ایں جا است

قرآن کو خالی الذہن ہو کر پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی دعوت کا اصل نکتہ آخرت ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو بے شمار اسلامی تحریکیں اٹھیں، ان میں سے کسی تحریک نے بھی "انذار آخرت" کو اپنی دعوت کا بنیادی نکتہ نہیں بنایا۔ روایتی طور پر بلاشبہ ہر تحریک میں آخرت کا لفظ شامل رہا۔ مگر ایسا کسی تحریک میں نظر نہیں آتا کہ اس نے آخرت کے انتباہ کو اپنا نصب العین قرار دیا ہو اور یہی فکر اس کی تمام سرگرمیوں پر چھایا ہوا ہو۔ ۱۹۶۰ میں ایک بڑی اسلامی جماعت کا سالانہ اجتماع ہوا۔ اس موقع پر جماعت کے ذمہ دار اعلیٰ نے جو صدارتی تقریر کی، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے راقم الحروف نے لکھا تھا:

ایک جلسۂ عام کے موقع پر اسلامی تحریک کا تعارف کرنے کے لئے آپ خطبہ صدارت تیار کرتے ہیں جس میں شروع میں بتایا جاتا ہے کہ دعوت اسلامی کے تین نکات ہیں ——— خدا، آخرت، رسالت۔ مگر اس کے بعد "دنیا میں جو کچھ بگاڑ پایا جاتا ہے اس کا حقیقی سبب ان بنیادی باتوں سے انحراف ہے" کے فقرہ سے جو گریز شروع ہوتا ہے تو چالیس صفحات کا کا پورا خطبہ مسائل ملکی کی نذر ہو جاتا ہے اور کہیں بھی یہ بتانے کی نوبت نہیں آتی کہ مرنے کے بعد بھی تمہارا کوئی مسئلہ ہے جس سے تمھیں ڈرنا چاہئے۔ البتہ تقریر ختم ہونے لگتی ہے تو پھر روایتی ذہن مجبور کرتا ہے کہ اس قسم کا ایک فقرہ رکھ دیا جائے ——— "مومن کا اول و آخر مقصد رضائے الٰہی اور فوز آخرت ہے"۔ آپ کے اس طویل لفظی مجموعہ پر بے شک میں کوئی منطقی اعتراض نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ اس میں دنیا اور آخرت کی تمام کامیابیوں کو اسلام کی فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔ مگر پوری تقریر پڑھ کر ہر آدمی سمجھ سکتا ہے کہ داعی کس بات سے لوگوں کو ڈرانا چاہتا ہے اور اس کے اوپر کیا چیز سوار ہے۔ ملک کے لسانی جھگڑے اور معاشی قضیئے اس کو نظر آتے ہیں۔ یا وہ دیکھ رہا ہے کہ اسرافیل صور لئے کھڑے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ کس وقت حکم ہو اور پھونک مار کر دنیا کو تہ و بالا کر دیں۔ (تعبیر کی غلطی، مطبوعہ ۱۹۶۳، صفحہ ۴۲۰)

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اسلامی تحریکوں کی کثرت کے باوجود وہ افراد نہیں پیدا ہو رہے ہیں جو اسلام کا اصل مقصود ہیں۔ آج اسلام کے جھنڈے ہر طرف لہرا رہے ہیں، لاؤڈ اسپیکر پر اسلامی الفاظ کا غلغلہ بلند ہے۔ اسلام کے نام پر سارے عالم میں آمد و رفت کا طوفان جاری ہے اسلامی جلسوں اور اسلامی کانفرنسوں کے شور سے زمین کی فضائیں معمور ہو رہی ہیں۔ پھر بھی مسلمان مغلوب ہیں۔ اس کے باوجود اسلام کا احیاء نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ کیا ہے۔

اس کی وجہ صرف ایک ہے، اسلام کا غلبہ اسلام کے الفاظ بولنے سے نہیں ہوتا بلکہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ اللہ سے ڈرنے والے لوگ پیدا ہو جائیں۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کا تمام ہنگاموں کے باوجود کہیں پتہ نہیں۔ خدا کی بھری ہوئی زمین میں وہ انسان کہیں دکھائی نہیں دیتا جو خدا کے خوف سے کانپتا ہو، خدا کے تصور سے جس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوں جس نے خدا کی بڑائی کے مقابلہ میں اپنے کو پست کر رکھا ہو۔ قیامت کے اندیشہ نے جس کی نیند اڑا رکھی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے لوگ ظاہری زندگی کی سطح پر جی رہے ہیں۔ آخرت کی سطح پر جینے والے اتنے نایاب ہیں کہ شاید اب ان کا کہیں وجود ہی نہیں۔ مکان کے چرچے ہوں مگر اینٹ موجود نہ ہو تو مکان کس طرح بن جائے گا (۱۰ مارچ ۱۹۷۹)

اعتراف کی اہمیت

باکسنگ کے چیمپین محمد علی اپنے کو "سب سے بڑا" کہتے رہے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ اس موقع پر ۲۵ جنوری ۱۹۸۰ کو نئی دہلی کی پریس کانفرنس میں ان سے پوچھا گیا کہ آپ اپنے کو سب سے بڑا کیوں کہتے ہیں۔ محمد علی نے نرم اور متواضع لہجہ میں جواب دیا: میں سب سے بڑا نہیں، سب سے بڑا تو صرف خدا ہے (Only God is the greatest)
انھوں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس قسم کی بات میں صرف پبلسٹی مہم کے ذیل میں کہتا رہا ہوں تاکہ مقابلہ کے وقت میرا کھیل دیکھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ آدمی جمع ہوں۔ سفید فام امریکہ میں ایک کالا آدمی اس قسم کا بھڑکانے والا بیان (Provocatvie Statement) دے تو وہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مائل کرنے میں بہت کامیاب ہوتا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۲۶ جنوری ۱۹۸۰)

آدمی اکثر ایسا کرتا ہے کہ وقتی مصلحت کی خاطر وہ کسی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ تاہم ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ آدمی اپنی اس نفسیات سے باخبر ہو۔ اور اس سے بھی کم ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بعد کو اس کا اعتراف کرے۔ محمد علی اگر اس بات کا اعلان نہ کرتے تو ہو سکتا ہے کہ ان کے معتقدین بعد کو یہ سمجھنے لگتے کہ محمد علی فی الواقع کوئی فوق البشر تھے یا ان کے اندر خدا حلول کر آیا تھا۔ مگر اپنی زبان سے کھلا ہوا اعلان کر کے انھوں نے ہمیشہ کے لئے اپنے معتقدین کو اس فتنہ سے بچا لیا۔ اسی سے ملتی جلتی صورت موجودہ زمانہ میں مسلم قائدین کے یہاں بھی پیش آئی ہے۔ مگر ہمارے قائدین میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے اس صاف گوئی کی مثال پیش کی ہو۔

مثلاً موجودہ زمانہ میں کچھ لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اسلام کو سیاسی نظام کی حیثیت سے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ دین کے معنی وہی ہیں جو اسٹیٹ کے ہیں اور خدا کے پیغمبر جو دنیا میں آئے اسی لئے آئے کہ خدائی قانون کی بنیاد پر ایک مکمل اسٹیٹ قائم کر دیں، یہ بات ایسی ہے جس کے لئے قرآن و سنت میں کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔ تاہم ایک خاص وقت میں مسلمانوں کو ابھارنے کے لئے وہ بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ اس سے ان کے اندر انقلاب کا مزاج پیدا ہوا۔ وہ مدافعانہ نقطۂ نظر سے سوچنے کے بجائے اقدامی نقطۂ نظر سے سوچنے لگے۔ جو لوگ اس فکر سے متاثر ہوئے وہ اگرچہ سیاسی ذوق کے تحت اسلام کی طرف مائل ہوئے تاہم کچھ اندرونی فطرت کا زور اور کچھ اسلامی روایات کے اثر سے ان میں اسلام کے دوسرے اوصاف بھی کسی نہ کسی درجہ میں پیدا ہو گئے۔ مگر اسلام کی یہ تشریح مطلق طور پر درست نہ تھی۔ محفوظ ترین بات جو اس کے بارے میں کہی جا سکتی ہے وہ کہ یہ وقتی حالات کے تحت اسلام کے بعض پہلوؤں کو شدت کے ساتھ بیان کرنا تھا۔ اس نظریہ کو پیش کرنے والے لوگ اگر بعد کو اس طرح کا اعلان کر دیتے تو اس سے کوئی خاص خرابی پیدا نہ ہوتی۔ مگر انھوں نے اس قسم کا اعلان نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے معتقدین نہ صرف یہ کہ اس کو مطلق تشریح دین سمجھ بیٹھے بلکہ اس کے بعد دوسری دوسری خرابیاں ان میں پیدا ہونا شروع ہو گئیں۔ مثلاً اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان سیاسی طریقوں کو جائز سمجھ لینا جن کی کوئی گنجائش اسلام میں نہیں ہے۔ جب اسلام کا تصور ایک سیاسی نظام کا تصور ہو تو اس کو بروئے کار لانے کے لئے سیاسی طریقے اختیار کرنا کیوں ناجائز قرار پائے۔

دعوت حق کے مقابلہ میں مختلف ردعمل

دعوتِ حق کے مقابلہ میں مختلف انسانوں کی طرف سے جو ردعمل سامنے آتا ہے، اس کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ایک وہ لوگ جن کی فطرت زندہ ہوتی ہے۔ سچائی کو قبول کرنے کے لئے جن کے سینے کھلے ہوتے ہیں۔ تعصب، کج فہمی، مصلحت پرستی کا کوئی پردہ ان کے دل و دماغ کو گھیرے ہوئے نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کے سامنے جب سچائی آتی ہے تو وہ ان کو بالکل اپنے دل کی بات نظر آنے لگتی ہے۔ وہ بے اختیار اس کی طرف کھنچ اٹھتے ہیں۔ ان کی طرف سے فی الفور سچائی کی آواز کو مثبت جواب دیا جاتا ہے۔ وہ اتنی جلد اس کی حقیقت کو پالیتے ہیں اور اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں جیسے وہ پہلے ہی سے اس کے انتظار میں تھے:

یکاد زیتھا یضیئ ولولم تمسسہ نار (نور) قریب ہے کہ اس کا تیل روشن ہوجائے اگرچہ اس میں آگ نہ لگی ہو

دوسرے لوگ وہ ہیں جن کی نفسیاتی پیچیدگیاں ان کو ابتدائی مرحلہ میں حق کو سمجھنے نہیں دیتیں۔ وہ اس کو "حق کا مسئلہ" نہیں سمجھتے۔ اپنی ضد اور ٹیڑھ کی وجہ سے حق کی آواز ان کو عجیب عجیب روپ میں دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس کے مخالف بن کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کو کچل دینا چاہتے ہیں۔ تاہم وہ وقت آتا ہے جب کہ ان کی فطرت ان کی ضد پر غالب آتی ہے۔ سچائی کے خلاف اپنے دلائل کا بے وزن ہونا ان پر کھل جاتا ہے۔ ان کی اندرونی آواز بول پڑتی ہے کہ وہ سراسر غلطی پر تھے، اور بات وہی صحیح ہے جو حق کے داعی کی طرف سے کہی جارہی تھی۔ اس وقت وہ تحفظ ذہنی اور مصلحت پرستی کے تمام لبادے اتار کر سچائی کا اعتراف کرلیتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں کہ یہ حق ہے:

قالت امرأت العزیز الآن حصحص الحق (یوسف) وزیر مصر کی عورت نے کہا: اب کھل گئی سچی بات

تیسرا گروہ وہ ہے جو سچائی کی آواز پر اندھے بہرے کی طرح ٹوٹ پڑتا ہے۔ اس کا مصلحت پرستانہ ذہن، اس کی متعصبانہ نفسیات اور اس کی بڑھی ہوئی انانیت اس کے مزاج کو اتنا زیادہ بگاڑ دیتے ہیں کہ حق بات اپنی سیدھی اور صاف شکل میں اس کے ذہن کے خانہ میں نہیں بیٹھتی۔ وہ ہر بات کا الٹا مطلب نکالتا ہے۔ اور ہر دلیل کو رد کرنے کے لئے کچھ دل فریب الفاظ تلاش کرلیتا ہے۔ اس کا یہ مزاج اتنا پختہ ہوچکا ہوتا ہے کہ ابتداءً اگر وہ غلط فہمی کی وجہ سے حق کی طرف نہ بڑھا ہو تو بعد کو اس کی نوعیت واضح ہوجانے پر بھی اس کو قبولیت کی توفیق نہیں ہوتی۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سوال اس کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے کہ اگر میں نے اعتراف کرلیا تو میرا وقار باقی نہیں رہے گا:

واذا قیل لہ اتق اللّٰہ اخذتہ العزۃ بالاثم (بقرہ) اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر تو اس کا غرور اس کو گناہ پر آمادہ کردیتا ہے۔

اللہ کے یہاں سب سے افضل وہ لوگ ہیں جو حق کے اعلان کو سنتے ہی اس کی طرف دوڑ پڑیں۔ اسی طرح وہ لوگ بھی اللہ کی رحمت میں حصہ دار ہوں گے جو ابتدائی رکاوٹ کے بعد اس کی آواز کو پہچان لیں اور اس کے آگے جھک جائیں۔ باقی وہ جو اپنی برتری کی خاطر حق کی پکار کو نہ مانیں وہ اللہ کے نزدیک جانور ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ بدتر۔

مصلحین کو برداشت نہ کرنا

یہود کے اندر جب بگاڑ آیا تو ان کے درمیان خدا نے دینی مصلحین اٹھائے جو ان کی غلطیوں پر ٹوکتے تھے اور ان کو صحیح راستہ دکھاتے تھے۔ مگر یہود نے ان مصلحین کو رد کر دیا۔ انھوں نے ان کو ہر قسم کی تکلیفیں پہنچائیں۔ حتی کہ انھیں قتل کر ڈالا۔ قرآن میں یہود کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ـــــ جو لوگ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے ہیں اور پیغمبروں کو ناحق ہلاک کرتے ہیں اور ان لوگوں کو ہلاک کرتے ہیں جو انھیں انصاف کا حکم دیتے ہیں، تم انھیں دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا (آل عمران ۲۲-۲۱)

یہود کی تاریخ بتاتی ہے کہ انھوں نے یسعیاہ نبی کا قتل کیا۔ یرمیاہ نبی کا قتل کیا۔ زکریا نبی کا قتل کیا۔ یحییٰ نبی کا قتل کیا۔ عیسیٰ مسیح کو بھی (اپنے خیال کی حد تک) قتل کر ڈالا۔ ایک حدیث ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے ان الفاظ میں نقل کی ہے:

عن ابی عبیدۃ بن الجراح قال قلت: یا رسول اللہ ای الناس اشد عذابا یوم القیامۃ۔ قال رجل قتل نبیا او من امر بالمعروف ونھی عن المنکر۔ ثم قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا ابا عبیدۃ قتلت بنو اسرائیل ثلاثۃ واربعین نبیا من اول النہار فی ساعۃ واحدۃ۔ فقام مائۃ وسبعون رجلا من بنی اسرائیل فامروا من قتلھم بالمعروف ونھوھم عن المنکر فقتلوھم جمیعا من آخر النہار من ذلک الیوم (تفسیر ابن کثیر)

ابو عبیدہ بن جراح کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، قیامت میں سب سے زیادہ سخت عذاب کس کو ہوگا۔ آپ نے فرمایا وہ شخص جس نے نبی کو قتل کیا یا اس کو جو بھلائی کا حکم دیتا تھا اور برائی سے روکتا تھا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابو عبیدہ یہود نے ایک صبح کو ایک وقت میں ۴۳ نبیوں کو قتل کیا۔ اس کے بعد ایک سو ستر آدمی بنی اسرائیل کے اٹھے اور انھوں نے قتل کرنے والوں کو بھلائی کا حکم دیا اور برائی سے روکنا شروع کیا تو انھوں نے ان سب کو اسی دن شام تک قتل کر ڈالا

جو لوگ اصلاح کا مقصد لے کر اٹھتے ہیں ان کو قوم کے بگاڑ پر تنقید کرنی ہوتی ہے۔ یہ تنقید لوگوں کے لئے بے حد ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس سے ان کی فخر اور گھمنڈ کی نفسیات کو چوٹ لگتی ہے، وہ ایسے مصلحین کے درپے ہو جاتے ہیں۔ وہ ان کو بدنام کرتے ہیں۔ ان کی معاشیات کو اجاڑتے ہیں۔ اس قسم کی کارروائیوں کے بعد بھی جب ان کی زبان بند نہیں ہوتی تو وہ ان کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔

کیسا عجیب اسلام

ایران میں " اسلامی انقلاب " کے بعد جو نئے مناظر دکھائی دیتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایران کی قومی اسمبلی اور دوسرے پبلک مقامات پر جو سیڑھیاں ہیں ان پر مختلف قسم کے جھنڈوں کی تصویریں بنائی گئی ہیں۔ یہ جھنڈے امریکہ، روس اور اسرائیل کے ہیں۔ ایسا اس لئے کیا گیا ہے کہ جب کوئی آدمی ان عمارتوں میں داخل ہو تو وہ ان پر پاؤں رکھے بغیر داخل نہ ہو سکے۔
(کوثر، بنگلور، رمضان ۱۴۰۴ھ)

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کون سا دین ہے جس کو موجودہ زمانہ کے علمبرداران اسلام نے دریافت کیا ہے۔ وہ نفرت کا دین ہے۔ ان کے نزدیک اسلام کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ مفروضہ دشمنان اسلام کو ذلیل کیا جائے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا اسلام یہ تھا کہ انھوں نے لوگوں کی خیر خواہی میں ان کے لئے دعائیں کیں۔ وہ اس لئے تڑپے کہ لوگ ہدایت کو قبول کر کے جہنم کی آگ سے بچ سکیں۔ انھوں نے اپنے دشمنوں سے بھی محبت کا سلوک کیا تاکہ ان کا دل اسلام کے لئے نرم ہو۔ انھوں نے ظالموں کو بھی بے عزت کرنا پسند نہیں کیا تاکہ ان کے اندر حمیۃ جاہلیۃ کی آگ نہ بھڑکے۔ انھوں نے بگڑے ہوئے لوگوں کے ساتھ تالیف قلب کا معاملہ کیا تاکہ ان کی فطرت کو جگایا جاسکے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین نے ایک ایسا اسلام دریافت کر رکھا ہے جو انھیں اس کے بالکل برعکس سبق دیتا ہے۔

آج کی دنیا میں اسلام کے نام پر دوسروں سے نفرت کرنے والے بہت ہیں مگر اسلام کے نام پر دوسروں سے محبت کرنے والا کوئی نہیں۔ اسلام کے لئے جھنڈا اٹھانے والے بے شمار ہیں مگر کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں جو اسلام کے لئے اپنے جھنڈے کو نیچا کرلے۔ اسلام کے لئے دوسروں سے لڑنے والے ہر طرف دکھائی دیتے ہیں مگر اسلام کے لئے صلح کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ اسلام کے لئے بولنے والوں سے خدا کی زمین بھر گئی ہے مگر وہ انسان ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا جو اسلام کی خاطر چپ ہو گیا ہو۔

اسلام کے نام پر لوگوں کو پیروں سے روندنے والے بہت ہیں مگر خدا کا وہ بندہ کہیں دکھائی نہیں دیتا جو اسلام کی خاطر لوگوں کو اپنے سینہ سے لگالے۔

نفرت نہیں محبت

کرکٹ کے کھیل میں سب سے زیادہ کامیاب باؤلر وہ سمجھا جاتا ہے جو سب سے زیادہ تیز گیند پھینکے۔ ڈینس لیلی (Dennis Lillee) کرکٹ کا مشہور کھلاڑی ہے۔ اس کی باؤلنگ کی رفتار ۱۴۰ کیلومیٹر فی گھنٹہ سے زیادہ ہے۔ ڈینس لیلی (پیدائش ۱۹۴۹) سے پوچھا گیا کہ تیز باؤلنگ کا راز کیا ہے۔ اس نے جواب دیا: تیز گیند پھینکنے کی حیرت ناک کوشش کو برقرار رکھنے کے لئے آپ کو عملی طور پر بیٹ والے سے نفرت کرنا ہوگا۔ میں بیٹ والوں کو چور سمجھتا ہوں جو میرے رن کو چرانے کی کوشش کر رہے ہوں:

> To keep up the tremendous effort of fast bowling, you've practically got to hate the batsman. I think of batsman as thieves, trying to steal runs from me.
>
> *Reader's Digest*, June 1981, p. 48

کھیل کے میدان کا یہی اصول سیاست کے میدان میں بھی رائج ہے۔ ہر سیاسی لیڈر، شعوری یا غیر شعوری طور پر، یہ جانتا ہے کہ سیاست کو کامیاب بنانے کا سب سے بڑا ذریعہ نفرت ہے۔ وہ اپنے پیروؤں میں جتنا زیادہ نفرت کا جذبہ پیدا کرے گا اتنا ہی زیادہ وہ سرگرمی دکھا سکیں گے اور قربانیاں دیں گے۔ اس دنیا میں وہی لیڈر کامیاب ہوتا ہے جو اپنی سیاست کے لئے کوئی ایسا بدنام نشانہ تلاش کرے جس کے نام پر لوگوں کے اندر زیادہ سے زیادہ نفرت کی آگ بھڑکائی جا سکتی ہو۔ موجودہ زمانہ کی تمام بڑی بڑی سیاسی تحریکیں کسی نہ کسی قابل نفرت نشانہ کے اوپر کھڑی ہوئی ہیں، کسی کا نشانہ کوئی قوم ہے، کسی کا کوئی بادشاہ اور کسی کا کوئی حکمراں۔

مگر نفرت کی بنیاد پر اٹھنے والی تحریک خدا کی نظر میں سراسر باطل ہے، خواہ وہ بظاہر مکمل اسلام ہی کے نام پر کیوں نہ اٹھی ہو۔ مخصوص اسباب کی بنا پر موجودہ زمانہ میں دنیا بھر کے مسلمان احساس مظلومی (Persecution Complex) میں مبتلا ہیں۔ اس لئے ان کے درمیان جب کوئی ایسی تحریک اٹھتی ہے جو کسی مسلم دشمن طاقت کی نشان دہی کر کے اس کو مٹانے کا نعرہ دے رہی ہو تو مسلمان بہت جلد اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اور اگر یہ تحریک اسلام کی اصطلاحوں میں بول رہی ہو تو مسلمان اور بھی زیادہ جوش جہاد کے ساتھ اس کی طرف بڑھتے ہیں کیوں کہ ایسی صورت میں ان کو یہ اطمینان رہتا ہے کہ ان کی نفرت کی سیاست عین اسلام کی سیاست ہے نہ کہ کوئی غیر اسلامی سیاست۔ مگر یہ سراسر بھول ہے۔ اسلام کی سیاست صرف وہ ہے جو محبت اور خیر خواہی کی بنیاد پر اٹھے۔ جس کی دشمنی "کفر" سے ہو نہ کہ "کافر" سے۔ جو "شرک" کے خلاف برپا ہوئی ہو نہ کہ "مشرک" ۔

ایک تبصرہ

مسٹر دلیپ ہیرو مسلم دنیا کے معاملات کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی ایک کتاب ۱۹۸۸ میں لندن سے چھپی ہے، اس کا نام اسلامی بنیاد پرستی ہے:

Dilip Hiro, *Islamic Fundamentalism*

اس کتاب میں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے اسلامی بنیاد پرستوں کو شکست اور اس سے بھی زیادہ بری چیز ذلت، دونوں سے سخت طور پر دوچار ہونا پڑا۔ ان کا معاملہ صرف اتنا نہیں ہے کہ وہ اپنے پیغمبر محمد کی طرف لوٹ رہے ہیں اور اپنے مذہب کی بنیادی تعلیمات کو متعین کر کے اس کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی موجودہ سرگرمی شدید طور پر مغرب کے خلاف ردعمل اور ہر اس چیز سے نفرت کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے جس کا تعلق مغرب سے ہو:

Having experienced both defeat and, worse, contempt, the Islamic fundamentalists of today seek to do more than just follow their ancestor Muhammad and define the fundamentals of a religious system and adhere to them. Their drive today is explosively fuelled by a reactionary hatred of all that is Western.

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان اٹھنے والی وہ تحریکیں جن کو مغربی پریس اسلامی فنڈمنٹلزم کہتا ہے، اور خود مسلمان جس کو صحوۃ اسلامیہ (اسلامی بیداری) کہنا پسند کرتے ہیں، ان کی اصل حقیقت یہی ہے کہ وہ ردعمل اور نفرت کے طور پر اٹھی ہیں۔ وہ قومی تحریکیں ہیں نہ کہ اسلامی تحریکیں۔ اسلامی تحریک محبتِ اقوام کی زمین پر ابھرتی ہے۔ جب کہ یہ تحریکیں نفرتِ اقوام کی زمین پر ابھری ہیں۔ آپ ان تحریکوں کا کوئی پرچہ پڑھیں، یا ان کے کسی اجتماع میں شریک ہوں۔ آپ کو ان میں دوسروں کے لیے خیر خواہی اور شفقت کی خوشبو نہیں ملے گی۔ اس کے برعکس آپ پائیں گے کہ وہ شکایت اور احتجاج جیسی باتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہی واقعہ مذکورہ بیان کی تصدیق کے لیے کافی ہے۔ بظاہر یہ تبصرہ بہت تلخ ہے، لیکن اگر خالی الذہن ہو کر دیکھا جائے تو وہ عین درست نظر آئے گا۔

یہ بھیڑ

پروفیسر ہنری جیکسن (Henry F. Jackson) کا ایک مضمون امریکی جرنل خارجہ پالیسی (Foreign Policy) میں چھپا ہے۔ پروفیسر جیکسن نے مصر کے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ مصر میں قابل زراعت زمین تقریباً چھ ملین ایکڑ ہے۔ اس میں سے تقریباً ساٹھ ہزار ایکڑ زمین اینٹ بنانے اور پکانے والوں کے مصرف میں آکر زراعت کے لئے بے کار ہو گئی ہے۔ اسوان ڈیم کے ناکارہ ہو جانے کی وجہ سے زمین کا کٹاؤ بہت بڑھ گیا ہے۔ اس قسم کی مختلف چیزوں کے نتیجہ میں ملک میں تقریباً ۲۵ فی صد قابل کار آدمی بے کار ہو گئے ہیں۔ امریکہ نے مصر کو اربوں ڈالر بطور امداد دئے ہیں مگر یہ امداد عملاً پانچ فی صد اوپر کے طبقات (فوج، بینکر، تاجر، ٹھیکہ دار، عہدہ دار) کے حصہ میں چلی گئی ہے۔ کسان گھرانے کے لوگ مقامی طور پر ذرائع معاش نہ پاکر بڑی تعداد میں شہروں میں منتقل ہو رہے ہیں۔ وغیرہ

اس جائزہ کے بعد پروفیسر جیکسن لکھتے ہیں: ایسی حالت میں تعجب کیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسلامی احیاء میں پناہ تلاش کر رہے ہیں، یہ ان کے لئے حکومت کی ناکام اقتصادی پالیسیوں کے خلاف احتجاج کی ایک صورت ہے:

> Is it any wonder then that more people are seeking escape in Islamic revivalism as a form of protest against the government's unsuccessful economic policies?
>
> *The Times of India*, September 8, 1981

ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ وقت کے حکمراں کے بارہ میں مختلف وجوہ سے لوگوں کے اندر ناراضی اور عدم اطمینان موجود رہتا ہے۔ ایسی حالت میں جب حکمراں کو ہٹانے کے نام پر کوئی تحریک اٹھتی ہے تو اس قسم کے تمام ناراض عناصر اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام تر ایک مصنوعی پھیلاؤ ہوتا ہے۔ یہ اجتماع "بغض معاویہ" کے جذبہ کے تحت ہوتا ہے نہ کہ "حب علی" کے جذبہ کے تحت۔ مگر تحریک کے قائدین خوش فہمی میں سمجھ لیتے ہیں کہ یہ سارے لوگ اسلام کے لئے سرشار ہیں، وہ خالص اسلام کو قائم کرنے کی خاطر اپنے گھروں سے نکل پڑے ہیں۔ خوش خیالی کا یہ گھروندا اس وقت بکھر جاتا ہے جب کہ "اسلام دشمن" حکمراں کو ہٹانے کی تحریک کامیاب ہو جائے۔ اسلام دشمن حکمراں کے ہٹتے ہی اسلام دوست حضرات آپس میں لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ ان کو جس چیز نے اکھٹا کیا تھا وہ صرف ایک منفی نشانہ تھا اور اسلام دشمن حکمراں کے ہٹنے کے بعد وہ نشانہ باقی نہ رہا۔

اسلام برائے فخر

" اسلام" ذمہ داری کا عنوان ہے نہ کہ فخر کا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان اسلام کا زبردست چرچا ہے مگر اسلام کی برکتیں ان میں ظاہر نہیں ہو رہی ہیں۔ اس کی واحد سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ اسلام سے وہ فخر کی غذا لے رہے ہیں۔ وہ اس کو اپنے لئے ذمہ داری کا عنوان نہ بنا سکے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان جن لوگوں کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، وہ وہی اشخاص تھے جنھوں نے مسلمانوں کے لئے ان کی پر فخر نفسیات کی تسکین کا سامان فراہم کیا۔ شاعروں میں علامہ اقبال اس سلسلے میں سب سے چوٹی کے مقام پر ہیں۔

نثر کی دنیا میں جن لوگوں کا نام لیا جا سکتا ہے، ان میں سے ایک علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ علامہ شبلی نے اسلام کی بڑی بڑی شخصیتوں پر کتابیں لکھیں۔ مگر اس سلسلۂ تصانیف کے لئے انھیں جو موزوں ترین عنوان ملا وہ تھا ـــــــ " ناموران اسلام"

" الفاروق" علامہ شبلی نعمانی کی مشہور کتاب ہے۔ اس کتاب میں حضرت عمر فاروق کے بہت سے کارناموں کے ساتھ مصنف نے یہ بتایا ہے کہ انھوں نے " صیغۂ جنگ کو جو وسعت دی تھی اس کے لئے کسی قوم اور کسی ملک کی تخصیص نہ تھی۔ یہاں تک کہ مذہب وملت کی بھی کچھ قید نہ تھی۔ والنٹیر فوج میں تو ہزاروں مجوسی شامل تھے جن کو مسلمانوں کے برابر مشاہرے ملتے تھے" اس طرح غیر قوموں کے افراد کی فوجی نظام میں شرکت کی بہت سی مثالیں دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> " لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ صیغۂ جنگ کی یہ وسعت جس میں تمام قوموں کو داخل کر لیا گیا تھا صرف اسلام کی ایک فیاضی تھی، ورنہ فتوحات ملکی کے لئے عرب کو اپنی تلوار کے سوا اور کسی کا ممنون ہونا نہیں پڑا (حصہ دوم، صفحہ ۹۹)

یہ فقرہ سراسر فخر کے جذبہ سے نکلا ہوا فقرہ ہے۔ اس کا اسلامی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کو پڑھ کر ایک مسلمان خوش ہو سکتا ہے۔ مگر غیر مسلم جب اس کو پڑھے گا تو اسلام کے اس " قومی تصور" سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔

اس قسم کی تمام چیزیں دراصل اس غلطی کی قیمت ہیں کہ ہم نے غیر مسلموں کو صرف حریف کی نظر سے دیکھا۔ ہم ان کو اپنا مدعو نہ بنا سکے۔

غلط تعارف

قرآن کی تعلیمات پر ہمارے ادارہ کی ایک انگریزی کتاب دارالسلطنت کے ایک انگریزی پریس میں چھپ رہی تھی۔ ہمارا آدمی ایک بار پریس گیا تو اس کے غیر مسلم مشین مین نے پوچھا: یہ کیسی کتاب ہے۔ آدمی نے بتایا کہ یہ قرآنی تعلیمات کے بارہ میں ہے۔ مشین مین نے دوبارہ کہا: پھر تو یہ مارکاٹ سکھانے والی کتاب ہوگی۔ کیوں کہ تمھارے قرآن میں یہی سب چیزیں لکھی ہوئی ہیں۔

ایک مسلمان بزرگ نے اس واقعہ کو سنا تو فرمایا کہ یہ مس انڈرسٹینڈنگ ہے۔ میں نے کہا کہ یہ مس انڈرسٹینڈنگ نہیں بلکہ پراپرانڈرسٹینڈنگ ہے۔ قرآن بلاشبہ مارکاٹ کی کتاب نہیں مگر ہم نے اپنے قول وعمل سے دنیا کے سامنے جس اسلام کا تعارف کرایا ہے وہ یہی ہے۔ اگر ایک غیر مسلم اسلام کے بارہ میں کتاب لکھے اور اس کا نام خنجر اسلام (Dagger of Islam) رکھ دے تو مسلمان فوراً بگڑ جاتے ہیں۔ مگر خود ان کے مشہور ترین اسلامی مفکر کا حال یہ ہے کہ وہ فخر کے ساتھ کہتا ہے:

تیغوں کے سایہ میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں   خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

ایسی حالت میں دوسرے لوگ کیا کریں۔ کیا وہ آپ کے الفاظ کو بدل کر اس طرح لکھ لیں:

پھولوں کے سایہ میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں   پھولوں کا گلستاں ہے قومی نشاں ہمارا

مسلمانوں میں جب بگاڑ آتا ہے تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ ان کے اندر احساس فخر باقی رہتا ہے اور احساس ذمہ داری ان سے نکل جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ انھیں حق ہے کہ وہ جو چاہیں کریں۔ مگر دوسروں کو ان پر تنقید کرنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ ہر خوبی کا مستحق اپنے کو سمجھ لیتے ہیں اور ہر خرابی کا مستحق دوسروں کو۔

موجودہ زمانہ میں ایران اور پاکستان اپنے کو اسلام کا سب سے بڑا علم بردار بتاتے ہیں۔ ہمارے قائدین میں ایسے لوگ موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ "پاکستان اسلام کا قلعہ ہے" اور "ایران کا انقلاب خالص اسلامی انقلاب ہے" مگر ان ملکوں میں اسلام کا جو سب سے بڑا عملی نمونہ دکھایا گیا ہے وہ یہی ہے کہ لوگوں کو مارو، انھیں کوڑے لگاؤ، ان سے ان کی آزادیاں چھین لو۔ مفروضہ دشمنوں کے خلاف لامتناہی جنگ جاری رکھو۔ پھر دوسرے لوگوں سے آپ کیا امید رکھتے ہیں۔ کیا وہ ایسا کریں کہ اسلامی ملکوں سے آنے والی خبروں کو جب وہ پڑھیں تو اپنے ذہن میں اس کے معنی بدل لیا کریں۔ وہ گولی کو پھول کے معنی میں لے لیں اور کوڑے کو مصافحہ کرنے کے معنی میں۔

دوسرا قرآن

ایک مسلمان نے اپنے ایک غیر مسلم دوست کو قرآن کا ترجمہ پڑھنے کے لئے دیا۔ غیر مسلم نے بڑے شوق اور احترام کے ساتھ قرآن کو لیا اور اس کو شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ اگلی ملاقات میں اس نے قرآن کا مذکورہ نسخہ واپس کرتے ہوئے کہا:

"اب دوسرا قرآن دیجئے"

مسلمان نے سمجھا کہ وہ قرآن کا دوسرا نسخہ مانگ رہے ہیں۔ چنانچہ وہ دوسرا نسخہ لائے اور اس کو مذکورہ غیر مسلم کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ غیر مسلم نے اس کو لے کر کچھ دیر الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر کہا "یہ تو وہی قرآن ہے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اب وہ قرآن دیجئے جس پر آپ لوگ عمل کرتے ہیں"۔

غیر مسلم نے قرآن میں جو اسلام پڑھا وہ اس سے مختلف تھا جو اس نے مسلمانوں کی اپنی زندگی میں دیکھا تھا۔ غیر مسلم نے سمجھا کہ مسلمانوں کے یہاں شاید دو قرآن ہے۔ ایک وہ جس کو اس نے ابھی پڑھا ہے، دوسرا وہ جو ابھی اس کو پڑھنے کو نہیں ملا۔

بظاہر یہ ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر امر واقعہ یہی ہے کہ مسلمانوں کا دو قرآن ہے۔ ایک وہ جو خدا کی طرف سے چودہ سو سال پہلے اترا تھا۔ دوسرا وہ جو انھوں نے خود لکھ رکھا ہے۔ اس دوسرے قرآن کا نام قرآن نہیں۔ اس کا نام قرآن کی تشریح و تعبیر ہے۔ مسلمانوں نے اپنی تشریح و تعبیر سے قرآن کے متوازی ایک اور قرآن لکھ رکھا ہے۔ اس دوسرے قرآن میں وہ سب کچھ ہے جس پر آج وہ عمل کر رہے ہیں۔

قرآن میں اسلام اطاعت کا نام ہے مگر مسلمانوں کی اپنی تشریح میں اسلام فخر کی چیز بن گیا ہے۔ قرآن کے مطابق نجات کا دار و مدار عمل پر ہے مگر مسلمانوں کی تشریح کے مطابق نجات کے لئے یہ کافی ہے کہ آدمی اپنے کو مسلمان کہتا ہو۔ قرآن کا اسلام یہ ہے کہ آدمی اپنا احتساب کرے مگر مسلمانوں کی تشریح کے خانہ میں اسلام اس کا نام ہو گیا ہے کہ آدمی احتساب عالم کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہو۔ قرآن کا اسلام سارے عالم کا اسلام ہے۔ مگر مسلمانوں کے ذہنی خانہ میں وہ ایک قومی چیز بن کر رہ گیا ہے۔

محبت کے بجائے نفرت

"میں مراد آباد میں پیدا ہوا۔ پھر دس برس بجنور میں رہا۔ ۱۶ برس دہلی میں اور اب ۳۵ برس سے حجاز میں ہوں۔ حضرت شاہ عبد العزیز کے فتوے کی بنا پر میں ہندستان کو دار الحرب جانتا تھا اور اس کے قیام کو حرام۔ اسی نظریہ کے تحت انگریزی دور میں ہندستان سے ہجرت کی، بلکہ ہجرت شرعی سے بھی کچھ زیادہ۔ یہ معاملہ میری نظر میں اتنا سنگین تھا کہ حجاز آنے کے بعد دوبارہ ہندستان واپس جانے کے تصور کو بھی میں ناجائز خیال کرتا تھا۔ ایک بار میں بیوی کے ساتھ حج کے لئے گیا ہوا تھا۔ عرفات کا میدان تھا اور عصر و مغرب کے درمیان کا وقت۔ یہ وقت میدان عرفات میں گناہوں کی بخشش کا ہوتا ہے۔ میں نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ یہ گناہوں کی معافی کا وقت ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ حقوق العباد کا ہوتا ہے۔ مجھ سے تمھارے حقوق کی ادائگی میں جو کوتاہی ہوئی ہو اس کو معاف کر دو۔ بیوی نے کہا کہ ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ تم مجھ کو ہندستان لے جاکر ایک بار مجھے میرے عزیزوں سے ملا دو — ہندستان کا نام سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ میں اور ہندستان۔ پھر میں نے اپنے دل میں سوچا کہ ایک طرف دوزخ ہو اور دوسری طرف ہندستان تو تم دونوں میں سے کس کو ترجیح دوگے۔ اس کے بعد میں نے جو فیصلہ کیا وہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں"

یہ ایک بزرگ کی خود نوشت کہانی کا ایک حصہ ہے جو انھوں نے دہلی کے ایک اردو روزنامہ (۵ اگست ۱۹۸۱) میں شائع کی ہے۔ یہ کوئی ایک کہانی نہیں، اس قسم کی ان گنت کہانیاں ہیں جو ساری مسلم دنیا میں بکھری ہوئی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ایسے بے شمار لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے غیر مسلم قوموں کو اسلام کا حریف سمجھ کر ان سے نفرت کی، مگر وہ ان کو اسلام کا مدعو اور مخاطب سمجھ کر ان سے محبت نہ کر سکے۔ ان خیالات کے تحت بے شمار لوگ ایسے ہجرت اور جہاد میں مصروف رہے جس کا کوئی فائدہ نہ دینی صورت میں نکلنے والا تھا اور نہ دنیوی صورت میں۔

کیسی عجیب بات ہے۔ لوگوں نے ہندستان کو دار حرب سمجھا مگر وہ اس کو دار دعوت نہ سمجھ سکے۔ ہندوؤں کو انھوں نے غیر قوم قرار دیا مگر وہ ان کو مدعو قوم قرار نہ دے سکے۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کو لوگوں نے شیطان کے بندے کہہ کر ان کے خلاف جہاد کیا مگر وہ ان کو خدا کے بندے سمجھ کر ان کو خدا سے قریب لانے کی کوشش نہ کر سکے۔ انھوں نے مسلم حکمرانوں اور بادشاہوں کو ظالم ٹھہرا کر ان کی ہلاکت کے منصوبے بنائے مگر وہ ان کو اپنا بھٹکا ہوا بھائی جان کر ان کی اصلاح کی خیر خواہانہ کوشش نہ کر سکے۔ کیسی عجیب تھی یہ ہجرت اور کیسا عجیب تھا یہ جہاد۔ اس عجیب و غریب ہجرت اور جہاد کے نتیجہ میں اگر موجودہ دنیا میں اسلام کو غلبہ حاصل نہ ہو سکا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

تشخیص کا مسئلہ

مسلمان موجودہ زمانہ میں احساس محرومی کا شکار ہوئے۔ وہ ایسے حالات سے دوچار ہوئے جس نے انھیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کوئی چیز ان سے کھوئی گئی ہے۔ اس موقع پر اصل سوال یہ تھا کہ وہ کیا چیز ہے جو مسلمانوں سے کھوئی گئی ہے، کیوں کہ آدمی جس چیز کے بارے میں احساس محرومی سے دوچار ہو اسی کو وہ پانے کی کوشش کرے گا۔ اسی کے بارے میں وہ اپنا سارا زور لگا دے گا۔

اس موقع پر ایک سنگین حادثہ پیش آیا۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کے تمام لیڈروں نے انھیں یہ احساس دلایا کہ ان سے جو چیز کھوئی گئی ہے وہ حکومت ہے۔ مسلمانوں کے درمیان جو شاعر اور خطیب اور انشار پرداز پیدا ہوئے، اور جو نام نہاد مفکرین ان کے درمیان اٹھے ان سب نے اپنے اپنے انداز سے مسلمانوں کو یہ احساس دلایا کہ تم حکومت سے محروم ہوگیے ہو اور یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس نے تم کو موجودہ زمانہ میں حقیر اور کمزور کر دیا ہے۔

اس تشخیص کے قدرتی نتیجہ کے طور پر یہ ہوا کہ تمام مسلمان نہ صرف ہندستان بلکہ ساری دنیا میں حکومت و اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے دوڑ پڑے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے احیاء ملت اور تجدید اسلام کے نام سے جو کوششیں کی ہیں وہ تقریباً سب کی سب اسی ایک خانہ میں جاتی ہیں۔ مگر ان کوششوں کی صد فی صد ناکامی بتاتی ہے کہ وہ تشخیص صد فی صد غلط تھی جس کی بنیاد پر یہ تحریکیں اٹھائی گئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے جو چیز کھوئی ہے وہ تعلق باللہ ہے۔ اللہ پر زندہ عقیدہ، اللہ کی سچی پرستش، اللہ کے آگے مسئولیت کی تڑپ، اللہ کے لیے جینے اور مرنے کا احساس، یہ ہے وہ اصل چیز جو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں سے کھوئی گئی ہے یہ محرومی اتنی عام ہے کہ اصاغر اور اکابر، حتی کہ بے ریش اور باریش دونوں قسم کے مسلمان اس سے خالی ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی یہی اصل کمی ہے جس نے ان کے اندر دوسری تمام کمیاں پیدا کی ہیں۔ جب تک ان کی یہ کمی دور نہ ہو وہ اپنی اسی موجودہ حالت میں پڑے رہیں گے۔ کسی بھی دوسری چیز کا حصول ان کے مرض کا علاج نہیں بن سکتا۔

عجیب محرومی

واتل علیهم نبأ الذی اٰتیناه اٰیاتنا فانسلخ منها فاتبعه الشیطان فکان من الغاوین۔ ولو شئنا لرفعناه بها ولکنه اخلد الی الارض واتبع هواہ

(الاعراف ۱۷۵-۱۷۶)

اور ان لوگوں کو اس شخص کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دیں، پھر وہ ان سے نکل بھاگا پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، پس وہ گمراہ لوگوں میں سے ہوگیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان نشانیوں کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے۔ مگر وہ دنیا کی طرف مائل ہوگیا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کرنے لگا۔

ہدایت کے راستہ پر چلنا برتر مقصد پر چلنا ہے۔ مگر ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگ پست مقاصد میں الجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ اس سے اٹھ کر برتر مقصد کا ساتھ نہیں دے پاتے۔ وہ وقتی فائدہ کی خاطر ابدی فائدے کو کھو دیتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو ایک نئی تاریخ بنانا مطلوب تھا۔ آپ کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ شرک کے دور کو ختم کیا جائے اور توحید کو ہمیشہ کے لیے ایک غالب فکر بنا دیا جائے۔ اس خدائی منصوبہ میں اپنے آپ کو شامل کرنے کے لیے بلاشبہ قربانی درکار تھی۔ قربانی کا یہ سوال بہت سے لوگوں کے لیے اس کا ساتھ دینے میں رکاوٹ بن گیا۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو ابتداءً اس میں شامل ہوئے مگر بعد کو جب ان کے سامنے وہ وقت آیا کہ وہ اپنی خواہشوں کے تقاضے کو ذبح کریں اور اپنی انا کے بت کو توڑ کر اس کا ساتھ دیں تو وہ ایسا نہ کر سکے۔ وہ اپنی ذات کو بچانے کی خاطر خدا کے دین سے دور ہوگئے۔ یہی صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیش آئی اور یہی صورت ہر زمانہ میں پیش آتی ہے۔

کیسا عجیب ہے انسان۔ خدا اس کے سامنے واضح دلائل لے آتا ہے مگر وہ اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ خدا اس کے لیے بلندیوں کی طرف جانے کا راستہ کھولتا ہے مگر اس کے محدود مفادات اس کو آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ خدا اس کو تاریخ ساز بنانا چاہتا ہے مگر وہ خود ساز بن کر رہ جاتا ہے۔

عجیب غفلت

مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۴ - ۱۸۵۷) نے اپنے زمانہ میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا ـــ "ندوۃ العلمار کیا کر رہا ہے" اس مضمون میں انھوں نے کلکتہ کے اخبار حبل المتین (۱۰ اگست ۱۹۰۶) کا ایک اقتباس درج کیا تھا۔ یہ اقتباس "تاریخ ندوۃ العلمار" حصہ اول میں نقل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی مرحوم نے مرتب کی تھی۔ مولانا شبلی کا اقتباس بعض ضروری اضافہ کے ساتھ حسب ذیل ہے:

"جس زمانہ میں روسی قوم بت پرست تھی، شہنشاہ روس ولادی میر (Vladimir) نے (مذاہب کی تحقیق کے لئے) ایک جلسہ طلب کیا تھا جس میں علمار اسلام کو بھی بلایا تھا۔ جو صاحب اس غرض کے لئے قازان سے تشریف لائے تھے انھوں نے اسلام کے تمام عقائد اور فلسفہ میں سے صرف یہ مسئلہ منتخب کر کے پیش کیا کہ (اسلام میں) سور کا گوشت کھانا بالکل حرام ہے۔ مورخین روس لکھتے ہیں کہ شہنشاہ روس ولادی میر (۱۰۱۵ - ۹۵۶) اسلام کی طرف مائل تھا اور چاہتا تھا کہ تمام قوم روس کے لئے مذہب اسلام کا انتخاب کر دے۔ لیکن قازانی عالم نے شریعت اسلام کے تمام احکام میں سے صرف اس مسئلہ کو پیش کر کے اس پر اس قدر زور دیا کہ شہنشاہ نے غصہ میں آکر ان کو نکلوا دیا اور عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ (روس کے) ۶ کرور آدمی عیسائی ہو گئے۔"

بظاہر یہ غفلت بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہ غفلت بدستور آج بھی جاری ہے۔ قازان کے عالم کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے مدعو سے غیر حکیمانہ گفتگو کی جس کی وجہ سے وہ بدک گیا۔ آج کے مسلمانوں کی غلطی بھی یہی ہے کہ وہ اپنے مدعو گروہوں سے بے فائدہ مقابلہ آرائی جاری کئے ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کے مخاطبین کے دل اسلام کے بارہ میں سخت ہو گئے ہیں۔

مسلمانوں کی ذمہ داری تھی کہ وہ خدا کے بندوں کو خدا کے دین کی طرف بلائیں۔ مگر اس کے برعکس وہ یہ کر رہے ہیں کہ اپنے لایعنی جھگڑوں سے لوگوں کو اسلام سے بدکائے ہوئے ہیں۔ یہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سب سے بڑا جرم ہے۔ دنیا کی قوموں کو دین حق سے قریب کرنا تو درکنار وہ دنیا کی قوموں کو دین حق سے دور کر رہے ہیں۔ اس جرم کے ساتھ مسلمان کبھی خدا کی مدد کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

ہمارا المیہ

نیوٹن ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوا۔ وہ پورے معنوں میں ایک مذہبی آدمی تھا۔ حتیٰ کہ وہ چرچ بھی جاتا تھا۔ مگر دنیا کے سامنے وہ ایک سائنس داں کی حیثیت سے آیا نہ کہ ایک مذہبی انسان کی حیثیت سے شمسی نظام کے بارہ میں اس نے جو تحقیقات کیں انھیں کو مدون کرنے میں اس نے اپنی ساری عمر لگا دی اور اسی حیثیت سے وہ دنیا کے سامنے متعارف ہوا۔

یہی اکثر سائنس دانوں کا حال ہے۔ موجودہ زمانہ میں مغربی ملکوں میں جو بڑے بڑے علمائے سائنس اٹھے ان کی اکثریت اپنی ذاتی زندگی میں مذہبی تھی۔ وہ زیادہ تر عیسائی یا یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے حالات بتاتے ہیں کہ اپنے پیدائشی مذہب سے ان کا تعلق آخر وقت تک کسی نہ کسی طرح باقی تھا۔

مگر یہ سائنس داں دنیا کے سامنے جو چیز لے کر ابھرے وہ ان کا آبائی مذہب نہ تھا بلکہ سائنس تھی۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی سائنسی تحقیقات میں گذار دی اور انھیں تحقیقات کو دنیا کے سامنے لانے کے لئے پرجوش طور پر کام کرتے رہے۔

اس فرق کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مذہب ان کے لئے ایک آبائی وراثت تھی جب کہ سائنس ان کے لئے ایک دریافت کی حیثیت رکھتی تھی۔ آبائی وراثت کے معاملہ میں آدمی کبھی پرجوش نہیں ہوسکتا۔ اس کے برعکس جو چیز اسے بطور دریافت ملتی ہے وہ اس کی سب سے بڑی چیز ہوتی ہے وہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتا کہ دنیا کے سامنے اسے پیش کرے۔

یہ ایک خارجی مثال ہے جس میں خود ملت اسلام کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر کثرت سے بڑے بڑے لیڈر پیدا ہوئے۔ انھوں نے بڑے بڑے کام بھی کئے۔ مگر ان میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جس نے اقوام عالم کے سامنے اسلام کا پیغام پہنچانے کو کام سمجھا ہوا ور اسی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہو۔

اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اسلام ان کو بطور وراثت ملا تھا نہ کہ بطور دریافت۔ اگر اسلام ان کی "دریافت،، ہوتا تو انھیں اس کے بغیر چین نہ آتا کہ وہ اس کو سارے عالم تک پہنچا دیں۔ وہ اسی کے لئے جیتے اور اسی کے لئے مرتے۔ دنیا والوں سے کہنے کے لئے ان کے پاس سب سے بڑی بات یہی ہوتی۔ مگر جو اسلام بطور قومی وراثت ملا ہو وہ کبھی آدمی کے اندر اس قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتا۔

جوشِ عمل

دور اول کے مسلمانوں میں اسلام کے لیے جو جوش عمل تھا، وہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں نہیں پایا جاتا۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ دور اول کے مسلمانوں کے لیے اسلام ایک دریافت تھا، اسلام کی صورت میں انھوں نے ایک نئی حقیقت پائی تھی۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لیے اسلام محض ایک تقلیدی عقیدہ ہے۔ وہ انھیں وراثتی طور پر مل گیا ہے، نہ کہ اس کو انھوں نے ایک نئی اور برتر حقیقت کے طور پر دریافت کیا ہے۔

ایک نئی چیز کا پانا آدمی کے لیے سب سے زیادہ اہم واقعہ ہوتا ہے۔ وہ آدمی کی فکر و عمل کی صلاحیتوں کو آخری حد تک جگا دیتا ہے۔ جو آدمی اپنی زندگی میں کوئی نئی چیز نہ پائے، اس کی مثال سوئے ہوئے آدمی کی سی ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اپنی زندگی میں کوئی نئی چیز پا جائے وہ گویا وہ آدمی ہے جو نیند سے جاگ اٹھا۔ وہ بے حرکت کی حالت سے حرکت کی حالت میں آگیا۔

موجودہ زمانہ میں نفسیات کے میدان میں جو تحقیقات ہوئی ہیں، ان سے بھی اس نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے۔ ان تحقیقات میں سے ایک تحقیق اس موضوع پر تھی کہ وہ کیا چیز ہے جو کسی آدمی کو عام لوگوں سے زیادہ عمل کرنے پر اکساتی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں اس موضوع کی تفصیلات دیتے ہوئے بتایا گیا ہے:

psychological experiments in the fields of motivation and learning have disclosed in the power of novelty as an inducement to action.
(III/227)

حرکت اور علم کے میدان میں نفسیاتی تجربات سے ظاہر ہوا ہے کہ نیا پن اپنے اندر عمل پر ابھارنے کی طاقت رکھتا ہے —— موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں زندہ ایمان پیدا کرنے کی ایک ہی تدبیر ہے۔ یہ کہ ان کے ایمان کو دوبارہ ان کے لیے دریافت کے ہم معنی بنا دیا جائے۔

عظیم کوتاہی

۱۹۱۶ میں آل انڈیا کانگرس کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ اس اجلاس میں گاندھی جی پہلی بار کانگرس کے اسٹیج پر نمایاں ہوئے۔ گوپی ناتھ امن لکھنوی بھی اس تاریخی اجلاس میں ایک جوشیلے نوجوان کی حیثیت سے موجود تھے۔ ان کی روایت کے مطابق اس وقت کے یوپی کے انگریز گورنر سرجیمس مسٹن نے بھی اس اجلاس میں شرکت کی تھی۔ وہ اسٹیج پر کھڑے ہوئے تو انھوں نے گوپی ناتھ امن کے الفاظ میں شستہ اردو میں تقریر کی جو اس وقت سامعین کے لئے بڑی دلپذیر ثابت ہوئی (صدق جدید ۱۹ اگست ۱۹۸۳)

برطانی راج کے زمانہ میں بہت سے انگریزوں نے اردو (یا ہندستانی زبان) سیکھی تھی۔ ان کے لئے اردو زبان سیکھنے کا محرک اگرچہ تمام تر سیاسی تھا۔ مگر اس نے ہمارے علماء کے لئے تبلیغ دین کا زبردست موقع پیدا کر دیا تھا۔ وہ علماء جو دین سے واقف تھے مگر انگریزی نہیں جانتے تھے، وہ کم از کم اردو داں انگریزوں سے مل کر ان کو خدا کے سچے دین سے واقف کرا سکتے تھے۔ اس طرح کچھ انگریزوں تک براہ راست طور پر اور بقیہ انگریزوں تک بالواسطہ طور خدا کا پیغام پہنچ جاتا اور وہ اپنی دعوتی ذمہ داری سے خدا کے یہاں سبک دوش ہو جاتے۔

مگر ایک پورا دور ختم ہوگیا۔ اور اس قیمتی امکان کو استعمال نہ کیا جا سکا۔ اس کی وجہ مواقع کی کمی نہیں بلکہ جذبہ کی کمی تھی۔ انگریز ہندستان میں آئے تو ہمارے علماء ان کو قومی دشمن کی نظر سے دیکھنے لگے۔ انگریز ان کے لئے نفرت اور حقارت کا موضوع بن گئے۔ انگریزوں کے بارہ میں ہمارے علماء کے اندر قومی نفسیات تو پیدا ہوئی مگر ان کے اندر انگریزوں کے بارہ میں دعوتی نفسیات پیدا نہ ہو سکی۔

دعوت کا کام دوسرے لفظوں میں مدعو کو جنت کا راستہ دکھانے کا کام ہے۔ اس قسم کا کام وہی شخص کر سکتا ہے جس کے اندر اپنے مخاطب کے لئے محبت اور خیر خواہی کا بے پناہ جذبہ پایا جاتا ہو۔ علماء جب انگریزوں سے نفرت کر رہے تھے تو وہ ان کو دعوت حق کا مخاطب نہیں بنا سکتے تھے۔ ہمارے علماء کی یہی عظیم الشان کوتاہی ہے جس کی سزا انھیں یہ ملی کہ وہ لوگ جنھوں نے آزادی کی جدوجہد میں آگے بڑھ کر قربانیاں دی تھیں۔ جب ملک آزاد ہوا تو وہ یہاں سب سے پیچھے کی صف میں دھکیل دئے گئے۔ غلام ہندستان کے "امام" آزاد ہندستان کے "مقتدی" بن کر رہ گئے۔

خدائی منصوبہ کے خلاف

زندگی کیا ہے اور انسان کی کامیابی کس چیز میں ہے، ان سوالات کو ایک لفظ میں "نوعیت حیات" کہا جا سکتا ہے۔ اسلام اسی نوعیت حیات کا خدائی علم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی منشا ہے کہ نوعیت حیات کا یہ علم ہمیشہ تمام انسانوں تک پہنچتا رہے۔

اس تبلیغی عمل کو مستحکم اور یقینی بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسانی تاریخ میں ایسے انقلابات برپا کیے جس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تاریخی طور پر ایک مسلّم نبوت بن گئی۔ قرآن ایک ایسی محفوظ کتاب بن گیا جس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ کی جا سکے۔ اسلام کی بنیاد پر ایک مکمل تاریخ ظہور میں لائی گئی۔ ساری دنیا میں مسلمان اتنی بڑی تعداد میں پھیلا دیے گئے کہ آج دنیا کی آبادی میں ہر پانچ آدمی میں سے ایک آدمی مسلمان ہے۔ وغیرہ

اس قسم کے وسیع انتظامات اس بات کی یقینی ضمانت تھے کہ اسلام کا پیغام مسلسل تمام اہل عالم تک پہنچتا رہے۔ اور ماضی میں بلاشبہہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں جو مسلم رہنما اٹھے، ان کی ایک غلطی نے سارے دعوتی انتظامات کو عملاً معطل کر دیا۔ وہ غلطی یہ تھی کہ ان رہنماؤں نے اپنی خود ساختہ تحریکوں کے ذریعہ اسلام کو جنگ جو مذہب کا روپ دے دیا۔

کہیں سیاسی آزادی حاصل کرنے کے نام پر، کہیں اسلامی حکومت قائم کرنے کے نام پر، کہیں سرخ یا سفید سامراج کے ظلم کو مٹانے کے نام پر، کہیں صلیبی اور صہیونی تدخل کو ختم کرنے نام پر، کہیں ملی حقوق اور ملی تحفظ حاصل کرنے کے نام پر، غرض کسی نہ کسی نام پر ساری دنیا کے مسلمان ٹکراؤ میں اور لڑائی میں مصروف کر دیے گئے۔ اور کہا گیا کہ یہ اسلامی جہاد ہے۔

ان بے معنی لڑائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان معتدل تعلقات باقی نہ رہے۔ مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان معتدل تعلقات ہوں تو اسلام کا تعارف اپنے آپ ہوتا رہتا ہے۔ مگر جب دونوں میں معتدل تعلقات باقی نہ رہیں تو مسلمان اور ان کا دین دونوں ہی نفرت کا موضوع بن جاتے ہیں، اور نفرت اور تناؤ کی فضا میں اسلام کا دعوتی عمل جاری رہنا ممکن نہیں۔ یہ صورت حال خدا کے منصوبہ میں مداخلت کے ہم معنی ہے۔

اسلام کیا ہے

آغاز اسلام کے ۳۰۰ سال بعد دسویں صدی عیسوی میں یہ حال تھا کہ آباد دنیا کے بیشتر حصہ پر اسلامی حکومت اور اسلامی تہذیب قائم ہو چکی تھی۔ یہ ایک وسیع سلطنت تھی جس کا مذہبی مرکز مکہ اور ثقافتی وسیاسی مرکز بغداد تھا۔ مغرب میں یہ سلطنت پورے شمالی افریقہ اور بحر اوقیانوس کے ساحل تک پھیلی ہوئی تھی، اس کے آگے پورا اسپین (سوائے استوریا کے) اور سسلی اور کریٹ کے جزائر بھی اس میں شامل تھے۔ قبرص تک اس کے اثرات پہنچ چکے تھے۔

اسی طرح جنوبی اٹلی کا شہر باری اسلامی حکومت کے ماتحت تھا اور بعض دوسرے مقامات (مثلاً امالفی) اس کے دائرہ اقتدار میں سمجھے جاتے تھے۔ عرب کے شمال میں شام، آرمینیا اور مشرقی قفقاز اسلام کے مستقل مقبوضات تھے اور مشرق میں پورا عراق، ایران اور پورا افغانستان اس کے حدود میں شامل تھا۔ ان ملکوں کے شمال میں ماوراء النہر، مغرب میں خوارزم کا علاقہ اور مغرب میں فرغانہ کی وادیاں اور پہاڑ بھی مملکت اسلامی کا حصہ تھے۔ مسلمان دریائے سندھ کو آٹھویں صدی عیسوی میں عبور کر چکے تھے اور اس کے تمام زیریں حصے ان کے قبضہ میں تھے۔

اسلام کی یہ فتوحات خدا کی خاص مدد کے ذریعے حاصل ہوئیں۔ ان کے پیچھے خدا کی عظیم مصلحت شامل تھی۔ اور وہ تھی دنیا سے شرک کا خاتمہ اور قرآن کی حفاظت کا انتظام۔ یہ دونوں کام مکمل طور پر انجام پائے۔

تاہم یہی چیز بعد کے مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا فتنہ بن گئی۔ وہ اسلام کو اس کی سیاسی تاریخ کی روشنی میں دیکھنے لگے۔ حالانکہ اسلام کو اس کی ابتدائی تعلیمات کی روشنی میں دیکھنا چاہئے۔

آج ایک مسلمان جب اسلام کے احیاء کی بات سوچتا ہے تو اس کے ذہنی سانچہ میں فوراً تاریخ کا احیاء آجاتا ہے۔ وہ "فتوحات" کی تاریخ زندہ کرنے کو اسلام کو زندہ کرنے کے ہم معنی سمجھ لیتا ہے۔ جب کہ اسلام کو زندہ کرنا یہ ہے کہ ایسے افراد تیار کئے جائیں جو خدا کی عظمت وجلال کو محسوس کرنے والے اور اس سے ڈرنے والے ہوں۔ جو دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملہ کریں تو یہ سمجھ کر کریں کہ خدا کے یہاں اس کے بارہ میں ان سے پوچھ ہوگی۔ جو دنیا میں آخرت کی خاطر جئیں جو جہنم سے بچاؤ اور جنت میں داخلہ کو اپنا سب سے بڑا مسئلہ بنا لیں۔ اسلام آخرت کا عنوان ہے۔ لیکن اگر ذہن صحیح نہ ہو تو وہ دنیا کا عنوان بن کر رہ جاتا ہے۔

اسلام کی نفی

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آدم اور ان کی نسل کو زمین میں بھیجنے کا فیصلہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو (اور ان کی متوقع نسلوں کو) مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگ جا کر زمین میں بسو۔ تمہارا بعض تمہارے بعض کا دشمن ہوگا۔ پس جب تمہارے پاس میری ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت پر چلے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ بدبختی میں مبتلا ہوگا (طٰہٰ ۱۲۳)

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں انسانوں کا بگاڑ یہ ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف ہو کر لڑنے لگیں۔ انسانوں کا دو گروہ بن کر باہم لڑنا انسانی بگاڑ کی خاص علامت ہے۔ حضرت آدم کے زمین میں آباد ہونے کے بعد آپ کے فرزند ہابیل اور قابیل سے اس باہمی جنگ کا آغاز ہوا۔ اس وقت سے لے کر آج تک تاریخ کے بیشتر حصوں میں یہی صورت حال جاری رہی ہے۔

تاہم قدیم زمانہ اور جدید زمانہ میں ایک فرق ہے۔ قدیم زمانہ کی لڑائیاں ضد اور ظلم کے جذبہ کے تحت ہوتی تھیں۔ موجودہ زمانہ میں یہ باہمی ٹکراؤ فلسفیانہ جواز کے تحت ہو رہا ہے۔ یہ فلسفیانہ جواز موجودہ زمانہ میں دو قسم کے لوگوں نے فراہم کیا ہے۔ اولاً اشتراکی مفکرین نے، اور اس کے بعد اسلامی مفکرین نے۔ اشتراکی مفکرین نے یہ کام "حکومتِ مزدور" کے نعرہ کے تحت کیا اور اسلامی مفکرین نے "حکومتِ الٰہیہ" کے نعرہ کے تحت۔

اشتراکی فلسفہ نے موجودہ زمانہ میں کچھ لوگوں کو موقع دیا ہے کہ وہ لوگوں کی آزادیاں چھین لیں۔ ان کو ان کی جائدادوں سے محروم کریں۔ ان کو بے دریغ قتل کریں۔ ان کو ناقابل بیان مصائب میں مبتلا کر دیں۔ اس کے باوجود ان تمام مظالم کے جواز کے لئے ان کے پاس ایک خوبصورت فلسفہ موجود ہو۔ ٹھیک اسی طرح جدید اسلامی مفکرین کے نظریات نے انھیں یہ موقع دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو دو طبقوں (حکمراں طبقہ اور انقلاب پسند طبقہ) میں تقسیم کر کے انھیں ایک دوسرے سے لڑائیں اور اس کو اسلامی جہاد کہیں۔ حالانکہ مسلمانوں کی باہمی جنگ حرام ہے۔ وہ اقتدار پا کر انسان سے ہر قسم کی آزادی چھین لیں اور اپنے مخالفین کو کچلنے کے تمام وحشیانہ طریقے استعمال کریں اور اس کے باوجود ان کا اسلامی فلسفہ ان کو جائز ثابت کرنے کے لئے موجود ہو۔

اشتراکی مفکرین نے عدل کے نام پر عدل کی نفی کی تھی، اسلامی مفکرین اسلام کے نام پر اسلام کی نفی کر رہے ہیں۔

قومی نفسیات

اخبار الجمعیۃ (دہلی) کے اڈیٹر نے پاکستان کا سفر کیا تھا۔ وہاں وہ مولانا تھانوی کے خلیفہ مولانا احتشام الحق تھانوی (۱۹۱۵ - ۱۹۸۰) سے ملے تھے۔ مولانا مرحوم نے اڈیٹر صاحب سے دیوبند میں اپنی طالب علمی کا ذکر کیا۔ اس ضمن میں انھوں نے ایک واقعہ بیان کیا جس کو انھوں نے اپنے مطبوعہ سفر نامہ میں ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

مولانا احتشام الحق تھانوی نے مولانا حسین احمد مدنی کی انگریز دشمنی کا ذکر کرتے ہوئے یہ واقعہ بیان کیا کہ انگلستان کی موجودہ ملکہ الزبتھ کے دادا کی تاج پوشی تھی۔ مولانا حسین احمد مدنی کا (دار العلوم) دیوبند میں حدیث کا درس ہو رہا تھا۔ کسی طالب علم نے مولانا مدنی کی خدمت میں ایک پرچہ بھیجا۔ اس میں لکھا تھا کہ آج بادشاہ کی تاج پوشی کا دن ہے۔ اس لئے برطانوی حکومت کے لئے بد دعا ہونی چاہئے۔ مولانا مدنی نے فوراً درس روک دیا۔ کتاب بند کر دی اور فرمایا کہ بالکل صحیح ہے۔ اور اس کے بعد مولانا نے کچھ اس انداز میں (بد) دعا کرانی شروع کی کہ طلبہ پر رقت طاری ہوگئی (روز نامہ الجمیعۃ دہلی، ۱۳ نومبر ۱۹۷۹)

یہ واقعہ موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین کی نفسیات کی نمائندگی کرتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں تقریباً تمام قائدین کا یہ حال رہا ہے کہ دوسری قومیں ان کے لئے نفرت اور عداوت کا موضوع بن گئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دوسری قوموں کو انھوں نے اپنا حریف اور رقیب سمجھا۔ ان کو وہ اپنے دین کا مدعو نہ سمجھ سکے۔

قومی ذہن اور دعوتی ذہن دونوں بالکل الگ الگ ذہن ہیں اور دو مختلف نفسیات بناتے ہیں۔ قومی حریف کے لئے آدمی کے اندر نفرت اور دشمنی کے جذبات ابھرتے ہیں۔ اس کے برعکس جب یہ ذہن ہو کہ ہم خدا کے دین کے داعی ہیں اور دوسری قومیں خدا کے دین کی مدعو، تو ان کے لئے ہمارے دل میں خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبات امنڈنے لگیں گے۔

حریف کے لئے آدمی کے اندر سے بد دعا کے کلمات نکلتے ہیں اور مدعو کے لئے دعا کے کلمات۔ مگر اس قسم کی بد دعا سراسر خدائی منصوبہ کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے بزرگوں کی زبان سے نکلنے کے باوجود وہ آج تک خدا کی بارگاہ میں قبول نہ ہو سکی۔

امت کا زوال

سورۃ المائدہ (۱۳-۱۴) میں یہود اور نصاریٰ کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے اس نصیحت کا بڑا حصہ کھو دیا جو انھیں ان کے نبیوں کے ذریعہ کی گئی تھی (فنسوا حظا مما ذکروا بہ) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سواء السبیل سے بھٹک گئے۔ ان کے دلوں میں قساوت پیدا ہوگئی۔ وہ باہمی اختلاف اور ٹکراؤ میں مبتلا ہوگئے۔

فنسوا حظا مما ذکروا بہ کی تشریح حضرت حسن بصری نے ان الفاظ میں کی ہے:

ترکوا عری دینھم و وظائف اللہ تعالی التی لا یُقبل العمل الا بھا۔ (تفسیر ابن کثیر)

انھوں نے دین کے عُریٰ کو چھوڑ دیا اور اللہ تعالے کے ان وظائف کو ترک کر دیا جن کے بغیر اعمال کبھی قبول نہیں کئے جاتے۔

عروہ (جمع عُریٰ) کے لفظی معنی کاج کے ہیں۔ یعنی وہ چیز جس میں کوئی چیز اٹکائی جائے۔ استعمالی معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب ہے نفیس مال، کسی چیز کا بہتر حصہ۔ اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ یہود و نصاریٰ کو جو دین دیا گیا تھا اس کا اصل حصہ انھوں نے بھلا دیا۔ اب جو چیز وہ دین کے نام پر لئے ہوئے ہیں وہ گویا ایک ایسا جسم ہے جس سے اس کی روح نکل گئی ہو۔

دین کا ایک ظاہری حصہ ہے اور ایک اس کا معنوی حصہ۔ دین کا معنوی حصہ دوسرے لفظوں میں اس کا خدائی حصہ ہے۔ یعنی خدا سے سب سے زیادہ ڈرنا، اس سے سب سے زیادہ محبت کرنا۔ اس کے آگے قلب و دماغ کا پوری طرح جھک جانا، یہ دین کا عُریٰ ہے۔ دین کے ظاہری حصہ سے مراد وہ خارجی اعمال ہیں جو مختلف مواقع پر مختلف انداز سے کئے جاتے ہیں۔

کسی امت کا سواء السبیل پر ہونا یہ ہے کہ دین اس کے اندر معنوی (بالفاظ دیگر، خدائی پہلو) کے اعتبار سے زندہ ہو۔ مگر جب امت میں بگاڑ آتا ہے تو اگرچہ اس کے درمیان اب بھی دین کے نام پر بہت سی سرگرمیاں جاری رہتی ہیں مگر اس کی زندگی سے خدا حذف ہو جاتا ہے۔ دین کا معنوی پہلو گم ہو جاتا ہے اور دین کا ظاہری پہلو مزید اضافہ کے ساتھ اس کے درمیان ابھر آتا ہے۔

دورزوال میں دین اپنی شکل کے اعتبار سے ختم نہیں ہوتا۔ البتہ وہ اپنی روح کے اعتبار سے ختم ہوجاتا ہے۔ خدا کی بڑائی کے چرچے کرنا لوگ نہیں جانتے' البتہ خدا کے نام پر دوسری چیزوں کے چرچے سے وہ خوب واقف ہوتے ہیں۔

فضائل اعمال اور مسائل اعمال کا زور، تاریخ اسلام اور حکومت اسلام کے چرچے، اکابرامت اور بزرگان دین کے تذکرے، جشن میلاد اور ایصال ثواب کے ہنگامے، سب اسی کی مثالیں ہیں۔ جب دین کا خدائی پہلو حذف ہوجاتا ہے تو ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق اس کا کوئی ظاہری پہلو لے لیتا ہے اور اسی کے اوپر اپنے زبان وقلم کی ساری قوت صرف کرنے لگتا ہے۔

جب کسی امت کا یہ حال ہوجائے تو یہ اس کی علامت ہے کہ وہ سواء السبیل سے ہٹ گئی۔ اس نے دین کا بڑا حصہ کھودیا۔ وہ خدا کی رحمت سے بہت دور چلی گئی۔

حضرت حسن بصری تابعی نے تقریباً ستر صحابہ کو دیکھا تھا۔ انھوں نے ایک بار اپنے زمانہ کے مسلمانوں سے کہا کہ تم لوگ جتنا زیادہ نفل نمازیں پڑھتے ہو اور جتنا زیادہ نفل روزے رکھتے ہو، اصحاب رسول اتنا زیادہ نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ تم لوگوں سے افضل تھے۔ پوچھا گیا کہ کیوں وہ افضل تھے۔ حضرت حسن بصری نے جواب دیا:

ان کے سینوں میں اللہ کا خوف پہاڑ سے بھی زیادہ بڑا تھا۔

لوگ انسانی عظمتوں میں گم ہیں، صحابہ کرام خدائے ذوالجلال کی عظمتوں میں گم تھے۔ لوگ عوام کی مرضی پر نظر رکھتے ہیں، صحابہ کرام خدا کی مرضی کو دیکھتے تھے۔ لوگوں کو قیادت کے اسٹیج پر نمایاں ہوکر تسکین ملتی ہے۔ صحابہ کرام تواضع کے خلوت کدوں میں تسکین پاتے تھے۔

لوگ بولنا جانتے ہیں، صحابہ کرام چپ رہنا جانتے تھے۔ لوگ ہنگاموں میں جیتے ہیں، صحابہ کرام تنہائیوں میں جیتے تھے۔ لوگوں نے دنیا کے مسئلہ کو مسئلہ سمجھ رکھا ہے، صحابہ کرام نے آخرت کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ بنایا تھا۔ لوگ وقتی کامیابیوں کی طرف دوڑتے ہیں، صحابہ کرام وہ لوگ تھے جو ابدی کامیابی کے شوق میں وقتی کامیابی کو اس طرح بھلا چکے تھے جیسے اس کا وجود ہی نہیں۔

اصل کام ابھی باقی ہے

حال میں مختلف مسلم ملکوں میں اسلام کے نام پر جو ہنگامے شروع ہوئے ہیں، انھوں نے دنیا بھر میں لوگوں کے لئے بحث و گفتگو کا نیا موضوع پیدا کر دیا ہے۔ مغربی اخبارات میں اس قسم کی سرخیاں اب عام ہو گئی ہیں:

جنگی اسلام بر سرِ عمل	Militant Islam is on the march
اللہ کے سپاہیوں کا اقدام	Soldiers of Allah advance.
مسلم دنیا کی جنگ جوئی پھر زندہ	Muslim World rekindles its militancy.

اس میں یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ اسلام کی "عسکریت" پہلے اغیار کے حملوں کو پسپا کرنے کے لئے بر سرِ عمل آتی تھی۔ مگر آج اسلامی عسکریت خود اپنوں کو قتل کرنے کے لئے متحرک ہوئی ہے۔ اغیار کا مقابلہ کرنا اسلام میں عین مطلوب ہے، مگر اپنوں کی قتل و غارت گری کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں۔ یہ کچھ لوگوں کا اپنا گھڑا ہوا اسلام ہے نہ کہ قرآن و سنت کا اسلام۔

اسلام کا چرچا آج ساری دنیا میں بہت بڑے پیمانہ پر ہو رہا ہے۔ پریس، ریڈیو، ٹیلی وژن، تعلیم گاہ، کانفرنس، غرض تمام اشاعتی ذرائع سے آج اسلام کے اتنے چرچے ہو رہے ہیں جتنے شاید تاریخ میں کبھی نہیں ہوئے تھے۔ ممکن ہے یہ اس بات کی علامت ہو کہ وہ وقت آگیا ہے جب کہ، حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق، کوئی کچا پکا گھر زمین پر ایسا نہیں بچے گا جس میں اسلام کی آواز داخل نہ ہو گئی ہو۔ تاہم جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، اس واقعہ میں ان کے لئے بظاہر خوشی کا زیادہ موقع نہیں۔ کیوں کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں ان کا وہ حصہ نہیں ہے جو کہ حقیقی طور پر ہونا چاہئے۔ قرآن کی تجارت کا بڑا حصہ آج غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے۔ ظاہر ہے کہ صحت و نفاست کے ساتھ قرآن کی اشاعت ایک مطلوب کام ہے۔ مگر یقینی ہے کہ جو غیر مسلم اس کام کو کر رہے ہیں وہ اس کے لئے خدا کے یہاں کسی اجر کی توقع نہیں رکھ سکتے۔

ہمارے لئے سب سے زیادہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اسلام کے نام پر ساری دنیا میں ہلچل کے باوجود اسلام کا اصل کام ابھی ہونا باقی ہے۔ ایک مسلمان اور دوسرے مسلمان کے درمیان جو رشتہ ہے وہ خیر خواہی اور اتحاد کا رشتہ ہے۔ اس پہلو سے وہی تحریک اسلامی تحریک ہے جو مسلمانوں کے درمیان برادرانہ تعلق کو مضبوط کرے۔ جو ان کو ایک واحد جسمانی نظام کی طرح باہم جوڑ دے۔ مگر موجودہ تحریکیں اس کے برعکس نتیجہ ظاہر کر رہی ہیں۔ ہماری موجودہ تحریکیں، کم از کم عملاً، مسلمانوں کو فرقوں اور گروہوں میں بانٹ رہی ہیں، حتیٰ کہ ہر گروہ کا قرآن اور ہر گروہ کی حدیث بھی الگ الگ ہے۔ ہر گروہ کی علیحدہ تنظیم، علیحدہ صحافت، علیحدہ لٹریچر، حتیٰ کہ علیحدہ مسجدیں قائم ہیں۔ اور اگر ان میں سے کسی گروہ کو اتفاق سے کہیں اقتدار حاصل ہو جائے، خواہ وہ ایک ادارہ میں ہو یا ایک ملک میں، تو اس کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوسرے گروہ کے افراد کو اپنے دائرہ سے باہر نکال پھینکے۔ اور اگر ممکن ہو تو گولی اور پھانسی کے ذریعہ ان کا وجود مٹا ڈالے۔ ہر گروہ اپنے کارناموں کو نمایاں کرنے اور دوسرے گروہ کے کاموں پر پردہ ڈالنے میں لگا ہوا ہے۔ ہر گروہ اس کوشش میں ہے کہ اسلام اور ملت اسلام کے لئے ہونے والے تمام کاموں کا کریڈٹ اپنے حصہ میں جمع کر لے۔ ہر گروہ

اس خام خیالی میں مبتلا ہے کہ حق تمام تر اس کی طرف ہے اور ناحق تمام تر دوسروں کی طرف ——— اصحاب رسول اسلام کے ذریعہ آخرت کا انعام چاہتے تھے، ان کے پیچھے چلنے والے آج اسلام کے ذریعہ دنیا کا انعام لینے کی کوشش میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔

جہاں تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلق کا سوال ہے، معاملہ اور بھی زیادہ نازک ہے مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان جو تعلق ہے وہ عام معنوں میں ایک قوم اور دوسری قوم کا تعلق نہیں ہے، بلکہ داعی اور مدعو کا تعلق ہے۔ مگر دنیا بھر میں بے شمار اسلامی ہنگاموں کے باوجود مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ابھی تک داعی اور مدعو کا رشتہ قائم نہ ہوسکا۔ حالاں کہ اللہ کو ہم سے اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ یہی ہے۔ مسلمان اس دنیا میں شاہد ہیں اور دوسری قومیں مشہود۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ غیر مسلم قوموں کے سیاسی اور مادی حریف بنے ہوئے ہیں۔ جب تک ایسا نہ ہو کہ ایک داعی کے مقام پر کھڑا ہو اور دوسرا اپنے کو مدعو کے مقام پر پائے، ہماری اسلامی سرگرمیوں کا نہ وہ فائدہ مل سکتا ہے جو قرآن میں بتایا گیا ہے اور نہ اس قسم کے اعمال آخرت کی عدالت میں ہم کو بری الذمہ کرنے والے ثابت ہوسکتے ہیں۔ دو آدمی باہم گالی گلوج کر رہے ہوں، آپ ان کو شرافت اخلاق کی تلقین کرنے جائیں اور ان کے سر پر ایک بھاری پتھر پٹک دیں، تو آپ کے لئے اس میں کچھ نہیں۔ کیوں کہ بظاہر اگرچہ گالی گلوج سے منع کرنے کا واقعہ پیش آیا۔ مگر آپ کے اور گالی دینے والے کے درمیان مصلح کا تعلق قائم نہیں ہوا۔ پھر خدا کے یہاں آپ کو اس سے کیا مل سکتا ہے۔

موجودہ زمانہ کے غیر مسلموں کی نظر میں مسلمانوں کی حیثیت بس عام قوموں کی طرح ایک قوم کی ہے۔ اور ایسا تصور قائم کرنے میں وہ حق بجانب ہیں۔ اسلامی شخصیتیں اور اسلامی جماعتیں اپنی پڑوسی غیر مسلم قوموں کو اللہ کا پیغام پہنچانے کے لئے اپنے اندر کوئی رغبت نہیں پاتیں۔ البتہ مسلمانوں کے اوپر غیر مسلم قوموں کے "مظالم" کے خلاف احتجاجی بیانات جاری کرنے میں ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ ان کی معاشیات یا سیاسیات کے کسی حصہ پر اگر غیر مسلموں نے قبضہ کرلیا تو وہ فوراً اس کے خلاف ایجی ٹیشن چلانے کے لئے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ یہ سوچ ان میں کبھی نہیں ابھرتی کہ اس قسم کے ہنگاموں کی وجہ سے غیر مسلم ہم کو اپنا دنیوی حریف سمجھ لیتے ہیں اور نتیجۃً اسلامی تحریک ان کی نظر میں اخروی تحریک نہیں رہتی بلکہ ایک قسم کی دنیوی تحریک بن کر رہ جاتی ہے۔ کچھ مسلمان اسلام کو عملیاتی مجموعہ کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔ کچھ دوسرے مسلمان ہیں جو اسلام کو سیاسی احکام کے مجموعہ کی حیثیت سے سامنے لارہے ہیں۔ اس کی وجہ سے عام لوگوں کو اسلام یا تو دوسرے مذاہب کی طرح ایک رسمی مذہب نظر آتا ہے یا کمیونزم کی طرح ایک سیاسی مذہب ———

قرآن کے مطابق، مسلمان کا کام شہادت علی الناس ہے۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم لوگوں کو جہنم سے ڈرانے والے اور جنت کی خوش خبری دینے والے بنیں۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ سیکولرزم کے اجیار سے لے کر اپنے حقوق کی بازیابی تک بے شمار کاموں کے لئے غیر مسلم قوموں سے دست وگریباں ہیں۔ مگر اسی ایک کام کے لئے نہیں اٹھتے جو اللہ نے اصلاً ان کے اوپر فرض کیا تھا۔ یہ غفلت اتنی بڑی ہے کہ اندیشہ ہے کہ مسلمان اللہ کی نظر میں بے قیمت ہوجائیں۔ اور پھر نہ دنیا میں ان کو خدا کا سایہ حاصل ہو اور نہ آخرت میں۔

کیسے عجیب لوگ

نظام، خواہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی اس کو قائم کرنے کے لئے ایسے افراد درکار ہوتے ہیں جن کے اندر حکمت اور کیرکٹر ہو۔ ایسے لوگ جن کے اندر نہ حکمت ہو اور نہ وہ کردار کی طاقت رکھتے ہوں وہ نہ اسلامی نظام قائم کر سکتے ہیں اور نہ غیر اسلامی نظام۔

۱۹۴۷ میں ہندستان آزاد ہوا تو جواہر لال نہرو ملک کے پہلے وزیر اعظم بنائے گئے۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ ملک کے اکثر دانشور اور ماہرین یا تو انگریزوں کے وفادار رہے تھے یا ان کا ماضی کا ریکارڈ بتا رہا تھا کہ وہ کانگرس اور تحریک آزادی کے مخالف رہے ہیں۔ جواہر لال نہرو سے کسی نے اس صورت حال کا ذکر کیا اور کہا کہ ایسے لوگوں کے ذریعہ آپ کیوں کر اپنی حکومت چلائیں گے۔ نہرو نے جواب دیا:

" ہر آدمی کی ایک قیمت ہے اور میں وہ قیمت ادا کر سکتا ہوں "

چنانچہ نہرو نے لوگوں کو مختلف عہدے اور حیثیت دے کر نئی حکومت کا وفادار بنا لیا اور اس طرح کامیاب طور پر ملک کا انتظام چلاتے رہے۔

اب دوسری مثال لیجئے۔ ۱۹۸۰ میں آیات اللہ خمینی کو ایران میں اقتدار حاصل ہوا۔ اب ان کے سامنے بھی یہی مسئلہ تھا۔ کیوں کہ اس سے پہلے ایران میں رضا شاہ پہلوی کی حکومت تھی اور وہاں کا دانشور طبقہ شاہ کی وفاداری میں خمینی تحریک کا مخالف بنا ہوا تھا۔ امام خمینی کے سامنے یہ مسئلہ آیا تو انھوں نے کہا کہ " ہم ایسے تمام لوگوں کو مار ڈالیں گے "، چنانچہ انھوں نے ایک طرف سے ان تمام لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیا جنھوں نے انقلاب سے پہلے کوئی مخالفانہ رول ادا کیا تھا۔ امام آیات اللہ خمینی اپنے " مخالفین " کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو گئے مگر اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا اسلامی نظام بھی برباد ہو کر رہ گیا۔

۷ نومبر ۱۹۸۳ کو میری ملاقات ایک ایسے تعلیم یافتہ شخص سے ہوئی جو ۲۵ سال سے لندن میں رہتے ہیں اور اب انھوں نے وہیں کی شہریت اختیار کر لی ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ برطانی قوم دوسری جنگ عظیم تک بہت بڑی شہنشاہیت کی مالک تھی۔ اب وہ تقریباً اپنے ملک تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ پھر انھوں نے اپنی موجودہ حالت سے مطابقت پیدا کر لی ہے یا ابھی تک وہ اپنے ماضی کی عظمت میں جی رہے ہیں۔

انھوں نے جواب دیا کہ برطانی قوم نے اس معاملہ میں بڑی گہری ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔

انھوں نے اپنی موجودہ صورت حال سے مطابقت کرلی ہے۔ مگر وہ مطابقت اس طرح ہے کہ اپنی عظمت کا احساس بدستور انھیں حاصل ہے، وہ اس سے محروم نہیں ہوئے۔ انھوں نے ایسا کیا ہے کہ انھوں نے برطانی عظمت کو مغربی عظمت میں تبدیل کرلیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو بڑائی انھیں برطانیہ کی سطح پر حاصل نہیں ہے وہ آج بھی ان کو مغرب کی سطح پر حاصل ہے۔ "جب ہم خود بھی اسی مغرب کا حصہ ہیں تو ہم کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت"۔ برطانی قوم نے جب دیکھا کہ وہ اپنی عظمت کو انفرادی سطح پر قائم نہیں رکھ سکتے ہیں تو انھوں نے دوسروں کے ساتھ مل کر اپنی عظمت کو دوبارہ اجتماعی صورت میں حاصل کرلیا۔

دوسری طرف مسلم دنیا کا حال دیکھئے۔ پاکستان میں تقریباً ایک درجن بڑی بڑی اسلامی تنظیمیں اور جماعتیں ہیں۔ یہ تمام تنظیمیں اور جماعتیں پاکستان میں اسلامی نظام قائم کرنے کی علم بردار ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں کم ازکم دو بار ایسا ہوا ہے کہ یہ جماعتیں "متحدہ محاذ" بناکر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئی ہیں۔ پہلی بار صدر ایوب خاں کو حکومت کے عہدہ سے ہٹانے کے لئے اور دوسری بار ذوالفقار علی بھٹو کو ہٹانے کے لئے جو اس وقت وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز تھے۔ دونوں بار یہ جماعتیں منفی مقصد میں کامیاب ہوگئیں۔ انھوں نے ایوب خاں کو بھی حکومت سے نکال دیا اور بھٹو کو بھی۔

مگر اس کے بعد جب وہ وقت آیا کہ پاکستان کی یہ اسلامی تنظیمیں اور جماعتیں مل کر اسلامی نظام قائم کریں اور ملک کو اسلامی تہذیب اور اسلامی سیاست کا نمونہ بنادیں تو تمام جماعتیں ایک دوسرے سے الگ ہوگئیں۔ اب ہر جماعت یہ چاہنے لگی کہ اس کو تنہا حکومت کی کرسی مل جائے۔ چونکہ یہ ممکن نہ تھا، ان میں سے کوئی بھی حکومت پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ صدر ایوب کے ہٹنے کے بعد بھٹو نے حکومت پر قبضہ حاصل کرلیا اور وزیر اعظم بھٹو کے بعد جنرل ضیاء الحق نے۔

پاکستان کے "اسلام پسند" لیڈر اگر برطانیہ کے "کفر پسند" لیڈروں کی طرح ہوتے تو وہ اپنی قوم کے دوسرے ہم مذہبوں کی عظمت میں اپنی عظمت دیکھ لیتے۔ اور پھر ایک دوسرے سے مل جاتے نہ کہ الگ الگ ہوکر اپنے کو کمزور کرلیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ پاکستان میں وہ اسلامی نظام عملاً قائم ہوچکا ہوتا جس کے لئے ابھی تک وہاں صرف پرجوش الفاظ بولے جارہے ہیں ـــــ جن لوگوں کے اندر کافرانہ نظام قائم کرنے کی بھی صلاحیت نہیں وہ اسلامی نظام قائم کرنے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ آسمان نے اس سے زیادہ عجیب منظر شاید کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔

انتہاپسندی کا نتیجہ

موجودہ زمانہ میں جو اسلامی تحریکیں اٹھیں وہ اپنے بیان کردہ مقصد (اسلامی نظام کا قیام) کو تو حاصل نہ کرسکیں البتہ انھوں نے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو ایک عظیم مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ ان تحریکوں کے پیدا کردہ نام نہاد انقلابی مزاج کی بنا پر موجودہ مسلمانوں کا یہ حال ہو رہا ہے کہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ساری دنیا میں ان کے لئے صرف دو میں سے ایک کا انتخاب ہے۔ یا ہلاکت یا منافقت۔ یا تو وہ حاصل نہ ہونے والے ایک نشانہ کے لئے نظام حاضر سے لڑکر اپنے آپ کو تباہ کریں۔ یا نظام حاضر کو باطل سمجھتے ہوئے منافقانہ طور پر اس کے ساتھ موافقت کرکے رہیں۔ دین رحمت خود مسلمانوں کے لئے دین زحمت بن گیا۔

ان انقلابی تحریکوں نے یہ غلطی کی کہ عقیدہ اور سیاسی نظام کو ایک کر دیا۔ اسلام میں عقیدہ اور انفرادی طور پر متقیانہ عمل ہر شخص سے ہر حال میں مطلوب ہے۔ جہاں تک اجتماعی سیاسی نظام کا تعلق ہے، اس کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اسلام کے سیاسی نظام کو قائم کرنے کی ذمہ داری صرف اس وقت مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے جب کہ وہ بالفعل اس کو قائم کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ ورنہ سیاسی نظام کو قائم کرنا اسی طرح مسلمانوں کے لئے غیر مطلوب رہے گا جس طرح صاحب نصاب نہ ہونے کی صورت میں کسی مسلمان سے زکاۃ کی ادائیگی غیر مطلوب رہتی ہے۔

قرآن و حدیث کے مطابق یہی اسلام ہے۔ اس میں مسلمان کسی ایسی چیز کے مکلف نہیں قرار پاتے جو ان کے بس میں نہ ہو۔ وہ ہر ماحول میں اس اساسی اسلام کو اختیار کرکے مطمئن رہ سکتے ہیں کہ وہ اللہ کے دین پر قائم ہیں۔

لیکن اسلام کی نام نہاد انقلابی تفسیر نے مسلمانوں کے اندر یہ ذہن بنایا کہ صرف عقیدہ اور انفرادی کردار نجات کے لئے کافی نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ لازمی طور پر ضروری ہے کہ وہ باطل قوتوں سے لڑکر ساری دنیا میں اسلامی قانون کی حکومت قائم کریں۔ اس خود ساختہ نظریہ نے مسلمانوں کو ہر جگہ قائم شدہ حکومتوں سے ٹکرا دیا۔

چوں کہ مسلمان کہیں بھی طاقتور پوزیشن میں نہیں ہیں اس لئے اس بنا پر ان کے لئے صرف

دو میں سے ایک راہ باقی رہ گئی۔ یا تو اقتدار وقت سے ٹکرائیں اور اپنی کمزوری کی بنا پر یکطرفہ طور پر اپنے آپ کو ہلاک کریں یا مذکورہ عقیدہ کو ذہن میں بدستور باقی رکھتے ہوئے خارجی رویہ کے اعتبار سے منافق ہو جائیں۔ یعنی جس نظام کو وہ باطل اور حرام سمجھتے ہیں اس سے محض ذاتی مفاد کی خاطر مصالحت کرلیں۔

نیز ایسے انتہا پسند لوگ ہمیشہ بہت کم ہوتے ہیں جو جانتے بوجھتے اپنے آپ کو ہلاکت کے راستہ پر ڈالیں۔ چنانچہ تھوڑے سے سرپھرے قسم کے افراد نے ہر جگہ اپنے آپ کو ہلاکت خیز ٹکراؤ کے راستہ پر ڈال رکھا ہے۔ مگر ان کے سوا لوگوں کی اکثریت نے منافقانہ رویہ کو ترجیح دی ہے۔ وہ ہر ملک میں یہ کر رہے ہیں کہ اپنے ذہن میں یا نجی ملاقاتوں میں تو مروجہ نظام اقتدار کو باطل بتاتے ہیں مگر خارجی دنیا میں اسی باطل نظام کے ساتھ مکمل مصالحت کئے رہتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس کے بغیر انھیں عزت اور راحت کی زندگی نہیں مل سکتی۔

ہندستان میں بھی ایک اعتبار سے یہی صورت حال قائم ہے۔ مسلم لیگی قائدین نے نہایت بے معنی طور پر ہندو مسلم نفرت کا مزاج پیدا کیا۔ بعد کو جو مسلم لیڈر ان کے جانشین ہوئے انھوں نے بھی صرف اس مزاج کو پختہ کرنے میں مدد کی۔ اب نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان دو طرفہ مشکل میں مبتلا ہیں۔ ایک بہت محدود تعداد خفیہ یا علانیہ طور پر ہندوؤں سے بے نتیجہ ٹکراؤ میں مشغول ہے۔ کیوں کہ اس نے اس ٹکراؤ کو بزعم خود جہاد سمجھ رکھا ہے۔ مگر ہندستانی مسلمانوں کی بیشتر تعداد وہ ہے جو ظاہری طور پر ہندوؤں سے مل جل کر رہنا پسند کرتی ہے۔ ان کا ذہن تو وہی ہے جو پہلے گروہ کا ہے لیکن وہ محسوس کرتے ہیں کہ ہندو اکثریت سے نفرت اور ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کر کے وہ اس ملک میں راحت اور عافیت کی زندگی نہیں بنا سکتے۔ اس لئے خالص مصلحت کی بنا پر، نہ کہ اصول کی بنا پر انھوں نے ہندو اکثریت سے ظاہری میل ملاپ کا طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔

یہ ایک خود عائد کردہ ذہنی عذاب ہے جس کو بہت سے لوگوں نے اپنے اوپر لاد رکھا ہے، خدا و رسول کے دین سے اس کا کوئی بھی تعلق نہیں۔

الحاد

قرآن میں گمراہی کی جو صورتیں بتائی گئی ہیں ان میں سے ایک الحاد ہے۔ الحاد کے معنی انحراف یا نشانہ سے ہٹنے کے ہیں۔ عربی میں کہتے ہیں الحد السھمُ الھدفَ (تیر نشانہ کے ایک جانب لگا) اسی مناسبت سے بغلی قبر کے لیے لحد یا ملحود کا لفظ بولا جاتا ہے۔

قرآن میں یہ مادہ چار مقام پر استعمال ہوا ہے۔

۱۔ سورہ اعراف میں ارشاد ہوا ہے کہ ان لوگوں کو چھوڑو جو اللہ کے نام میں الحاد کرتے ہیں۔ (وذروا الذین یلحدون فی اسمائہ۔ ۱۸۰) خدا کے نام میں الحاد کی ایک صورت یہ ہے کہ اس کو جسمانی نام دیے جائیں۔ خدا نے خود اپنے کچھ نام بتائے ہیں۔ مثلاً رحمان، رحیم وغیرہ۔ مگر جن لوگوں پر حسیت کا غلبہ ہو وہ خدا کو محسوس پیکر میں ڈھالنے کے لیے اس کا کوئی جسمانی نام رکھ لیتے ہیں۔

قدیم عرب کے بڑے بڑے بُت اسی اصول پر خدا کے جسمانی نام تھے۔ انھوں نے خدا کے سچے ناموں میں "انحراف" کرکے کچھ نئے نام بنا لیے اور خود ساختہ بتوں کو یہ نام دے کر کہا کہ یہ بُت خدا سے الگ نہیں ہیں بلکہ اس کا محسوس اظہار ہیں:

ای اترکوا الذین یمیلون فی اسمائہ تعالیٰ عن الحق کما فعل المشرکون حیث اشتقوا لآلھتھم اسماء منھا کاللات من اللہ والعزیٰ من العزیز ومناۃ من المنّان (صفوۃ التفاسیر)

یعنی ان لوگوں کو چھوڑو جو اللہ کے ناموں میں حق سے انحراف کرتے ہیں۔ جیسا کہ عرب کے مشرکوں نے کیا۔ انھوں نے خدا کے ناموں سے اپنے بتوں کے نام نکالے۔ مثلاً لات اللہ سے اور عزّیٰ عزیز سے اور منات منّان سے۔

۲۔ سورہ نحل میں الحاد کا لفظ ان لوگوں کے ذیل میں آیا ہے جو یہ کہتے تھے کہ قرآن خدا کا کلام نہیں ہے بلکہ محمدؐ نے بعض عجمی غلاموں سے سیکھ کر اس کو تصنیف کر لیا ہے (انھم یقولون انما یعلمہ بشر لسان الذی یلحدون الیہ اعجمی وھذا لسان عربی مبین۔ ۱۰۳) یعنی وہ بات کو صحیح اور سچے رُخ سے موڑ کر غلط رُخ پر لے جا رہے ہیں۔ جس کلام کو خدا کی طرف منسوب کرنا چاہیے اس کو انسان کی طرف منسوب کرتے ہیں (والمعنی یمیلون قولھم عن الصدق والاستقامۃ

الیہ ، التفسیر المظہری)

۳۔ سورہ حم السجدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ جو لوگ ہماری آیتوں میں کج روی اختیار کرتے ہیں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں (ان الذین یلحدون فی ایاتنا لایخفون علینا۔ ۴۰) اس سے مراد قرآنی آیتوں کی تاویل میں انحراف ہے۔ یعنی وہ آیات کو حق سے موڑ دیتے ہیں۔ اور دلیلوں کو غلط رُخ دے کر طعن وتشنیع کرتے ہیں (یمیلون عن الحق فی ادلتنا بالطعن ، تفسیر النسفی)

۴۔ سورہ حج میں کہا گیا ہے کہ جو شخص شرارت کی وجہ سے مسجد حرام میں ٹیڑھی راہ نکالے گا اس کو ہم سخت سزا دیں گے (ومن یرد فیہ بالحاد بظلم نذقہ من عذاب الیم۔ ۲۵) یعنی جو شخص مسجد حرام میں کوئی برائی چاہے گا یا سیدھے طریقے سے انحراف کرے گا یا کسی معصیت کا قصد کرے گا تو اس کو ہم شدید قسم کا عذاب دیں گے (ای ومن یرد فیہ سوءاً او میلاً عن القصد او یھم بمعصیۃ نذقہ اشد انواع العذاب ، صفوۃ التفاسیر)

الحاد، قرآن کے مطابق، یہ ہے کہ آدمی بظاہر دین کا لفظ بولے مگر غلط تاویل سے اس کے رُخ کو بے رخ کر دے۔ اس کو خدا اور رسول کے مطلوب مفہوم میں لینے کے بجائے کسی خود ساختہ مفہوم میں لینے لگے۔

اس کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ ذاتی حکم کو اجتماعی حکم بنا دے۔ ایک حکم جس کا رُخ آدمی کی اپنی طرف ہو، اس کو پھیر کر وہ دوسروں کی طرف کر دے۔ مثلاً قرآن میں ارشاد ہوا ہے : وربك فكبّر وثيابك فطهّر (اپنے رب کی بڑائی کر اور اپنے اخلاق کو پاک کر) اب آدمی اگر یہ کرے کہ وثیابك فطهّر کو وثیاب غیرك فطهّر کے معنی میں لے لے اور دوسروں کے اوپر اخلاقی داروغہ بن کر کھڑا ہو جائے تو یہ مذکورہ آیت میں الحاد کرنے کے ہم معنی ہوگا۔

اسی طرح "اللہ بڑا ہے" بلاشبہ اس کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ مگر وہ اس وقت گمراہی بن جاتی ہے جب کہ آدمی اس میں الحاد کر کے اس کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگے۔ وہ اس کا حوالہ دے کر اپنے سیاسی حریفوں کو گرانے اور اکھاڑنے میں لگ جائے۔ "اللہ بڑا ہے اس لیے میں بڑا نہیں ہوں" کہنا قرآن کی تعلیم کو صحیح رُخ سے لینا ہے۔ "اللہ بڑا ہے اس لیے تم بڑے نہیں ہو" کا نعرہ لگانا قرآن کی تعلیم کو غلط رُخ سے لینا ہے۔

دین میں تحریف

دین میں تحریف کا ایک سبب یہ ہے کہ متاثر ذہن کے تحت دین کی تشریح کرنے کی کوشش کی جائے۔ قدیم زمانہ مائتھالوجی (mythology) کا زمانہ تھا۔ اس کے تحت مشرک قوموں میں تجسد یا تجسیم (incarnation) کا عقیدہ رائج ہوگیا۔ مثلاً رومی اور یونانی سورج کو دیوتا قرار دے کر اس کو پوجتے تھے اور اس کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔

یہود و نصاریٰ نے بھی اپنے بگاڑ کے زمانہ میں اس عقیدہ کو اپنے مذہب میں داخل کر لیا۔ عزیر اور مسیح کو پیغمبر کہنا انھیں رومیوں اور یونانیوں کے خدائی باپ (divine fatherhood) کے نظریہ کے مقابلہ میں کمتر محسوس ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے پیغمبروں کو خدا کا بیٹا بنا دیا۔ مشرک قوموں کی زبان کو اپنا کر وہ کہنے لگے کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور مسیح خدا کے بیٹے ہیں (التوبہ ۳۰)

قرآن میں اس مذہبی تقلید کو مضاہاۃ کہا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ یہود و نصاریٰ ان لوگوں کی بات نقل کر رہے ہیں جنھوں نے خدا کے ساتھ کفر کیا ہے۔ اللہ انھیں غارت کرے، یہ لوگ اپنی گمراہی میں کدھر بھکے جا رہے ہیں (التوبہ ۳۰)

مضاہاۃ کی یہ گمراہی موجودہ زمانہ میں ایک اور صورت میں مسلمانوں کے اندر داخل ہوگئی ہے۔ وہ ہے اسلام کو "نظام" کی اصطلاحوں میں بیان کرنا۔ مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقہ کے بہت سے لوگ نظامی طرز فکر سے متاثر ہیں۔ مگر یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہی گمراہی ہے جس میں پچھلی امتیں گمراہ قوموں کے زیر اثر مبتلا ہوئیں۔

موجودہ زمانہ میں سوشلزم اور ڈیموکریسی جیسے سماجی اور سیاسی نظریات ظاہر ہوئے۔ ان کے اثر سے یہ ہوا کہ جدید انسان نظامی انداز میں سوچنے لگا۔ فرد کی نجات اس کو اس میں نظر آنے لگی کہ اجتماعی ڈھانچہ میں انقلابی تبدیلیاں لائی جائیں۔ دوبارہ ایسا ہوا کہ مسلمانوں کو اسلام کا روایتی تصور کمتر دکھائی دینے لگا۔ انھوں نے اپنے آپ کو وقت کے ہم سطح بنانے کے لیے یہ کہنا شروع کیا کہ اسلام ایک سیاسی نظام ہے۔ وہ اجتماعی انقلاب کا علمبردار ہے، وغیرہ۔

وہ چیز جس کو موجودہ زمانہ میں انقلابی تفکیر کہا جاتا ہے۔ وہ مبنی بر نظام (system-based)

تفکیر ہے۔ مگر اسلامی تفکیر، اس کے برعکس، مبنی بر فرد (individual-based) تفکیر ہے۔ اسلامی دعوت کا نشانہ نظام نہیں ہوتا۔ اسلامی دعوت کا اصل نشانہ فرد ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق، نظام کو نشانہ بنا کر تحریک چلانا گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا ہے۔ کیونکہ نظام بذات خود کوئی چیز نہیں۔ اس دنیا میں فرد سے نظام بنتا ہے، نظام سے فرد کی تشکیل نہیں ہوتی۔

موجودہ زمانہ میں "نظامی" انداز کی نام نہاد اسلامی تحریکوں سے اسلام کو بے پناہ نقصانات پہونچے ہیں۔ اس کا پہلا نقصان یہ ہے کہ قرآن کی وہ تمام آیتیں جن میں فرد کی شعوری اور روحانی غذا تھی، اس کو غلط تفسیر کے ذریعہ نظام اور خارجی انقلاب سے جوڑ دیا گیا۔ سیاست بلاشبہ اسلام کا ایک جزء ہے۔ مگر سیاسی مسئلہ کا ان آیتوں سے کوئی تعلق نہیں جن سے اس مسئلہ کو انتہائی جسارت کے ساتھ جوڑا جا رہا ہے۔

مثلاً قرآن میں حکم تھا کہ وربّك فكبّر (اپنے رب کی تکبیر کر) اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی عظمت کا اعتراف کر۔ اللہ کی عظمت و کبریائی کو اپنے دل و دماغ میں اتار لے۔ مگر نظام پسند ذہن نے اس کی سیاسی تفسیر کر ڈالی۔ یہ کہہ دیا گیا کہ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں خدا کی سیاسی بڑائی قائم کرو۔ سیاست کے ایوان پر خدائی اقتدار کا جھنڈا لہرا دو۔ اسی طرح بہت سی دوسری آیتوں کی غلط تفسیر کی گئی۔

اس طرح کی تفسیریں بلاشبہ مضاہاۃ (التوبہ ۳۰) ہیں۔ مزید یہ کہ ان تفسیروں نے تواضع کے دین کو سرکشی کا دین بنا دیا ہے۔ انھوں نے امت کے افراد میں تعمیری ذہن کے بجائے تخریب کاری کا ذہن ابھارا ہے۔ جو دین خوف خدا پیدا کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا، وہ ان تحریکوں کے نتیجہ میں بے خوفی کا مزاج پیدا کرنے کا کارخانہ بن گیا ہے۔

اختلافِ امّت

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہود ۷۱ فرقوں میں بٹ گیے۔ اور نصاریٰ ۷۲ فرقوں میں بٹ گیے۔ اور میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی (افترقت الیھود علی احدی وسبعین فرقۃ وافترقت النصاریٰ علی اثنتین وسبعین فرقۃ۔ و ستفترق امتی علیٰ ثلاث وسبعین فرقۃ)

علمار سنت نے اس حدیث کی صحت پر کلام کیا ہے۔ تاہم، جیساکہ المقبلی نے اپنی کتاب العلم الشامخ میں لکھا ہے، اس بارے میں کثیر روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں جو ایک دوسرے کو مضبوط کرتی ہیں، اس لیے اس کے اصل مفہوم میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا (حدیث افتراق الامۃ الیٰ ثلاث وسبعین فرقۃ روایاتہ کثیرۃ یشد بعضھا بعضاً بحیث لاتبقی ریبۃ فی حاصل معناہ)

اکثر لوگوں نے ۷۳ کی تعداد کو حسابی گنتی کے معنی میں لیا ہے، چنانچہ انھوں نے مسلم فرقوں کی فہرست بنانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ابن حزم شہرستانی نے اپنی کتاب الملل والنحل میں ان کی تعداد ۷۶ بتائی ہے۔ الاشعری نے مقالات الاسلامیین میں ان کی تعداد ایک سو سے زیادہ تک شمار کی ہے۔ الخوارزمی کے نزدیک ان فرقوں کی تعداد ۷۲ ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو دکتور محمد عمارۃ کی کتاب الخلافۃ ونشأۃ الاحزاب الاسلامیۃ) مگر حقیقت یہ ہے کہ حدیث میں ۷۳ کا لفظ تعداد کی کثرت بتانے کے لیے آیا ہے نہ کہ تعداد کی حد بتانے کے لیے۔ اس لیے ہمیں تعداد کا شمار کرنے کے بجائے اختلاف کی اصل حقیقت پر غور کرنا چاہیے۔

صحابہ کی رائے

ان مسألۃ الخلاف بین المسلمین ارقت امیر المومنین عمر بن الخطاب فی لحظۃ تامل وتفکر، فظل یسأل نفسہ: کیف تختلف ھذہ الامۃ ونبیھا واحد؟ ثم اعاد طرح السوال علیٰ عبد اللہ بن عباس، فیما تشیر الروایۃ، وقال لہ: کیف تختلف ھذہ الامۃ ونبیھا واحد، وقبلتھا واحدۃ، وکتابھا واحد۔

ردابن عباس قائلا، یا امیر المومنین انما انزل علینا القرآن فقرأناه وعلمنا فیما انزل، وانہ سیکون بعدنا اقوام یقرأون القرآن ولا یدرون فیما نزل، فیکون لکل قوم رأی. فاذا کان لکل قوم فیہ رای لاختلفوا فاذا اختلفوا اقتتلوا ـ تقول الروایۃ ان سیدنا عمر نہر ابن عباس ونہرہ سیدنا علی: فانصرف ابن عباس ونظر عمر فیما قال فعرفہ.... فارسل الیہ وقال: اعد علی ما قلتہ فاعاد علیہ فعرف عمر قولہ واعجبہ (د.. یوسف القرضاوی ـ العمدۃ الاسلامیۃ ص ۸۹ نقلاً عن مصادر اخری)

مسلمانوں کے باہمی اختلاف کے معاملہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فکر میں مبتلا کر دیا۔ وہ اپنے آپ سے سوال کرتے رہے کہ یہ امت کیوں کر مختلف اور متفرق ہو جائے گی جب کہ اس کا پیغمبر ایک ہے جیسا کہ روایات بتاتی ہیں، انھوں نے اس سوال کو عبداللہ بن عباس کے سامنے رکھا اور ان سے کہا کہ یہ امت کیسے مختلف ہو جائے گی جب کہ اس کا پیغمبر ایک ہے اور اس کا قبلہ ایک ہے اور اس کی کتاب ایک ہے۔ عبداللہ بن عباس نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ اے امیر المومنین ہمارے اوپر قرآن اترا، پھر ہم نے اس کو پڑھا اور یہ جانا کہ وہ کس بارہ میں اترا ہے۔ اور ہمارے بعد ایسے لوگ ہوں گے جو قرآن کو پڑھیں گے مگر وہ نہیں جانیں گے وہ کس بارہ میں اترا ہے۔ چنانچہ ہر ایک کی الگ الگ رائے ہو جائے گی، اور جب ہر ایک کی الگ رائے ہوگی تو وہ اختلاف کریں گے اور جب اختلاف کریں گے تو آپس میں لڑیں گے۔ روایت کہتی ہے کہ حضرت عمر نے عبداللہ بن عباس کو جھڑک دیا اور حضرت علیؓ نے بھی ان کو ڈانٹا۔ وہ واپس چلے گیے۔ پھر حضرت عمرؓ نے ان کے قول پر غور کیا تو وہ سمجھ گیے۔ حضرت عمر نے دوبارہ انھیں بلایا اور کہا کہ اپنے قول کو دہراؤ۔ انھوں نے دہرایا۔ حضرت عمر ان کے قول کو سمجھ گیے اور اس کو پسند کیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے جو بات کہی اور حضرت عمر نے جس کی تصدیق فرمائی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کو پڑھنے کے دو درجے ہیں۔ ایک ہے معرفت کے ساتھ پڑھنا، اور دوسرا ہے معرفت کے بغیر پڑھنا۔ جو شخص معرفت کی سطح پر قرآن کو پڑھے، وہی قرآن کو حقیقی طور پر سمجھے گا، اور جو شخص معرفت کے بغیر قرآن کو پڑھے وہ پڑھنے کے باوجود قرآن کو سمجھنے سے قاصر رہے گا۔

غلط فہمی

لندن یونیورسٹی کے ڈاکٹر پیٹر ہارڈی (Peter Hardy) کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے برطانوی ہند کے مسلمان *The Muslims of British India* اس کتاب کے ایک باب میں مصنف نے کہا ہے کہ ملک کی تقسیم نے مسلمانوں کے مسئلہ کو حل نہیں کیا۔ یہ بتاتے ہوئے کہ مسلمانوں کے نزدیک اسلام ایک مکمل نظام ہے، انھوں نے موجودہ ہندستان کے مسلمانوں سے ایک سوال کیا ہے جو ان کے الفاظ میں یہ ہے :

> Whether in wanting to be accepted as a fellow-citizen on equal terms with his non-Muslim compatriots he is obeying or disobeying Divine Commands.

مسلمانوں کا یہ چاہنا کہ وہ اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کے ساتھ برابر کی شرائط پر یکساں درجہ کے شہری تسلیم کیے جائیں، یہ خدا کے حکم کی فرماں برداری ہے یا اس کی نافرمانی (ٹائمس آف انڈیا، ۸ اپریل ۱۹۸۸)

جو لوگ اسلام کی تعبیر "مکمل نظام" کے الفاظ میں کرتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ یہ مکمل نظام ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے، ان کے لحاظ سے یہ سوال بے حد اہم ہے۔ ان حضرات کے بیانات کے مطابق وہ شخص اسلام کا ناقص پیرو قرار پاتا ہے جو اعتقادی اسلام کو اختیار کرے مگر سیاسی اسلام کو اختیار نہ کرے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ شخص ناقص عبادت گزار ہے جو نماز پڑھے اور روزہ نہ رکھے۔ اب اگر واقعۃً اسلام یہی ہو تو "ہندو انڈیا یا سیکولر ہندستان" میں مسلمانوں کے لیے برابری کا دستوری اور قانونی حق مانگنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ مذکورہ تعبیر کے مطابق یہ "باطل نظام" میں حصہ داری کا مطالبہ کرنا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہندستان کے مسلمان یہ مانگ کرنے لگیں کہ ہم کو ملک کے بت خانوں کے اندرونی نظام میں برابر کا شریک بنایا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ نام نہاد مفکرین کی مذکورہ اسلامی تعبیر کا لازمی نتیجہ وہی نکلتا ہے جس کی طرف ڈاکٹر ہارڈی نے طنزیہ طور پر اشارہ کیا ہے۔ کیوں کہ اس تعبیر کے مطابق، مسلمان کسی دوسرے نظام میں صرف باغی کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں۔ وہ ایسے کسی نظام میں وفادار یا شریک کار بن کر نہیں رہ سکتے۔ مگر اسلام کی یہ تعبیر سراسر خود ساختہ ہے جس سے اسلام بری ہے۔

یہ نام نہاد " کامل تعبیر" کچھ شاعروں اور انشاپردازوں کے ذہن کی پیداوار ہے، اس کا قرآن وحدیث سے کوئی تعلق نہیں۔

اس موضوع پر راقم الحروف نے اپنی کتاب " تعبیر کی غلطی " میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اور علمی دلائل سے اسے رد کر دیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کامل سپردگی (Total Submission) کا نام ہے نہ کہ کامل نظام (Total system) کا۔ ایک شخص جو اللہ پر ایمان لائے اس کو اپنی سوچ، اپنے جذبات، اپنے کردار اور اپنی عبادت گزاری میں کامل طور پر خدا کا فرمانبردار ہونا چاہیے۔ بحیثیت ایک فرد کے اس کو پوری طرح خدا کا بندہ بن کر رہنا چاہیے۔ حتیٰ کہ جو شخص سیاسی اقتدار کی کرسی پر ہو، وہ بھی اپنی انفرادی حیثیت ہی میں اللہ کے یہاں جواب دہ ہے نہ کہ اجتماعی حیثیت میں۔

جہاں تک اجتماعی نظام کا تعلق ہے، اس کا معاملہ اس سے بالکل الگ ہے۔ انفرادی احکام علی الاطلاق مطلوب ہیں۔ جب کہ اجتماعی احکام حالات کی نسبت سے مطلوب ہوتے ہیں۔ ایک شخص اگر اپنے انفرادی اختیار کے دائرہ میں اسلامی احکام کو اختیار کر لے تو وہ کامل مسلم ہو گیا۔ اس کے اسلام کی تکمیل اس پر منحصر نہیں کہ وہ انفرادی اختیار کے دائرہ سے باہر اجتماعی اختیار کے دائرہ میں بھی لازماً اسلام کی پیروی کرے۔

اس معاملہ کو زکواۃ کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ زکواۃ مسلمان کے اوپر اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز فرض ہے۔ مگر دونوں کے درمیان ایک بنیادی فرق ہے۔ نماز ایک ایسا حکم ہے جس کی ادائیگی ہر حال میں لازم ہے۔ نماز ایک مسلمان سے کسی حال میں ساقط نہیں ہوتی۔ مگر زکواۃ کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ایک شخص اگر صاحب نصاب ہو تو اس کے لیے زکواۃ کی ادائیگی ضروری ہوگی۔ مگر جو شخص صاحب نصاب نہ ہو اس پر نہ زکواۃ کی ادائیگی واجب ہے، اور نہ یہ واجب ہے کہ وہ کمائی کر کے صاحب نصاب بنے تاکہ وہ قرآنی حکم کے مطابق زکواۃ ادا کر سکے۔

مذکورہ ذہن کے لوگ ہندستان کو غلبۂ کفر کا ملک سمجھتے ہیں۔ مگر یہ سراسر جہالت ہے۔ ہندستان ایک سیکولر ملک ہے۔ دستور کے مطابق یہاں ہر مذہب کو یکساں طور پر آزادی حاصل ہے۔ یہاں کی حکومت مذہبی امور میں عدم مداخلت کی پابند ہے۔ اس لیے صحیح بات یہ ہے کہ ہندستان سیاسی اعتبار سے، غلبۂ ناطرفداری کا ملک ہے نہ کہ غلبۂ کفر کا ملک۔

اسلامی شناخت

ہندستان کی فرقہ پرست ہندو جماعتیں اگر یہ مطالبہ کریں کہ مسلمان اکثریت کا لباس (مثلاً دھوتی کرتا) پہنیں یا دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کریں تاکہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا ہو، تو تمام مسلم رہنما چیخ اٹھیں گے۔ وہ کہیں گے کہ یہ ہمارے قومی تشخص کو ختم کرنے کی اسکیم ہے، اور ہم کبھی اس پر راضی نہ ہوں گے۔

یہ قومی تشخص کے بارہ میں مسلم رہنماؤں کی حساسیت کا حال ہے۔ مگر یہی رہنما اسلامی تشخص کے بارہ میں بالکل بے حس بنے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں بہت بڑے پیمانہ پر اپنے اسلامی تشخص کو ختم کر رکھا ہے، مگر اس کے بارہ میں ہمارے رہنما کوئی مہم نہیں چلاتے۔ شاید اس لیے کہ "قومی تشخص" کے لیے خطرہ غیر قوم کی طرف سے ہے، اس لیے اس مسئلہ پر مسلمانوں کی بھیڑ جمع کی جاسکتی ہے۔ مگر "اسلامی تشخص" کو مٹانے والے خود مسلمان ہیں، اس لیے اس مسئلہ پر مسلمانوں کی بھیڑ جمع کرنا ممکن نہیں۔

اسلامی تشخص کے پہلو سے ایک مثال لیجئے۔ قرآن میں اہل ایمان کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ جب وہ لغو بات کو سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں (القصص ۵۵ نیز الفرقان ۷۲)۔ اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ نادان لوگ جب برے قول کے ذریعہ ان کے خلاف نادانی کرتے ہیں تو وہ برے قول کے ساتھ ان کا جواب نہیں دیتے۔ بلکہ وہ ان کو معاف کر دیتے ہیں اور ان سے درگزر کرتے ہیں۔ وہ بھلی بات کے سوا اور کچھ نہیں کہتے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال تھا کہ جاہل کی شدت صرف آپ کے حلم اور بردباری کو بڑھاتی تھی (تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث، صفحہ ۳۲۴-۲۵)

یہی بات دوسری جگہ اس طرح کہی گئی ہے کہ اہل ایمان وہ ہیں کہ جب کسی لغو اور بے ہودہ چیز سے ان کا گزر ہوتا ہے تو وہ سنجیدگی کے ساتھ اس سے گزر جاتے ہیں (الفرقان ۷۲)۔ اس کی تشریح مقاتل نے یہ کی ہے کہ اہل ایمان جب کافروں سے گالی اور اذیت کی بات سنتے ہیں تو وہ اس سے اعراض کرتے ہیں اور اس سے درگزر کرتے ہیں (واذا سمعوا من الکفار الشتم والاذیٰ اعرضوا وصفحوا، التفسیر المظہری، المجلد السابع، صفحہ ۵۴)

ان آیات اور اس طرح کی دوسری آیتوں اور حدیث کے مطابق، اہل ایمان کا اسلامی تشخص یہ ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کی طرح سب وشتم کرنے والوں سے الجھتے نہیں، بلکہ وہ ایسی باتوں کو نظر انداز کرتے

ہیں۔ وہ ایسے مقام سے متانت کے ساتھ گزر جاتے ہیں جہاں ان کے خلاف اذیت ناک باتیں کی جارہی ہوں۔

اب اس قرآنی حکم کی روشنی میں جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس ملک کے مسلمانوں نے اس اعتبار سے اپنا اسلامی تشخص بالکل کھو دیا ہے۔ اس معاملہ میں انھوں نے اپنی اسلامی شناخت کو باقی نہیں رکھا ہے۔

اس ملک میں بار بار ایسا ہو رہا ہے کہ ہندستان کی غیر مسلم اکثریت کے لوگ اپنا جلوس نکالتے ہیں۔ اس میں وہ وہی فعل کرتے ہیں جس کو قرآن میں "جہالت" کہا گیا ہے۔ وہ اپنا جلوس اس سڑک سے لے جاتے ہیں جو کسی مسلم محلہ سے گزرتی ہو۔ وہ اپنے جلوس میں ایسے نعرے لگاتے ہیں جو مسلمانوں کے لیے اذیت کا باعث ہوں۔

ایسے موقع پر مسلمان کیا کرتے ہیں۔ وہ جلوس کو روکنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ ان کے نعروں پر مشتعل ہو کر مختلف قسم کی جوابی کارروائیاں کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا یہ ردعمل سراسر اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔ جس موقع پر قرآن نے واضح طور پر صبر واعراض کا حکم دیا ہے، وہاں وہ جوابی اشتعال کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس طرح مسلمانوں نے اس معاملہ میں اپنے اسلامی تشخص کو مکمل طور پر ختم کر رکھا ہے۔

یہ بلاشبہ لباس کے معاملہ میں اپنے قومی تشخص کو چھوڑنے سے بہت زیادہ بڑا مسئلہ ہے۔ مگر یہاں تمام مسلم رہنما خاموش ہیں۔ ان مواقع پر وہ مسلمانوں سے نہیں کہتے کہ تم قرآنی حکم پر قائم رہو اور اس معاملہ میں اپنی اسلامی شناخت کو نہ چھوڑو۔

موجودہ مسلم رہنماؤں کا حال یہ ہے کہ وہ قومی شناخت بمقابلہ ہندو کے تحفظ پر خوب بولتے ہیں، مگر اسلامی شناخت بمقابلہ مسلمان کے مسئلہ پر کچھ نہیں بولتے۔ رہنماؤں کی یہ کوتاہی بلاشبہ جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اپنی اس روش سے وہ موجودہ مسلمانوں کے درمیان اپنی مقبولیت کو باقی رکھنے میں کامیاب ہیں۔ مگر سخت اندیشہ ہے کہ ان کی یہ روش خدا کے یہاں ان کو غیر مقبول بنا دے۔ اور پھر کوئی بھی لفظی مہارت ان کو بری الذمہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہ ہو۔

ایک مثال

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ تیرھویں صدی قبل مسیح کا زمانہ ہے۔ آپ کی پرورش قدیم مصر کی راجدھانی ممفس (Memphis) میں ہوئی۔ اس زمانہ میں مصر میں دو قومیں آباد تھیں۔ ایک قبطی جو ملک کا اکثریتی فرقہ تھا۔ فرعون اسی فرقہ کا ایک فرد تھا جس کا خاندان اس زمانہ میں مصر میں حکومت کر رہا تھا۔ دوسرا فرقہ وہ تھا جس کو بنی اسرائیل (یہود) کہا جاتا ہے۔ یہ فرقہ نہ صرف اقلیت میں تھا بلکہ حکمراں اکثریتی فرقہ اس کو زبردست ظلم وستم کا نشانہ بنائے ہوئے تھا۔ وہ مصر میں پست طبقہ کی حیثیت رکھتے تھے اور محنت مزدوری کے ذریعہ اپنی روزی حاصل کرتے تھے۔ مزید یہ کہ اگر بنی اسرائیل میں کوئی نوجوان اعلیٰ صلاحیت کا نظر آتا تو فرعون (شاہِ مصر) اس کو قتل کرا دیتا تاکہ وہ بنی اسرائیل کا قائد بن کر حکمراں طبقہ کے لیے کوئی مسئلہ نہ کھڑا کرے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اگرچہ اسرائیلی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا فرمائے کہ آپ کی پرورش شاہ مصر (فرعون) کے محل میں ہوئی۔ جب آپ بڑے ہوئے تو آپ کو اپنی قوم (بنی اسرائیل) کا حال معلوم ہوا۔ غالباً ۲۵ سال کی عمر تھی۔ ایک روز آپ شہر میں نکلے تو آپ نے یہ منظر دیکھا کہ دو آدمی ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک قبطی تھا اور دوسرا اسرائیلی۔ اسرائیلی نے حضرت موسیٰ کو اپنی قوم کا ایک فرد سمجھ کر اپنی مدد کے لیے پکارا۔ اس نے قبطی کو ظالم اور اپنے آپ کو مظلوم بتایا۔ حضرت موسیٰ نے اسرائیلی کی حمایت میں قبطی کو ایک گھونسہ مارا۔ آپ کا مقصد محض قبطی کا دفاع تھا، مگر گھونسہ ایسے مقام پر لگا کہ وہ قبطی مر گیا۔

قبطی نے اسرائیلی کو قتل نہیں کیا تھا، اس لیے اس کو قتل کرنا انصاف کے خلاف تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کو فوراً اپنی لغزش کا احساس ہوا۔ آپ نے کہا کہ یہ تو ایک شیطانی کام ہو گیا۔ شیطان انسان کو بہکا کر غلط کام کرواتا ہے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی نادانستہ غلطی پر معاف کر دیا۔ (القصص ۱۵-۱۶)

اس وقت آپ نے جو دعا کی اس میں آپ کی زبان سے یہ الفاظ بھی نکلے:

رب بما انعمت علیّ فلن اکون ظهیرا اے میرے رب، جیسا تونے مجھ پر فضل فرمایا تو
للمجرمین (القصص) اب کبھی میں مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا۔

چنانچہ اگلے دن جب حضرت موسیٰ دوبارہ شہر کی طرف نکلے تو آپ نے دیکھا کہ وہی اسرائیلی دوبارہ ایک اور قبطی سے لڑ رہا ہے۔ اس نے دوبارہ آپ کو مدد کے لیے پکارا۔ مگر اس کی بار بار کی لڑائی سے آپ نے یہ سمجھا کہ یہ شخص خود ہی غلط کار ہے اور وہ غیر ضروری طور پر دوسروں سے لڑتا رہتا ہے۔ چنانچہ آپ نے کہا کہ تم خود ایک کھلے ہوئے شریر آدمی ہو۔ یہ اسرائیلی اگرچہ آپ کی اپنی قوم کا آدمی تھا، مگر آپ نے دوبارہ اس کی مدد نہیں کی۔ جب آپ نے اس کی مدد نہیں کی تو اس اسرائیلی نے کل کے دن کا راز کھول دیا جو ابھی تک چھپا ہوا تھا۔ اس نے شور کر دیا کہ وہ موسیٰ ہی ہیں جنھوں نے کل کے دن اسی مقام پر ایک قبطی کو گھونسا مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ اسرائیلی کے اس فعل نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک کمینہ شخص ہے۔ کیوں کہ ایک کمینہ شخص ہی ایسا کر سکتا ہے کہ ایک ذاتی اختلاف پیش آنے کی بنا پر کسی کے نازک راز کو عوام کے سامنے کھولنے لگے۔

جب قتل کا راز کھل گیا تو مصر کے حکمراں گروہ نے آپ کو پکڑنا چاہا تاکہ آپ سے قبطی کے قتل کا انتقام لے۔ مگر آپ خاموشی کے ساتھ ممفس سے نکل کر مدین کی طرف روانہ ہو گیے۔ (القصص)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ جو قرآن میں نقل کیا گیا ہے۔ اس میں ہندستان کے موجودہ فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلہ میں نہایت اہم رہنمائی ملتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنانہ طریقہ یہ ہے کہ آدمی مجرم کا مددگار نہ بنے۔

ہندستان کے موجودہ حالات یہ ہیں کہ مسلمان یہاں اقلیت میں ہیں۔ وہ مختلف پہلوؤں سے اکثریتی فرقہ کے مقابلہ میں دبے ہوئے ہیں۔ اس بنا پر اکثر مسلم رہنما یہ فرض کر لیتے ہیں کہ یہاں کے فرقہ وارانہ جھگڑوں میں کبھی مسلمانوں کا قصور نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ کمزور فریق ہونے کی بنا پر وہ فریق ثانی سے لڑ کر جیت نہیں سکتے۔ مگر یہ مفروضہ غلط ہے۔ قرآن کی شہادت کے مطابق بنی اسرائیل نسبتاً زیادہ مغلوب ہونے کے باوجود مصر میں "مجرم" بن گیے۔ پھر مسلمان اس سے کمتر درجہ کی مغلوبیت کے باوجود یہاں مجرم کیوں نہیں بن سکتے۔

ایک اور امکان

آج کے جاپان کے بارہ میں ایک کتاب چھپی ہے۔ اس کا نام ہے " جاپان جو یہ کہہ سکتا ہے کہ نہیں"۔ اس کتاب کے لکھنے والے دو ممتاز جاپانی ہیں۔ ایک سنتارو اشی ہارا جو دو بار جاپان میں وزیر رہ چکے ہیں۔ دوسرے اکیو مورتیا جو عالمی شہرت یافتہ سونی کارپوریشن کے چیرمین ہیں :

The Japan That Can Say No,
by Shintaro Ishihara, and Akio Morita

اس کتاب میں بہت سی نہایت سبق آموز باتیں ہیں۔ ایک موقع پر مصنفین لکھتے ہیں کہ امریکی خواہ اپنی فوجی طاقت کتنا ہی زیادہ بڑھائیں، وہ اب ایک ایسی حد پر پہونچ چکے ہیں کہ وہ ہمارے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ اب وہ خود ہمارے ضرورت مند ہیں۔ جاپان اگر امریکہ سے یہ کہہ دے کہ ہم تمہارے ہاتھ اپنے چپس (chips) نہیں بیچیں گے تو امریکہ کی کمپیوٹر انڈسٹری متاثر ہو جائے گی۔ حتی کہ امریکہ اپنا جدید بمبار (stealth bomber) بھی جاپانی ٹکنولوجی کے بغیر نہیں بنا سکتا۔ اس قسم کی تفصیلات دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ اگر ایک شخص جاپان کے سیمی کنڈکٹر کو استعمال نہ کرے تو اس کے لیے درست کارکردگی کی کوئی ضمانت نہیں :

If one doesn't use Japanese semi-conductors,
one cannot guarantee precision.

یہی اس دنیا میں زندگی کا طریقہ ہے۔ اس دنیا میں زندگی کا مقام اس کو ملتا ہے جو اپنے آپ کو دوسروں کے لیے ناگزیر بنا دے۔ جو اپنے نفع بخش ہونے کو اس طرح ثابت کر دے کہ دوسرے لوگ اس کو اپنی ضرورت سمجھنے لگیں۔ کوئی شخص خود اپنا دشمن نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جو شخص یا گروہ اپنے آپ کو دوسروں کی ضرورت بنا دے، اس کو نظر انداز کرنا بھی کسی کے لیے ممکن نہیں۔

جاپان نے اپنی اہمیت مادی اور اقتصادی اعتبار سے ثابت کی ہے۔ یہی اہمیت زیادہ بڑے پیمانہ پر اسلام کے حق میں موجود ہے۔ جس طرح جاپان کی نفع بخشی کی بنا پر امریکہ یا دوسرے ممالک، اس کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اسلام میں دینی اور انسانی اعتبار سے جو غیر معمولی نفع بخشی موجود ہے، اگر دنیا کے لوگ

اس کو جان لیں تو ان کے لیے اسلام کو نظرانداز کرنا ممکن نہ رہے۔

یہ دوسری صورت اسلام کے حق میں اجارہ داری کی حد تک موجود ہے۔ انسان کا مطلوب دین اور انسانیت کی حقیقی فلاح اسلام کے سوا کسی اور مذہبی یا غیر مذہبی نظام میں موجود نہیں۔

اسلام آج اپنی خاموش زبان میں دنیا والوں سے کہہ رہا ہے کہ ـــــ اگر تم اللہ کی یاد کو اپنے سینہ میں جگہ نہ دو تو تم کو قلب و دماغ کا سکون نہیں مل سکتا۔ اگر تم توحید کے عقیدہ کو نہ مانو تو تم کائنات کی کوئی قابل فہم توجیہہ نہیں کر سکتے۔ اگر تم اسلام کو اختیار نہ کرو تو تم کہیں اور وہ مذہب نہیں پا سکتے جو مسلّمہ تاریخی واقعہ کی حیثیت رکھتا ہو۔

اسلام پکار کر کہہ رہا ہے کہ اگر تم اسلام کے تصورِ انسان پر ایمان نہ لاؤ تو تم کبھی سماج کے اندر برابری کا نظام قائم نہیں کر سکتے۔ اگر تم یوم الحساب کے عقیدہ کا اقرار نہ کرو تو انسانی اصلاح کے لیے تم کوئی دوسری فکری بنیاد وضع نہیں کر سکتے۔ اگر تم اسلامی تاریخ کو تسلیم نہ کرو تو اعلیٰ اخلاقی معیار کے لیے تم حقیقی انسانی نمونے کہیں اور نہیں پا سکتے۔

جاپان کے امکانات کو ایک جاندار قوم نے واقعہ بنایا۔ ایک ایسی قوم جو تمام ناخوش گواریوں پر صبر کرتے ہوئے چالیس سال جدوجہد کر سکتی تھی۔ اسی طرح اسلام کے عظیم تر امکانات کو واقعہ بنانے کے لیے بھی ایک زندہ قوم درکار ہے۔ مگر یہ زندہ قوم آج کہیں موجود نہیں۔ اس لیے اسلام کا امکان بھی جدید دنیا میں ابھی تک واقعہ نہ بن سکا۔

دین کے بدلے دنیا

ڈیڑھ ہزار برس پہلے ساری دنیا میں شرک کا غلبہ تھا۔ حتی کہ توحید کے گھر، کعبہ کو بھی بت خانہ بنادیا گیا تھا۔ اس وقت پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں "تحفظ کعبہ" کی مہم شروع کی۔ مگر مکہ کے لوگوں نے آپ کو حقیر بنادیا۔ یہاں تک کہ آپ کو ہلاک کرنے کے درپے ہوگیے۔ چنانچہ تقریباً ۱۳ سال کی پُرمشقت جدوجہد کے بعد آپ کو مکہ چھوڑکر ۳۰۰ میل دور مدینہ جانا پڑا۔ مگر آج یہ حال ہے کہ کعبہ تو درکنار کوئی شخص عام مساجد کے نام پر بھی اگر "تحفظ مسجد" کی تحریک شروع کرتا ہے تو اس کے چاروں طرف انسانوں کی بھیڑ جمع ہوجاتی ہے۔ اس کے اوپر روپیہ کی بارش ہونے لگتی ہے۔ وہ صبح و شام میں عزت و لیڈری کا مقام حاصل کرلیتا ہے۔

مکی دور میں اہل مکہ مسلمانوں کو ستاتے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کی ایک تعداد عرب سے نکل کر حبش چلی گئی۔ یہ سب کے سب اصحاب رسول تھے۔ مگر حبش میں نہ ان عربوں کا استقبال ہوا، نہ وہاں ان کے لیے عظیم الشان کانفرنسیں کی گئیں۔ وہ کچھ عرصہ تک وہاں محنت مزدوری کرتے رہے۔ اور اس کے بعد غیر اہم آدمی کی حیثیت سے دوبارہ اپنے وطن واپس آگیے۔ مگر آج یہ حال ہے کہ اسی عرب کا کوئی شیخ جب ہندستان یا کسی اور ملک میں جاتا ہے تو مسلمانوں کے تمام اصاغر و اکابر ان کے استقبال کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ ان کے اعزاز میں ایڈریس پیش کیے جاتے ہیں۔ اور عظیم الشان کانفرنسیں منعقد کی جاتی ہیں۔

لبید قدیم عرب کے ایک مشہور شاعر تھے۔ مکی دور میں انھوں نے قرآن کو سنا۔ اس کو سُن کر انھوں نے اسلام قبول کرلیا اور شاعری چھوڑ دی۔ کسی نے پوچھا کہ تم نے شاعری کیوں چھوڑدی۔ انھوں نے جواب دیا: اَبعدَ القرآن۔ (کیا قرآن کے بعد بھی) لبید کے اس عمل پر قدیم عرب میں انھیں کوئی اعزاز نہیں ملا۔ لیکن آج اگر کوئی مشہور شاعر ایسا کرے کہ وہ شہر کے چوراہے پر کھڑا ہوکر اپنے کلام کو جلادے اور کہے کہ میں نے قرآن کو پڑھا تو مجھے اپنی شاعری پھیکی معلوم ہونے لگی۔ اب میں شاعری کو چھوڑکر قرآن کو اختیار کرتا ہوں تو ایسے شاعر کی ہر طرف دھوم مچ جائے گی۔ وہ صبح و شام میں عظمت اور مقبولیت کے آسمان پر پہونچ جائے گا۔

قدیم زمانہ اور موجودہ زمانہ میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں اسلام اجنبی تھا۔ آج اسلام ایک معروف اور غالب دین بن چکا ہے۔ قدیم زمانہ میں صرف چند بے سرو سامان لوگ اسلام کے ساتھ تھے۔ آج ساری دنیا میں ایک ارب انسان اسلام کے ساتھ ہیں۔ دولت اور اقتدار کے تمام اسباب اس کی پشت پر جمع ہیں۔ یہی وہ فرق ہے جس نے دو دوروں میں مذکورہ بالاقسم کا فرق پیدا کر دیا ہے۔

یہ معاملہ ہر دین کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اس سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ اور اب مسلمانوں کے ساتھ یہی صورت پیش آرہی ہے۔

ابتدائی دور میں خدا کی کتاب اور خدا کے دین کے ساتھ دنیوی اہمیت کی چیزیں جمع نہیں ہوتیں۔ اس بنا پر کسی کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ کتابِ خداوندی یا دینِ خداوندی کے نام پر دھوم مچا سکے۔ مگر لمبی مدت گزر جانے کے بعد خدا کی کتاب اور خدا کے دین کے اندر دنیوی اور قیادتی قدریں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اب یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ خدا کے دین کو اسی طرح قیادتی عنوان یا تجارتی سودا بنایا جا سکے جس طرح کوئی شخص غیر دینی اور غیر خدائی چیزوں کو بناتا ہے۔

یہ ایک زبردست فتنہ ہے جو ہمیشہ بعد کے دور میں پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی وہ فتنہ ہے جس سے قرآن میں ان الفاظ میں منع کیا گیا ہے کہ اللہ کی آیتوں کے بدلے ثمن قلیل نہ لو:

ولاتشتروا بآیاتی ثمناً قلیلاً (البقرہ ۴۱)	اور میری آیتوں پر تھوڑا مول نہ لو (یعنی دین کے نام پر دنیا نہ کماؤ)

قرآن میں اس مضمون کی کئی آیتیں ہیں جن میں اللہ کے کلام کے بدلے ثمنِ قلیل لینے کو منع کیا گیا ہے۔ اس سے مراد عین وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں استغلال یا استحصال (Exploitation) کہا جاتا ہے۔ یعنی اسلام کو اپنی قیادت کا عنوان بنانا۔ قرآن اور اسلام کا نام لینا اور اس کے ذریعہ سے دنیا کا سازو سامان حاصل کرنا۔

موجودہ زمانہ میں یہ فتنہ بہت بڑے پیمانہ پر پیدا ہو گیا ہے۔ لوگ اسلام کے چیمپین بن کر عزت، دولت، قیادت کا ڈھیر اپنے گرد جمع کر رہے ہیں۔ مگر قیامت میں جب پردہ ہٹے گا تو معلوم ہوگا کہ اسلام کے یہ چیمپین صرف اسلام کے سوداگر (Exploiter) تھے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

تعمیر یا تخریب

"وفاق" پاکستان کا ایک روزانہ اخبار ہے جو لاہور، راولپنڈی، سرگودھا اور رحیم یار خاں سے بیک وقت شائع ہوتا ہے۔ اس کے شمارہ ۱۰ مئی ۱۹۹۰ کے صفحہ اول پر ایک تصویر ہے جس میں مسلمانوں کا ایک ہجوم قہقہہ لگا رہا ہے اور پتھر اور لکڑی سے کسی چیز کو مار رہا ہے۔ اس تصویر کے نیچے یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں: جماعت اسلامی کے زیر اہتمام عریانی اور فحاشی کے خلاف مظاہرے۔ مظاہرین ٹی وی سیٹ کو توڑ رہے ہیں۔

اس کے ساتھ خبر میں بتایا گیا ہے کہ "جماعت اسلامی کی انسداد منکرات مہم کے آخری روز حسن اسکوائر، گلشن اقبال (کراچی) کے نزدیک علامتی طور پر ٹی وی کو سنگسار کرکے بے راہ روی عریانی اور فحاشی کے خلاف نفرت کا اظہار کیا گیا۔ ٹی وی سیٹ پر جب ایک ساتھ ہزاروں پتھر برسے تو ٹی وی ایک لمحہ میں چکنا چور ہو گیا۔ جماعت اسلامی کا یہ مظاہرہ اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد مظاہرہ تھا جس میں ہزاروں افراد شریک ہوئے۔ مظاہرین سے خطاب کرتے ہوئے جماعت اسلامی کے نائب امیر اور اسلامی جمہوری اتحاد کے سکریٹری جنرل پروفیسر غفور احمد نے کہا کہ آج ٹی وی سیٹ تباہ کیا گیا ہے، لیکن اگر ٹی وی نے اپنی روش نہ بدلی تو کل عوام کے ہاتھ ٹی وی اسٹیشن کے در و دیوار تک پہنچ جائیں گے۔ اگر ٹی وی نے اپنا رویہ نہ بدلا اور شیطانی کام کرتا رہا تو شیطان کے ایجنٹوں کے ہاتھ توڑ دئے جائیں گے۔"

تقریباً یقینی ہے کہ جن لوگوں نے ٹی وی سیٹ پر سنگ باری کرکے ٹی وی سیٹ کو توڑا، ان میں سے اکثر کے گھروں میں ٹی وی سیٹ موجود ہوگا۔ ایسی حالت میں یہ خود ایک شیطانی فعل ہے کہ چوک پر ایک ناکارہ ٹی وی سیٹ رکھ کر اس پر پتھر مارے جائیں اور یہ امید کی جائے کہ ملک سے ٹی وی کی برائی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ٹی وی کی برائی لوگوں کے اپنے اندر ہے نہ کہ ٹی وی اسٹیشن یا حکومتی ایوان کے اندر۔

اگر ٹی وی کی برائی کو ختم کرنا ہے تو لوگوں کے دلوں کو بدلئے، حکومت کے خلاف نعرہ لگانے سے ٹی وی کی برائی کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ حتی کہ اگر حکومت پاکستان ٹی وی کے موجودہ تمام

پروگراموں کو بند کر کے صبح و شام ٹی وی کے اوپر صرف تلاوت قرآن کے پروگرام نشر کرنے لگے تب بھی موجودہ حالت میں اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

جنرل ضیاء الحق کے طویل زمانۂ حکومت میں اس کا ایک تجربہ کیا گیا اور مکمل طور پر ناکام رہا۔ مثلاً ضیاء الحق صاحب نے کہا کہ ہندستانی فلموں میں عریانی اور فحاشی ہوتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے پاکستان میں ہندستانی فلموں پر مکمل پابندی لگادی۔ مگر اس کے بعد جو فرق ہوا وہ صرف یہ تھا کہ جس ہندستانی فلم کو اس سے پہلے لوگ پکچر ہاؤس میں یا ٹیلی وژن سیٹ پر دیکھتے تھے، اس کو اب وہ ویڈیو کیسٹ کے ذریعہ خود اپنے گھر کے اندر وی سی آر پر دیکھنے لگے۔

جنرل محمد ضیاء الحق کو پاکستان میں ساڑھے گیارہ سال تک مکمل اقتدار حاصل رہا۔ جماعت اسلامی کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے لے کر ہندستان کے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تک تمام لوگوں کے نزدیک وہ مرد حق اور مرد مومن تھے۔ مزید یہ کہ انھوں نے ٹیلی ویژن کی وزارت (وزارت اطلاعات) پوری طرح جماعت اسلامی کو دے دی۔ جماعت اسلامی کا وزیر اطلاعات اور جنرل ضیاء الحق کا فوجی ڈنڈا دونوں مل کر پاکستان میں ٹیلی ویژن کی برائی کو ختم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کے باوجود ٹیلی ویژن کی برائی میں ایک فیصد بھی کمی نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک اندازے کے مطابق اس میں مزید اضافہ ہوگیا۔

اس تجربہ نے واضح طور پر ثابت کیا کہ جماعت اسلامی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا یہ نظریہ غلط ہے کہ ٹیلی ویژن (اور اس طرح کی دوسری سماجی برائیوں) کی اصلاح حکومت کی طاقت سے ہوتی ہے۔ اگر یہ اصلاح حکومت کی طاقت کے ذریعہ ہونے والی ہوتی تو وہ اس سے پہلے اس وقت ہو چکی ہوتی جب کہ جماعت اسلامی کے وزیر اطلاعات اور " مرد حق ضیاء الحق " کو حکومت کی طاقت حاصل تھی۔ اور وہ اس کے ذریعہ ٹیلی ویژن (اور دوسری سماجی برائیوں) کو ختم کرنے کی مہم چلا رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے لوگوں نے جو پتھر ٹیلی ویژن سیٹ پر مارے، وہ پتھر انھیں خود اپنے آپ پر مارنا چاہئے۔ انھیں چاہیے کہ جماعت اسلامی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بے بنیاد سیاسی نظریات کا ایک پتلا بنائیں اور پاکستان کے ہر چوک پر رکھ کر اس کو سنگسار کریں۔ یہی بے بنیاد نظریہ پاکستان میں " ٹی وی " جیسی برائیوں کو ختم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

کیوں کہ جماعت اسلامی کے لوگ اگر اس بے بنیاد نظریہ میں گم نہ ہوتے تو وہ اپنی کوششوں کو سیاست کی چٹان پر ضائع نہ کرتے بلکہ اس کو افراد کی اصلاح میں لگاتے۔ اور پھر وہ مقصد اب تک حل ہوچکا ہوتا جو غلط مقام پر محنت کرنے کی وجہ سے حاصل نہ ہوسکا۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے انتہائی بے بنیاد طور پر یہ نظریہ بنایا کہ سماج کی یا سماجی شعبوں کی اصلاح حکومت کی طاقت سے ہوتی ہے، اس لئے حکومت کی طاقت پر قبضہ کرو۔ جماعت اسلامی کے افراد اسی بے بنیاد نظریہ سے متاثر ہوکر پچھلے پچاس برس سے حکومت پر قبضہ کرنے کی مہم چلارہے ہیں۔

دلیل کے اعتبار سے یہ نظریہ پہلے ہی رد کیا جاچکا تھا۔ مگر تجربہ کے اعتبار سے وہ جنرل ضیاء الحق کے زمانۂ حکومت (۱۹۸۸ - ۱۹۷۷) میں رد ہوگیا۔ اب اگر جماعت کے لوگ اپنی کوششوں کو مفید بنانا چاہتے ہیں تو انھیں چاہئے کہ وہ اپنے سابقہ سیاسی نظریہ کی غلطی کا اعلان کریں۔ اور اس کے بعد موجودہ تخریبی طریقوں کو چھوڑ کر خالص اصلاحی انداز میں افراد کی ذہنی تعمیر میں لگ جائیں۔ یہ اگرچہ ایک دیرطلب کام ہے، اور اس میں عوامی لیڈری بھی نہیں ملتی، تاہم کسی معاشرہ میں کوئی حقیقی نتیجہ پیدا کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی دوسری تدبیر نہیں۔

حکومت کی طاقت سے سماجی برائیوں کو دور کرنا، بظاہر ایک خوب صورت نظریہ ہے۔ مگر وہ عملاً ناممکن ہے۔ اگر آپ انسان کو بدلے بغیر حکومتی سطح پر برائیوں کو ختم کرنے کی کوشش کریں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ برائی ایک نئی صورت میں قائم ہوجائے گی، وہ لوگوں کی زندگیوں سے ختم نہیں ہوسکتی۔

برائی کو ختم کرنے کے سلسلہ میں پہلا کام افراد کے اندر برائیوں کو چھوڑنے کی آمادگی پیدا کرنا ہے۔ اس آمادگی کو پیدا کرنے سے پہلے "انسداد منکرات" کے نام پر حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن چلانے سے منکرات کا انسداد تو نہیں ہوگا البتہ پورا سماج تخریبی سماج بن جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ عوام کی بھیڑ کو جمع کرکے چوراہہ پر ٹی وی سٹ کے اوپر پتھر مارنا صرف جھوٹی لیڈری ہے۔ سچا لیڈر وہ ہے جو عوام کو اس پر آمادہ کرے کہ وہ اپنے گھروں میں جاکر اپنا اپنا ٹی وی سٹ توڑ ڈالیں۔ اور ایسا لیڈر سارے عالم اسلام میں کوئی ایک بھی نہیں۔

تربیتی ضمیمہ

ہندستان میں مالی بدعنوانی بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے۔ چنانچہ ملک کے سیاسی ذمہ دار، مذہبی پیشوا اور دانشور طبقہ مسلسل اس کے خلاف لکھتا اور بولتا رہتا ہے۔ مگر یہاں کی مالی بدعنوانیوں میں ایک فی صد بھی کمی نہ ہوسکی۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ نرادچودھری نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اس کی وجہ ہندو قوم کی دولت پرستی ہے۔ ہندو عقیدہ کے مطابق، دولت ایک معبود ہے اور لکشمی دیوی کی صورت میں ہر ہندو اس کی پرستش کرتا ہے۔ ایسی صورت میں ناممکن ہے کہ محض دولت کے خلاف اپدیش دینے سے دولت پرستی کا خاتمہ ہو جائے۔ یہ ذہن بدلنے کا معاملہ ہے نہ کہ محض اخلاقی نصیحت کرنے کا۔

عجیب بات ہے کہ یہی خرابی موجودہ زمانہ کے اسلام پسندوں میں ایک اور شکل میں پائی جارہی ہے۔ اس کی ایک مثال جماعت اسلامی کا معاملہ ہے۔ جماعت اسلامی کے سنجیدہ حلقہ میں پچھلے پچاس برس سے یہ احساس پایا جاتا رہا ہے کہ جماعت کے افراد میں سیاسی ذوق تو خوب ابھرتا ہے مگر روحانی ذوق ان کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔

جماعت کے ذمہ داروں نے اس مسئلہ کا حل "تربیت" میں تلاش کیا ہے۔ غالباً ۱۹۵۳ میں جماعت اسلامی کے مرکز (رامپور) کے تحت پہلا تربیتی کیمپ قائم کیا گیا۔ اس کے انچارج مولانا سید حامد علی تھے۔ اس کے تحت "بیچ" کی صورت میں کچھ افراد کو پندرہ پندرہ دن کے لئے بلایا جاتا تھا۔ اور ان کو تربیتی کورس سے گزارا جاتا تھا۔ مگر چند ہی بیچ کے بعد محسوس ہوا کہ یہ بے فائدہ ہے۔ چنانچہ اس پروگرام کو ختم کر دیا گیا۔

اب جماعت اسلامی کی نئی قیادت کے تحت اس کو دوبارہ اس طرح زندہ کیا گیا ہے کہ جماعت کے مرکز (دہلی) میں جماعت کے ایک بزرگ کو "نائب امیر برائے تربیت" مقرر کیا گیا ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ صرف سادہ لوحی ہے۔ یہ ماضی کی غلطی کو حال میں دہرانا ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی اور حقیقت نہیں (دعوت ۲۸ مئی ۱۹۹۰)

جماعت اسلامی کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلام

کی تعبیر خالص سیاسی انداز میں کی۔ حتی کہ انھوں نے اذان اور نماز اور روزہ جیسے روحانی عمل کو بھی سیاسی عمل بنا کر دکھایا۔ جماعت اسلامی کے افراد کا ذہن اسی قسم کے سیاسی لٹریچر کو پڑھ کر بنا ہے۔ وہ اسلام کے پورے معاملہ کو سیاسی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایسی حالت میں عین فطری بات ہے کہ جماعت کے افراد میں سیاسی مزاج ہو، ان کے اندر روحانی مزاج نہ ہو۔ اگر آپ ببول کا بیج بوئیں تو اس سے آم کے پھل کی امید کرنا احمقانہ خوش فہمی کے سوا اور کچھ نہیں۔

تربیت بذات خود ایک اسلامی عمل ہے اور اس کو قرآن میں تزکیہ کہا گیا ہے (ویزکیھم) مگر تربیت (یا تزکیہ) اس وقت مفید ہوتا ہے جب کہ وہ فکری یاددہانی کے لئے ہو۔ جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ آدمی کو اس کا ایک بھولا ہوا سبق ازسرنو یاد دلایا جائے۔

مگر جماعت اسلامی کے معاملہ میں اصل مسئلہ فکری یاددہانی کا نہیں بلکہ فکری تغیر کا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے لٹریچر نے جماعت کے افراد کے فکری ڈھانچہ کو سیاسی ڈھانچہ بنا دیا ہے جو روحانی ڈھانچہ کی عین ضد ہے۔ جب تک اس سیاسی ڈھانچہ کو توڑا نہ جائے، روحانی سبق کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایسے آدمی کے ذہن پر سیاست کا ڈاٹ لگا ہوا ہوتا ہے۔ اس ڈاٹ کو توڑنے کے بعد ہی ذہن کے اندر کوئی نئی چیز داخل ہوسکتی ہے۔ اس سے پہلے نہیں۔

اگر آپ کہیں کہ "دین سے مراد اسٹیٹ ہے" تو یہ نظریہ آدمی کے اندر صرف سیاسی انداز فکر پیدا کرے گا۔ اس کے بعد یہ کہنا کہ "اسٹیٹ قائم کرنے کے لئے صالح افراد درکار ہوتے ہیں۔ اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈریں تاکہ اچھی اسٹیٹ قائم کرسکیں"۔ تو یہ سیاسی ہاتھی کے دم میں روحانیت کا پتنگ باندھنا ہوگا۔ اس قسم کے تربیتی پیوند کے ذریعہ کبھی کسی کے اندر روحانیت کا طوفان برپا نہیں ہوسکتا۔

اس کے برعکس اگر آپ یہ کہیں کہ "دین یہ ہے کہ آدمی اللہ سے ڈرے"۔ تو یہ عقیدہ آدمی کے اندر روحانی ہلچل پیدا کرنے کا سبب بنے گا۔ جو لوگ اس فکر سے متاثر ہوں گے، وہ اپنے ابتدائی تاثر ہی کے اعتبار سے روحانی انسان بن جائیں گے۔ آدمی کی ذہنی تربیت ہمیشہ وہ فکر کرتا ہے جس نے اس کے ذہن کو بیدار کیا ہے۔ نہ کہ کسی قسم کا تربیتی ضمیمہ۔

جماعت اسلامی کے افراد کی تربیت حقیقۃً یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ یہ اعلان کیا جائے

کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلام کی جو سیاسی تعبیر کی وہ سراسر غلط تھی۔ اس کے بعد جماعت اسلامی کے افراد کو ہدایت کی جائے کہ وہ قرآن کو قرآن کے ذریعہ پڑھیں نہ کہ تفہیم القرآن کے ذریعہ۔ اس طرح کی انقلابی کوششوں سے تو یقیناً جماعت کے افراد کی تربیت ہوسکتی ہے۔ مگر موجودہ فکری حالت کو باقی رکھتے ہوئے "محکمۂ تربیت" قائم کرنے کا کسی بھی درجہ میں کوئی فائدہ نہیں۔ جماعت اسلامی کا سیاسی نظریہ محرک روحانیت کو ختم کر دیتا ہے۔ اور محرک روحانیت کو ختم کرنے کے بعد کسی تربیتی ضمیمہ کے ذریعہ آدمی کے اندر روحانیت پیدا نہیں کی جاسکتی۔

آدمی کا کردار آدمی کے فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کسی آدمی کے اندر جس ڈھنگ کی فکری اٹھان ہوگی اسی ڈھنگ کا کردار اس کے اندر پیدا ہوگا۔ سیاسی تحریکوں سے وابستہ افراد کی فکری اٹھان سیاسی انداز پر ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے اندر جو اخلاق و کردار پیدا ہوتا ہے وہ بھی سیاسی انداز کا ہوتا ہے۔ ایک گروہ جس کے افراد کی فکری اٹھان سیاسی نظریات پر ہوئی ہو، ان کے اندر کسی تربیتی ضمیمہ کے ذریعہ غیر سیاسی کردار لایا نہیں جاسکتا۔

جماعت اسلامی سے وابستہ افراد کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کی فکری اٹھان اسلام کی سیاسی تعبیر پر ہوئی ہے۔ وہ جماعت اسلامی کی طرف اسی لئے راغب ہوئے کہ وہ اسلام کو سیاسی نظام کے روپ میں پیش کر رہی تھی۔ اس تحریکی عمل کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ ان کے اندر سیاسی مزاج اور سیاسی کردار ابھرے، جیسا کہ واقعۃً ہوا۔

اب یہ ناممکن ہے کہ کسی قسم کے تربیتی ضمیمہ کے ذریعہ ان لوگوں کے اندر روحانی یا غیر سیاسی کردار پیدا کیا جائے۔ جماعت اسلامی کے افراد کے موجودہ فکری ڈھانچہ کو باقی رکھتے ہوئے "تربیتی ضمیمہ" کے ذریعہ ان کے اندر روحانیت لانے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ببول کا درخت بوئے اور جب وہ بڑا ہو کر ببول کا پھل دینے لگے تو وہ چاہے کہ اس کی شاخوں میں آم کا پھل لٹکا کر اس کو آم کا درخت بنا دیا جائے۔

نصیحت کے آداب

نصیحت ایک حکیمانہ قول ہے۔ وہ اس لئے ہوتی ہے کہ آدمی اس کو پکڑلے۔ اور اپنی زندگی میں ہمیشہ اس کو برتتا رہے۔ اسی لئے نصیحت کا یاد رہنا ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی نصیحت اسی وقت نصیحت ہے جب کہ وہ سننے والے کو یاد رہ جائے۔ جو نصیحت ایسی ہو کہ وہ آدمی کو یاد نہ رہے، عملاً سننے والے کے لئے اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

نصیحت کو یاد رکھنا یا اس کا یاد رہنا دو طرفہ معاملہ ہے۔ ایک طرف وہ اس پر موقوف ہے کہ سننے والا اس کو دھیان کے ساتھ سنے۔ دوسری طرف سنانے والے سے بھی اس کا گہرا تعلق ہے۔ سنانے والے کو اپنی نصیحت ایسے انداز میں کہنی چاہئے کہ وہ سننے والے کے دل میں اتر جائے اور اس کا ذہن بآسانی اس کو محفوظ کر سکے۔ نصیحت کو عمدہ انداز میں کہنا گویا سننے والے کو یاد رکھنے میں مدد دینا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے مذکر (ناصح) تھے۔ چنانچہ یہ حکمتِ کلام آپ کی حدیثوں میں کمال درجہ میں پائی جاتی ہے۔ نصیحت کو ذہن نشین کرانے کے لئے آپ مختلف قسم کا اہتمام فرماتے اور مختلف اسلوب اختیار کرتے۔

آپ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ ہمیشہ مختصر الفاظ میں بولتے۔ ٹھہر ٹھہر کر اپنے الفاظ ادا کرتے۔ حضرت عائشہ نے بعد کے لوگوں سے ایک بار فرمایا:

ان رسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یکنْ یسرُد الحدیثَ کسردِکم کان یحدِثُ حدیثاً لَو عدّہ العادُّ لاحصاہ (متفق علیہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری طرح تیز باتیں نہیں کرتے تھے۔ آپ اس طرح بات کرتے تھے کہ اگر گننے والا گنے تو اس کو گن لے۔

اسی مقصد سے کبھی آپ سوال وجواب کا انداز اختیار کرتے۔ کبھی رواجی اسلوب سے ہٹ کر کسی انوکھے اور چونکا دینے والے اسلوب میں اپنی بات ارشاد فرماتے۔ کبھی اپنے کلام کو ایک سے زیادہ بار فرماتے۔ کبھی سننے والے سے کہتے کہ میرے کہے ہوئے کو دہراؤ تاکہ میں دیکھوں کہ تم نے میرے الفاظ کو کس طرح پکڑا ہے۔ پھر اسی حکمت کا یہ نتیجہ ہے کہ آپ نے ایک بات کسی شخص سے ایک انداز میں فرمائی اور وہی بات کسی دوسرے شخص سے دوسرے انداز میں۔

انھیں حکیمانہ طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ تھا کہ آپ اپنی بات کو گنتی کی صورت میں بیان فرماتے ــــــ "دو باتیں آدمی کے لئے ضمانت ہیں"، "تین باتیں جس کے اندر ہوں"، "چار باتیں یاد رکھو"، "پانچ باتیں بنیادی ہیں"، حدیثوں

میں دین کی تعلیم کرتے ہوئے اس قسم کے جو الفاظ آتے ہیں وہ اسی خاص حکمت کی وجہ سے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انما الامور ثلاثة۔ امر تبین لك رشده فاتبعه۔ و امر تبین لك زیغه فاجتنبه۔ و امر اختلف فیه فكله الی عالمه

معاملات تین طرح پر ہیں۔ وہ معاملہ جس کی صحت تم پر واضح ہو اس کی پیروی کرو۔ اور وہ معاملہ جس کی کجی تم پر واضح ہو اس سے بچو۔ اور وہ معاملہ جس میں اختلاف پڑجائے اس کو کسی جاننے والے کے سپرد کردو۔

یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اصلاح کی بات کہنی تھی۔ اس کو آپ نے "تین" کلمات میں تقسیم کرکے فرمایا تاکہ سننے والے کو وہ فوراً یاد ہوجائے اور وہ اس کے ذہن کا جزء بن سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی امت نے بھی اس حکیمانہ طریقہ کی پیروی کی۔ امت کے رہنما اور واعظین مسلسل اسی انداز کلام میں لوگوں کو نصیحتیں کرتے رہے۔ وہ جب کسی نئے نصیحت کا کوئی کلمہ کہتے تو ایسے اسلوب میں کہتے کہ لوگ اس کو پکڑلیں اور اپنے دماغ میں اس کو محفوظ رکھیں۔ یہاں نمونہ کے طور پر یحییٰ بن معاذ الرازی کے دو اقوال نقل کئے جاتے ہیں:

طوبیٰ لمن ترك الدنیا قبل ان تتركه وبنی قبره قبل ان یدخله وارضی ربه قبل ان یلقاه

مبارک ہے وہ جس نے دنیا کو چھوڑ دیا اس سے پہلے کہ دنیا اسے چھوڑے۔ جس نے اپنی قبر بنالی اس سے پہلے کہ وہ اس میں داخل ہو۔ جس نے اپنے رب کو راضی کرلیا اس سے پہلے کہ وہ اس سے ملے۔

ترك الدنیا كلها اخذُها كلها۔ فمن تركها كلها اخذَها كلها ومن اخذَها كلها تركها كلها فاَخذُها فی تركها وتركُها فی اخذها

دنیا کو پورا چھوڑنا دنیا کو پورا پکڑنا ہے۔ پس جس نے پورے کو چھوڑا اس نے پورے کو پکڑلیا اور جس نے پورے کو لیا اس نے پورے کو چھوڑ دیا۔ پس دنیا کو لینا اس کے چھوڑنے میں ہے اور دنیا کو چھوڑنا اس کے لینے میں ہے۔

نصیحت کا کلمہ خیر خواہی کا کلمہ ہے۔ سچی نصیحت اصلاح کی تڑپ کے تحت نکلتی ہے۔ ایسا آدمی فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ وہ بات کو ایسے انداز سے کہے کہ وہ سننے والے کے دل میں اتر جائے۔ وہ سننے والے کے ذہن میں مستقل طور پر محفوظ ہوجائے۔ وہ اس کو اصول زندگی کے طور پر ہمیشہ کے لئے یاد رکھے۔ یہ جذبہ کہنے والے کو مجبور کرتا ہے کہ وہ مخاطب کی پوری رعایت کرے۔ وہ اپنے الفاظ اور اپنے کلام کو زیادہ سے زیادہ پُرحکمت بنائے۔ مخاطب کے ساتھ یہی خیر خواہی اور رعایت ہے جو نبی اور اس کے سچے متبعین کے یہاں مندرجہ بالا قسم کے ناصحانہ کلام میں ڈھل جاتی ہے۔

الٹی تفسیر

قرآن کی سورہ الفتح میں اس واقعہ پر تبصرہ ہے جس کو اسلام کی تاریخ میں صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ اس کی چند آیتوں کا ترجمہ یہ ہے :

اللہ مومنوں سے راضی ہوگیا جب کہ وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے، اللہ کو معلوم تھا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا، پس اللہ نے ان پر اطمینان (سکینت) اتارا اور ان کو ایک قریبی فتح دے دی۔ اور بہت سی غنیمت بھی جس کو وہ لیں گے، اور اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ اللہ نے تم سے بہت سی غنیمت کا وعدہ کیا ہے جس کو تم لوگے۔ تو یہ تم کو فوراً دے دیا۔ اور اس نے لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیئے، اور تاکہ یہ اہل ایمان کے لیے ایک نشانی ہو اور تاکہ اللہ تم کو صراط مستقیم دکھائے (الفتح ۱۸ - ۲۰)

اردو کے ایک مفسر قرآن نے ان آیات میں سکینت اور صراط مستقیم پر جو تفسیری نوٹ لکھا ہے وہ ان کے الفاظ میں حسب ذیل ہے :

"یہاں سکینت سے مراد دل کی وہ کیفیت ہے جس کی بنا پر ایک شخص کسی مقصد عظیم کے لیے ٹھنڈے دل سے پورے سکون و اطمینان کے ساتھ اپنے آپ کو خطرہ کے منہ میں جھونک دیتا ہے۔ اور کسی خوف یا گھبراہٹ کے بغیر فیصلہ کر لیتا ہے کہ یہ کام بہر حال کرنے کا ہے خواہ نتیجہ کچھ بھی ہو۔ یعنی تمہیں مزید بصیرت اور یقین حاصل ہو، اور آئندہ تم اسی طرح اللہ اور رسول کی اطاعت پر قائم رہو۔ اور اللہ کے اعتماد پر راہ حق میں پیش قدمی کرتے چلے جاؤ۔ اور یہ تجربات تمہیں یہ سبق سکھا دیں کہ خدا کا دین جس اقدام کا تقاضا کر رہا ہو، مومن کا کام یہ ہے کہ خدا کے بھروسہ پر وہ اقدام کر ڈالے، اس حیص بیص میں نہ لگ جائے کہ میری طاقت کتنی ہے اور اور باطل کی طاقتوں کا زور کتنا ہے۔"

اس موقع پر سکینت اور صراط مستقیم کی یہ تفسیر بالکل الٹی تفسیر ہے۔ یہاں سکینت سے مراد یہ ہے کہ دشمن کی اشتعال انگیزیوں کے باوجود ان کا سکون قلب برہم نہیں ہوا۔ انتہائی نازک حالات میں بھی وہ رد عمل کی نفسیات میں مبتلا نہیں ہوئے۔ یہاں سکینت کا مطلب "نتیجہ کی پروا کیے

بغیر اپنے آپ کو خطرات میں جھونک دینا " نہیں ہے ، بلکہ اس کا مطلب اس کے بالکل برعکس ہے ۔ اس سے مراد اپنے آپ کو ضد سے اور اس منفی نفسیات سے بچانا ہے جب کہ آدمی یہ نادانی کرتا ہے کہ وہ نتیجہ کی پروا کیے بغیر اپنے آپ کو خطرہ کے منہ میں جھونک دیتا ہے ۔

یہی معاملہ صراطِ مستقیم دکھانے کا بھی ہے ۔ اس آیت میں صراطِ مستقیم سے مراد یہ نہیں ہے کہ آدمی " بس اقدام کر ڈالے ، وہ اس حیص بیص میں نہ پڑے کہ میری طاقت کتنی ہے اور باطل کا زور کتنا " ۔ اس آیت کا مطلب اس کے بالکل برعکس ہے جو مذکورہ تفسیری نوٹ میں پُرجوش الفاظ میں بتایا گیا ہے ۔ اس کا اصل مطلب اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہونا ہے ، صلح حدیبیہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے واقعاتی طور پر مسلمانوں کو یہ راستہ دکھایا کہ کامیابی کا راز اکثر اوقات ٹکراؤ میں نہیں ہوتا ، بلکہ ٹکراؤ سے اعراض میں ہوتا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ آیت کا اگر وہ مفہوم لیا جائے جو مذکورہ تفسیر میں بتایا گیا ہے تو اس کی سب سے پہلی خلاف ورزی کرنے والے خود رسول اور اصحاب رسول قرار پائیں گے جن کے اوپر قرآن کی یہ آیت اُتری ۔ کیوں کہ " حُدیبیہ " کے موقع پر انھوں نے ایسا نہیں کیا کہ وہ مخالفین کی مخالفتوں کی پروا کیے بغیر عمرہ کا اقدام کر ڈالیں ، وہ ہر حال میں مکّہ میں داخل ہو جائیں ، خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے ۔

ایمانی صلاحیت

قدیم عربوں میں انسان کے اعلیٰ کردار کو بتانے کے لئے دو لفظ خاص طور پر بہت اہمیت رکھتے تھے ۔ مروّۃ اور عرض ۔ مروّۃ کا لفظ مرء سے بنا ہے ۔ اس کے لفظی معنی ہیں مردانگی ۔ قدیم عرب کے ذہن میں مروءۃ (یا مروّت) کا لفظ ان تمام خصوصیات کا جامع تھا جو ایک سچے مرد کے اندر ہونی چاہئیں ۔ مثلاً حوصلہ، بہادری، فیاضی، عالی ظرفی، قول کا پکا ہونا، کمزوروں کی حمایت، اختلاف اور شکایت کے باوجود بہتر سلوک وغیرہ ۔ جاہلی دور کا ایک شاعر کہتا ہے :

اذا المرء اعیته المروءۃ ناشئا　　فمطلبها کھلا علیه شدید

آدمی اگر جوانی میں مروءۃ کے درجہ تک پہنچنے سے عاجز رہے تو بڑھاپے میں اس کو حاصل کرنا اس کے لئے بہت دشوار ہے ۔

دوسرا لفظ عرض ہے ۔ عرض کے معنی ہیں آبرو، عزت ۔ یعنی آدمی میں یہ جوہر ہونا کہ وہ کچھ اخلاقیات کو اپنے لئے عزت کا سوال سمجھے اور ہر حال میں اس کو کرے خواہ اس کے کرنے میں کتنی ہی مشکل پیش آئے اور اسی طرح کچھ خلاف اخلاق باتوں کو وہ اپنی عزت اور آن کے خلاف سمجھے اور کسی حال میں اس کے قریب نہ جائے ۔ ایک جاہلی شاعر کہتا ہے :

اذا المرء لم یدنس من اللؤم عرضه　　فکل رداء یرتدیه جمیل

آدمی اگر ذلیل حرکت سے اپنی عرض کو داغدار نہ کرے تو جو چادر بھی وہ اوڑھے وہ اس کے لئے اچھی ہے ۔

یہ مردانگی اور آن عربوں میں کمال درجہ میں تھی ۔ ان کے قول و فعل میں کوئی فرق نہ تھا ۔ وہ جو کہتے تھے وہی کرتے تھے اور جو کرتے تھے وہی کہتے تھے ۔ وہ وعدہ سے پھرنا نہیں جانتے تھے ۔ وہ اپنے دشمن کے ساتھ بھی کوئی پست حرکت نہیں کرسکتے تھے ۔ کوئی مظلوم جب ان کو پکارتا تھا تو اس کی پکار پر دوڑنا وہ اپنے لئے فرض سمجھتے تھے ۔ ان سے کوئی شخص عالی ظرفی سے کم تر درجہ کے سلوک کی امید نہیں کرسکتا تھا ۔ وہ اپنے مخالف کے بارے میں بھی کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکتے تھے جو واقعہ کے خلاف ہو ۔ وہ جس بات کو حق سمجھ لیتے تھے اس سے ہٹنا ان کے لئے ناممکن تھا خواہ اس کی خاطر انھیں کتنی ہی قربانی دینی پڑے ۔ وہ جس معیار سے اپنے آپ کو دیکھتے تھے اسی معیار سے دوسروں کو بھی دیکھتے تھے ۔ وہ شرافت اور عالی ظرفی کو اپنی آن کا مسئلہ سمجھتے تھے اور اس کی خاطر مرٹنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے ۔

یہی انسانی کردار وہ ابتدائی بنیاد ہے جس پر اسلام کی بلند عمارت کھڑی ہوتی ہے ۔ جن لوگوں میں یہ اعلیٰ اوصاف ہوں وہی خدا کے دین کا بوجھ اٹھا سکتے ہیں ۔ جو لوگ ان ابتدائی خصوصیات سے خالی ہوں وہ گویا

اس بنیاد ہی سے محروم ہیں جس کے اوپر دین کی بلند و بالا عمارت قائم ہوتی ہے
یہی حقیقت ہے جو ایک روایت میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے ۔

تجدون الناس معادن کمعادن الذھب والفضۃ) خیارھم فی الجاھلیۃ خیارھم فی الاسلام اذا فقھوا ۔ وتجدون خیر الناس فی ھذا الشان اشدھم لہ کراھیۃ حتی یقع فیہ ۔ وتجدون شر الناس ذا الوجھین الذی یاتی ھؤلاء بوجہ و ھؤلاء بوجہ (بخاری ومسلم)

تم لوگوں کو مثل کانوں کے پاؤ گے (جیسے سونے چاندی کی کانیں ہوتی ہیں) ان میں جو لوگ قبل از اسلام بہتر تھے وہی اسلام میں بھی بہتر ثابت ہوں گے جبکہ وہ دین کی سمجھ پیدا کر لیں۔ اور تم اس چیز (عہدہ) کے معاملہ میں سب سے بہتر اس شخص کو پاؤ گے جو اس سے انتہائی بے رغبت ہو اور تم لوگوں میں سب سے برا اس شخص کو پاؤ گے جو دو منھ والا ہو۔ وہ ایک کے پاس ایک منھ لے کر جائے اور دوسرے کے پاس دوسرا منھ ۔

زمین میں طرح طرح کی معدنی کانیں ہیں۔ کسی سے کوئلہ جیسی معمولی چیز نکلتی ہے اور کسی سے سونے چاندی جیسی قیمتی دھاتیں۔ یہی حال انسان کا ہے ۔ انسان بھی طرح طرح کی صلاحیتوں کے ہیں ۔ ہر آدمی گویا ایک کان ہے۔ ان میں سے کوئی شخص ایسا ہے کہ اس کو "کھودا" جائے تو اس کے اندر سے کوئلہ اور کنکر جیسی چیزیں نکلیں گی ۔ اور کوئی ایسا ہے کہ اس کو کھودئے تو اس کے اندر سے سونے جیسا قیمتی کردار برآمد ہوگا۔ یہی چیز اسلام میں آدمی کے مقام کو متعین کرتی ہے ۔ جو آدمی اپنے اندر کمزور عمل اور سطحی نفسیات لئے ہوئے ہو وہ جب اسلام میں آئے گا تو یہاں بھی اس سے کمزوری اور سطحیت کا مظاہرہ ہوگا۔ اس کے برعکس جو شخص اپنی فطرت میں طاقت ور ارادہ اور اعلیٰ جذبات کا خزانہ چھپائے ہوئے ہو وہ جب اسلام کی صف میں آئے گا تو اس سے طاقت ور کردار اور برتر سلوک جیسی چیزوں کا اظہار ہوگا۔

حدیث میں بغرض وضاحت دونوں قسم کے انسانوں کی ایک ایک مثال دی گئی ہے۔ ایک انسان وہ ہے جو سونا انسان ہے اور دوسرا انسان وہ ہے جو کوئلہ انسان ہے —— "سونا انسان" کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ جاہ اور اقتدار سے انتہائی حد تک بے رغبت ہوتا ہے ۔ وہ خدا کی بڑائی میں جیتا ہے ۔ اس لئے اس کے دل میں یہ تمنا جگہ نہیں پکڑتی کہ وہ اپنی بڑائی کا مینار قائم کرے۔ اس کے برعکس "کوئلہ انسان" کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ موقع پرست ہوتا ہے ۔ وہ حالات کے لحاظ سے کلام کرتا ہے ۔ جہاں جیسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے وہاں اس کے مطابق الفاظ بول دیتا ہے ۔ پہلی قسم کے لوگ بہترین لوگ ہیں اور دوسری قسم کے لوگ بدترین لوگ ۔

ناقص استدلال

منشی امیر اللہ تسلیم اودھ کے نواب واجد علی شاہ کے ہمعصر تھے۔ ان کا شمار دربار کے شاعروں میں ہوتا تھا۔ اودھ کی مسلم سلطنت ختم ہونے کے بعد وہ رام پور چلے گئے۔ اور اس زمانہ کے شعر پسند حلقے میں کافی مقبول ہوئے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک عیسائی نے ایک بار ان کو ایک مصرعہ دیا اور کہا کہ آپ اس پر دوسرا مصرعہ لگائیے۔ عیسائی کا مصرعہ یہ تھا:

دین احمد کا گھٹے دین مسیحا بڑھ جائے

منشی امیر اللہ تسلیم نے برجستہ دوسرا مصرعہ لگا کر عیسائی کو لاجواب کر دیا۔ منشی امیر اللہ تسلیم کا مصرعہ یہ تھا:

گر براق نبوی سے خر عیسیٰ بڑھ جائے

یہ ایک دلچسپ مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم دانشور کس طرح تجزیاتی استدلال کے طریقہ سے بے خبر رہے۔ منشی امیر اللہ تسلیم کا یہ تقابل صحیح نہیں۔ ان کی غلطی یہ ہے کہ وہ رسول اللہ کے آسمانی سفر کا تقابل حضرت مسیح کے زمینی سفر سے کر رہے ہیں۔ حالانکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آسمانی سفر کا تقابل آسمانی سفر سے اور زمینی سفر کا تقابل زمینی سفر سے کیا جائے۔

پیغمبر اسلام نے معراج کے وقت براق کے ذریعہ آسمانی سفر کیا تھا۔ اسی طرح یہ ثابت ہے کہ حضرت مسیح کا آسمان کی طرف زندہ رفع ہوا۔ یہ "رفع" یقیناً کسی غیر معمولی "سواری" کے ذریعہ ہوا۔ دوسری طرف سیرت کی کتابیں بتاتی ہیں کہ جس طرح حضرت مسیح گدھے پر بیٹھے اسی طرح پیغمبر اسلام نے بھی گدھے پر سفر فرمایا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ آسمانی سفر میں دونوں پیغمبروں کی سواری براق تھی اور زمینی سفر میں دونوں پیغمبروں نے گدھے کی سواری استعمال فرمائی۔

صحیح استدلال وہی ہے جو منطقی تجزیہ میں پورا اترے۔ بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے مسلمان تجزیاتی استدلال سے اتنے بے خبر ہیں کہ ان کے انتہائی بڑے بڑے مصنفین اور مفکرین کے یہاں بھی اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

ہندستان میں برطانی حکومت کے دور میں مسلمانوں اور عیسائیوں میں مناظرے ہوا کرتے تھے۔

ان مناظروں کا مقصد دعوت نہیں تھا۔ بلکہ صرف یہ تھا کہ ایک دوسرے کے مذہب کو نیچا دکھایا جائے۔ مسلمانوں کو مسیحی اقوام سے سیاسی شکایت پیدا ہوگئی۔ اسی سیاسی شکایت کے مذہبی اظہار کا دوسرا نام مناظرہ تھا یہی وجہ ہے کہ ان مناظروں میں نہ ایک فریق سنجیدہ گفت گو کرتا تھا اور نہ دوسرا فریق۔

کہا جاتا ہے کہ اسی زمانہ میں آگرہ میں ایک پادری صاحب تھے۔ انھوں نے آگرہ کے چوک پر ایک بار تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ——— "جو شخص آسمان پر ہے اس کا مرتبہ اونچا ہے یا جو شخص زمین پر ہے اس کا مرتبہ اونچا ہے"۔ حضرت مسیح کے ساتھ "رفع" کا معاملہ ہوا تھا۔ یعنی سولی کے وقت وہ آسمان پر اٹھا لئے گئے۔ دوسری طرف پیغمبر اسلام وفات پاکر قبر میں دفن کئے گئے۔ اس فرق سے تمثیلی استدلال کرتے ہوئے پادری صاحب نے حضرت مسیح کو اونچا ظاہر کیا اور پیغمبر اسلام کو نیچا۔

اس کے جواب میں ایک مسلمان دوکاندار نے دوسری تمثیل پیش کی۔ اس نے اپنا ترازو اٹھایا اور کہا کہ پادری صاحب، اس ترازو کو دیکھئے۔ آپ بتائیے کہ ترازو کا جو پلہ نیچے جھکا ہوا ہے اس کا وزن زیادہ ہے یا جو پلہ اوپر کی طرف اٹھا ہوا ہے اس کا وزن زیادہ ہے۔ کہانی بتاتی ہے کہ پادری صاحب کو اقرار کرنا پڑا کہ جو پلہ نیچے کی طرف جھکا ہوا ہے اس کا وزن زیادہ ہے ——— ایک تمثیل میں پادری صاحب نے اپنے موافق دلیل پالی اور دوسری تمثیل میں مسلم دکاندار نے۔

مگر اس قسم کا تمثیلی استدلال نہایت کمزور طریق استدلال ہے۔ تمثیل کے ذریعہ کوئی چیز ثابت ہو تب بھی علمی طور پر وہ ثابت نہیں ہوتی۔ اور اگر وہ رد ہو تب بھی وہ علمی طور پر رد نہیں ہوتی۔ تمثیل ایک ایسا ربر ہے جس کو ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق گھٹا یا بڑھا سکتا ہے۔ تمثیل کسی بات کو سمجھانے کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے۔ مگر اس سے نہ کوئی چیز ثابت ہوتی اور اس سے نہ کوئی چیز رد ہوتی۔

ایک زمانہ تھا کہ اس ملک میں مسلم اور غیر مسلم دونوں برابر کی سطح پر ملتے جلتے تھے۔ اردو زبان ملک کی عام زبان تھی اس لئے دونوں کے درمیان آزادانہ بات چیت ہوتی تھی۔ یہ بہترین وقت تھا کہ خدا کے دین کی دعوت خدا کے بندوں تک پہنچائی جاتی۔ مگر مسلمانوں نے اس قیمتی وقت کو چھوٹی بحثوں میں کھو دیا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آگیا کہ مسلمان اب یہاں ایک الگ تھلگ جماعت بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کے اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی دوری بھی پیدا ہوگئی ہے اور زبان کی دوری بھی۔

دعوت اور اقدام کا فرق

"میں نے لوگوں کو حق کی طرف پکارا مگر سننے والوں نے نہ مانا تو میرا اس میں کیا قصور"

"میں نے حق کی خاطر عملی اقدام کیا مگر لوگوں کی نااہلی کی وجہ سے اقدام کامیاب نہ ہو سکا تو میرا اس میں کیا قصور"

قواعد کی رو سے دونوں جملے یکساں طور پر درست ہیں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے پہلا جملہ سراسر صحیح اور دوسرا جملہ سراسر غلط ہے۔ دعوت کا مقصود سنانا ہوتا ہے اور عملی اقدام کا مقصود نتیجہ پیدا کرنا۔ اس لئے دونوں کو جانچنے کا معیار ایک نہیں ہو سکتا۔ دعوت کو صرف دعوت کے پیمانہ پر دیکھا جائے گا اور اقدام کو عمل کے پیمانہ پر۔ داعی صرف پکارنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس سے جس بات کا تقاضا کیا جائے گا وہ صرف یہ ہے کہ وہ صحیح بات کی طرف پکارے اور پکارنے میں صحیح انداز اختیار کرے۔ نہ اس کے نشانۂ دعوت میں غلطی ہو اور نہ طریق دعوت میں۔ اس کے بعد جہاں تک نتیجہ کا تعلق ہے، اس کی کوئی ذمہ داری داعی پر نہیں۔ اگر اس نے صحیح بات کی طرف لوگوں کو بلایا ہو اور بلانے کے لئے وہی انداز اختیار کیا ہو جو خدا اور رسول کے مطابق صحیح انداز ہے تو وہ صد فی صد کامیاب ہے، خواہ کسی ایک آدمی نے بھی اس کی بات کو نہ مانا ہو۔

مگر عملی اقدام کرنے والے کا معاملہ مکمل طور پر اس سے مختلف ہے۔ عملی اقدام اس لئے ہوتا ہے کہ ایک سماجی ڈھانچہ کو اکھاڑ کر دوسرا سماجی ڈھانچہ قائم کیا جائے۔ اس میں ایک طرف کچھ موجود لوگوں کو اختیار کے مقام سے ہٹانا اور کچھ دوسرے لوگوں کو اختیار کے مقام پر بٹھانا ہوتا ہے۔ دعوتی کام میں منصوبہ کی تکمیل کا دارومدار صرف ایک شخص (داعی) کی کارکردگی پر ہوتا ہے۔ جب کہ عملی اقدام میں لازمی طور پر ضروری ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ متحدہ طور پر کارکردگی کا ثبوت دیں، ورنہ عملی اقدام کامیاب نہیں ہوگا بلکہ الٹا نقصان دہ ثابت ہوگا۔

اگر آپ کسی سے یہ کہنے جا رہے ہوں کہ تم محنت کر کے اپنی خودکفیل معاش پیدا کرو تو اس کے لئے آپ کا مخلص ہونا کافی ہے۔ لیکن اگر آپ کسی کو یہ مشورہ دیں کہ تم اپنا گھر بار بیچ کر بمبئی چلے جاؤ، وہاں تمہارے لئے بہترین گھر بھی ہے اور کاروبار بھی، تو ایسے مشورہ کے لئے آدمی کا مخلص ہونا کافی نہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اس مشورہ کے عملی نتائج کو جانے۔ جو شخص اس مشورہ کے عملی نتائج سے بے خبر ہو اس کے اوپر فرض ہے کہ وہ اپنی زبان بند رکھے۔ کیوں کہ اس قسم کا مشورہ بے خبری کے ساتھ دینا جرم کا درجہ رکھتا ہے۔ ایک شخص فن تعمیر سے ناواقف ہے۔ وہ گھر بنانے کے لئے دیواریں اٹھاتا ہے اور اس کے اوپر مٹی کے گارے سے لنٹر اور سلیب جوڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد جب سانچہ ہٹایا جاتا ہے تو چھت گر پڑتی ہے۔ اب ایسا شخص اگر یہ کہے تو کوئی اس کے کہنے کو نہیں سنے گا کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ مٹی کا گارا لنٹر کو نہیں سنبھالے گا۔ میں نے تو نیک نیتی کے ساتھ ایک صحیح کام کیا تھا۔ اب اگر چھت گر پڑی تو اس میں میرا کیا قصور۔ ہر آدمی یہ کہے گا کہ مکان کھڑا کرنا کوئی کھیل تماشا نہیں ہے۔ اگر تم فن تعمیر سے واقف نہ تھے تو تم اپنے گھر میں بیٹھتے، تم کو معمار بننے کی ضرورت کیا تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ عملی اقدام کا معاملہ حد درجہ نازک معاملہ ہے۔ عملی اقدام میں صرف نیک نیتی یا مقصد کی درستگی کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ دیکھنا بھی لازمی طور پر ضروری ہے کہ جو شخص عملی اقدام کے لئے اٹھا ہے کیا اس کے پاس اتنی طاقت

ہے کہ وہ موجود لوگوں کو ہٹاتے ہیں کامیاب ہو جائے۔ مزید یہ کہ اگر وہ اکھیڑ پچھاڑ کے ذریعہ موجود لوگوں کو ہٹانے میں کامیاب ہو جائے تو کیا خود اقدام کرنے والے کے پاس ایسے افراد موجود ہیں جن کو وہاں بٹھایا جائے تو وہ پچھلے نظام سے زیادہ بہتر نظام قائم کرکے اس کو چلا سکیں۔ دونوں میں سے کوئی ایک چیز بھی اگر موجود نہ ہو تو عملی اقدام محض ایک جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنا بنا بنایا پختہ گھر گرانا شروع کر دے۔ حالاں کہ اس کے پاس وہ ضروری سامان موجود نہ ہو جس کے ذریعہ وہ دوسرا بہتر گھر بنا سکے۔

اگر اپنا ذاتی معاملہ ہو تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ جو شخص مٹی اور سیمنٹ یا کچی اور پکی اینٹوں کا فرق نہ جانے اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ گھر کا معمار بن کر کھڑا ہو جائے۔ اس قسم کی بے خبری کے ساتھ کوئی شخص معمار بننے کی ہمت نہیں کرے گا۔ اور اگر کوئی نادان شخص ایسی جرأت کرے تو لوگ کبھی اس کو نہیں بخشیں گے۔ اس کا عمل اس کو الٹا مجرم ثابت کرنے والا بن جائے گا نہ کہ وہ لوگوں کی نظر میں کسی انعام کا مستحق قرار پائے۔ مگر قومی و ملی معاملات میں اس قسم کے معمار بہت بڑی تعداد میں میدان عمل میں کود تے ہیں۔ وہ مٹی کے گارے سے چھت جوڑتے ہیں مگر عوام کی طرف سے ان کو بڑے بڑے خطابات اور شاندار اعزازات سے نوازا جاتا ہے۔ ذاتی معاملہ میں اقدام کے بعد آدمی نتیجہ کو بھی ضرور دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر ملی معاملہ میں اقدام کرنا ہو تو نتیجہ دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں صرف ایک پرشور اقدام کرنا کافی ہے خواہ اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے یا الٹا نتیجہ برآمد ہو۔

درد سر اور درد گھر دونوں بہت ملتے جلتے الفاظ ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ سر کے درد کا علاج اگر طبی گولی سے ہو جاتا ہے تو گھر کا درد بھی ایک گولی سے ختم ہو جائے گا۔ دونوں لفظوں کا ملتا جلتا ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ دونوں کا معاملہ ایک ہے اور دونوں کو ایک ڈھنگ سے حل کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہمارے مصلحین اکثر اپنے اصلاحی منصوبہ میں یہی غلطی کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ منصوبہ اپنی تکمیل کے مرحلہ میں پہنچ کر بھی کوئی حقیقی نتیجہ پیدا نہیں کرتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ "قولی اقدام" جس طرح ہر حال میں ایک درست کام ہے اسی طرح "عملی اقدام" بھی ہر حال میں کیا جا سکتا ہے۔ حالاں کہ قولی اقدام اور عملی اقدام ایک دوسرے سے بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ لفظی اشتراک کے سوا ان میں کوئی نسبت نہیں۔

ایک درخت کہیں رکاوٹ ڈال رہا ہو اور آپ کی تجویز یہ ہو کہ اس کو کاٹ دیا جائے تو صرف یہ کہنا کافی ہے کہ اس کو کاٹ دو۔ لیکن اگر آپ اس کو بالفعل کاٹنے لگیں تو بہت سے اور پہلوؤں کا اہتمام کرنا بھی ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ درخت جب کٹ کر گرے تو وہ آپ کے سر پر نہ گرے بلکہ خالی زمین میں گرے۔ اگر آپ اس قسم کا اہتمام کئے بغیر درخت کاٹنا شروع کر دیں اور وہ کٹ کر آپ کے سر پر گر پڑے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ایک مسئلہ ختم کرنے کے نام پر دوسرا زیادہ بڑا مسئلہ پیدا کر لیا۔ اسی طرح ملت کے معاملات میں اقدام سے پہلے اس سے متعلق تمام پہلوؤں کو سمجھنا اور ان کے بارے میں اہتمام کرنا ضروری ہے۔ ورنہ ملت کی تعمیر کے نام پر ایک "درخت" گرایا جائے گا اور عملاً صرف یہ ہو گا کہ ملت کی تعمیر تو نہ ہو گی البتہ بہت سے لوگوں کے سر ٹوٹ جائیں گے۔ آپ کا اقدام صرف نئے نئے مسئلے پیدا کرے گا مزید اس قیمت پر کہ اصل مسئلہ بدستور باقی رہے۔

یک طرفہ اقدام کی ضرورت

صلح حدیبیہ (۶ ھ) تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے۔ اس موقع پر مخالفین اسلام نے صلح کی جو شرطیں پیش کیں، ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بحث کے بغیر منظور کر لیا۔ یہ شرطیں سب کی سب مخالفینِ اسلام کے حق میں تھیں۔ چنانچہ جو مسلمان آپ کے ساتھ تھے ان کی اکثریت پر یہ صلح بے حد شاق گزری۔ حتی کہ بعض صحابہ یہ کہہ پڑے کہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔ اور کیا فریق ثانی باطل پر نہیں ہے۔ اگر ہم حق پر ہیں اور فریق ثانی باطل پر ہے تو ہم اس قسم کی ذلت آمیز شرائط پر صلح کیوں کریں۔

پیغمبر اسلامؐ اور عام مسلمانوں کے درمیان رائے کا یہ فرق کیوں ہوا۔ اس کو ایک لفظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ مسئلہ کو یک طرفہ طور پر دیکھ رہے تھے اور عام مسلمان دو طرفہ طور پر۔ عام مسلمانوں کا خیال تھا کہ کچھ ہم جھکیں اور کچھ وہ جھکیں۔ کچھ شرطیں ہماری مانی جائیں، کچھ شرطیں ان کی مانی جائیں۔ یعنی معاملہ کو دو طرفہ بنیاد پر طے کیا جائے۔ جب کہ پیغمبر اسلامؐ کا خیال تھا کہ ہم اس بحث کو نہ چھیڑیں کہ اس معاملہ میں کون حق پر ہے اور کون ناحق پر۔ اس بحث سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم یک طرفہ طور پر فریق ثانی کی پیش کی ہوئی شرطوں پر راضی ہو جائیں۔

مسلمانوں کی رائے خالص منطقی اعتبار سے بالکل درست تھی۔ نظری انصاف کے اعتبار سے یقیناً یہی ہونا چاہیے تھا کہ دونوں میں سے کوئی فریق ضد نہ کرے، بلکہ اصولی بنیاد پر جو بات صحیح ہے اس پر دونوں فریق راضی ہو جائیں۔

مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم معاملہ کو عملی نقطۂ نظر سے دیکھ رہے تھے۔ آپ جانتے تھے کہ اگر اصول اور منطق کی بنیاد پر اصرار کیا گیا تو فریق ثانی ہرگز راضی ہونے والا نہیں ہے۔ اس لیے عملی اعتبار سے مسئلہ کا ممکن حل صرف یہ ہے کہ فریقِ ثانی کی شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان لیا جائے۔ اس کا فوری فائدہ یہ ہوگا کہ دونوں فریقوں میں ٹکراؤ کی صورت حال ختم ہو جائے گی۔ اور مسلمانوں کے لیے کام کے مواقع نکل آئیں گے۔ دو طرفہ بنیاد پر اصرار عملاً دونوں فریقوں کے درمیان ٹکراؤ کو برقرار رکھنے کے ہم معنی تھا۔ جب کہ یک طرفہ بنیاد پر راضی ہونے کا مطلب یہ تھا کہ جنگی ٹکراؤ ختم

ہو، اور میدانِ جنگ سے باہر جو ممکن دائرہ ہے، اس میں مسلمانوں کے لیے دعوت اور تعمیر کی جدوجہد کی راہیں کھل جائیں۔

دورِ نبوت کا یہ واقعہ موجودہ حالات میں ہمارے لیے رہنما واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمان آج جن حالات میں گھرے ہوئے ہیں وہ انتہائی پیچیدہ ہیں۔ پچھلے پچاس سال کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ مسئلہ کا منطقی تجزیہ کرنا یا فریقِ ثانی کے سامنے اصولی مطالبات کا میمورنڈم پیش کرنا موجودہ حالات میں اتنا زیادہ بے فائدہ ہے کہ اس کی قیمت کاغذ کے اس ٹکڑے کے بقدر بھی نہیں ہے جس پر یہ منطقی اور اصولی مطالبات لکھے جاتے ہیں۔ اصولی مطالبہ صرف اس وقت بامعنی ہوتا ہے جب کہ فریقِ ثانی اصول کے آگے جھکنے کے لیے تیار ہو۔ اور موجودہ صورت حال میں اس کا کوئی ادنیٰ امکان بھی نہیں۔

مسلمان اب تک جو کچھ کرتے رہے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مسئلہ کو دو طرفہ بنیاد پر طے کرنا چاہتے ہیں۔ جب کہ مسئلہ کا واحد قابلِ عمل حل صرف یہ ہے کہ اس کو یک طرفہ بنیاد پر طے کیا جائے۔ اس وقت مسلمان جس صورت حال سے دوچار ہیں اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ مسلمانوں نے فرصتِ عمل کو کھو دیا ہے۔ ان کے لیے ممکن نہیں رہا ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے لیے کوئی تعمیری منصوبہ بنائیں اور اس کی طرف اپنا سفر شروع کریں۔ اگر مسلمان اس قربانی پر راضی ہو جائیں کہ وہ فریقِ ثانی سے اپنے تمام جھگڑوں کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیں تو اس کا نقد فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمان فوراً ہی اپنے لیے عمل کا موقع پالیں گے۔ جس کو وہ تقریباً نصف صدی سے کھوئے ہوئے ہیں۔ عمل کا موقع پانا گویا سفر کے آغاز کو پانا ہے۔ اور جو لوگ اپنے سفر کے آغاز کو پالیں وہ یقیناً ایک روز اپنے سفر کے اختتام کو پہونچ کر رہتے ہیں۔

یہ دنیا اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ یہاں جو نقصان کو برداشت کرے وہی فائدہ کو حاصل کرتا ہے۔ یک طرفہ طور پر مسئلہ کو ختم کرنا اسی اصول کی تعمیل ہے۔ یک طرفہ طور پر مسئلہ کو ختم کرنے پر راضی ہونا بلاشبہ اپنے اندر نقصانات کے پہلو رکھتا ہے مگر موجودہ دنیا میں کسی بھی قسم کی ترقی کا یہی واحد زینہ ہے۔ موجودہ دنیا کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ صرف فائدہ چاہیں ان کے حصہ میں آخر کار صرف نقصان آئے۔ اور جو لوگ ابتدائی نقصان کو برداشت کریں وہ بالآخر ہر قسم کے فائدوں کے مالک بنیں۔

سبق آموز

۳۱ اگست ۱۹۸۷ کی صبح کو تمام اخبارات یہ خبر لے کر آئے کہ ہرجندر سنگھ جندا اور ستنام سنگھ باوا کو دہلی میں گرفتار کر لیا گیا۔ جندا پنجاب کے انتہائی خطرناک دہشت پسندوں میں سے تھا۔ وہ خالصتان کمانڈو فورس میں "جنرل" کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے جنرل ویدیہ، للت ماکن ایم پی، ارجن داس کونسلر، کئی پولس افسر اور بیسیوں دوسرے افراد کو قتل کیا تھا۔ پنجاب نیشنل بنک لدھیانہ میں پانچ کرور روپیہ سے زیادہ کی ڈکیتی میں اسی کا ہاتھ تھا۔ وغیرہ۔ گرفتاری کے وقت اس کے پاس سے نہایت خطرناک ہتھیار، پانچ لاکھ روپے نقد، بہت سا سونا اور دوسری چیزیں برآمد ہوئیں۔ اس گرفتاری کے ذیل میں بہت سی تفصیلات اخباروں میں آئی ہیں۔ ان میں سے ایک جزء یہ تھا کہ:

> The police found in Jinda's pocket some powder which they suspect is cyanide. Jagdish Singh had swallowed cyanide when he was taken to the police post at Paharganj. If Jinda had died, it would have robbed the police of a chance to interrogate him and obtain vital information (p.3).

پولس نے نہایت صحیح وقت پر اس کو پکڑ لیا۔ کیوں کہ یہاں ایک اور خطرہ تھا۔ جندا خودکشی کر سکتا تھا جیسا کہ جگدیش سنگھ زیلا والا نے دو سال پہلے کیا تھا۔ پولیس کو جندا کی جیب میں کچھ سفوف ملا ہے جس کے متعلق ان کا خیال ہے کہ وہ سائنائڈ زہر ہے۔ جگدیش سنگھ نے اس وقت سائنائڈ کھا لیا تھا جب کہ وہ پہاڑ گنج کی پولیس چوکی کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ اگر جندا مر جاتا تو پولیس کے لیے یہ موقع ختم ہو جاتا کہ وہ اس سے سوالات کرے اور اہم معلومات حاصل کرے۔ (انڈین اکسپریس یکم ستمبر ۱۹۸۷)

دہشت پسند تنظیم کا کوئی شخص اگر زندہ حالت میں پولیس کے قبضہ میں چلا جائے تو پولیس اس پر ناقابل برداشت سختیاں کر کے اس سے تمام راز اگلوا سکتی ہے، اور پھر پوری تنظیم کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ ایسی حالت میں دہشت پسند فوراً خودکشی کر لیتا ہے۔ وہ اپنا وجود مٹا دیتا ہے تاکہ اپنی تنظیم کے وجود کو بچا سکے۔

یہی قربانی جماعتوں کی زندگی کی ضمانت ہے، خواہ وہ تخریبی جماعت ہو یا تعمیری جماعت۔ موجودہ دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ فرد کے تقاضے اور جماعت کے تقاضے میں ٹکراؤ پیدا ہوجاتا ہے۔ ایسی حالت میں فرد کو چاہیے کہ وہ اپنے کو "ہلاک" کرلے تاکہ جماعت کو زندگی حاصل ہوسکے۔

تاہم جسمانی قتل اس قربانی کی سب سے چھوٹی صورت ہے۔ اس راہ کی زیادہ بڑی قربانی وہ ہے جس کو حیاتی قتل یا نفسیاتی ہلاکت کہا جاسکتا ہے۔ پہلا اگر جہادِ اصغر ہے تو دوسرا جہادِ اکبر۔

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ فرد کو اپنی حق تلفی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی انا کو چوٹ لگتی ہے۔ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو اس کے اندر منفی جذبات کو جگا دیتے ہیں۔ وہ اتحاد کے بجائے اختلاف کی باتیں سوچنے لگتا ہے۔

ایسے تمام مواقع پر اس کو وہی کام کرنا ہے جو دہشت پسند تنظیم کا ایک ممبر کرتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ دہشت پسند تنظیم کا ممبر اپنے جسم کو قتل کرتا ہے، مگر تعمیری اجتماعیت کے رکن کو ایسے موقع پر اپنے احساس کو قتل کرنا ہے۔ اس کو اپنی منفی نفسیات کو پوٹاشیم سائنائڈ کی خوراک کھلانا ہے۔

جس اجتماعیت کو ایسے افراد مل جائیں، اس کو دنیا کی کوئی رکاوٹ کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے روک نہیں سکتی۔

اجتماعیت کو زندگی دینے کے لیے انفرادی نفسیات کا یہ قتل ہر حال میں ضروری ہے۔ حتیٰ کہ پیغمبر کے زمانہ کی اجتماعیت بھی اس ناگزیر قربانی کے بغیر قائم نہیں ہوسکی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپ کے مقدس ساتھیوں نے بار بار اس قسم کی نفسیاتی خودکشی کی قربانی دی۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ عرب میں وہ طاقت ور اجتماعی ہیئت ظہور میں آئی جو سارے عالم کی قسمت بدل دے، اور انسان کو ایک نئے تاریخی دور میں داخل کردے۔ فرد کی ہلاکت پر اجتماع کو زندگی ملتی ہے، اجتماع کی زندگی کا اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں۔

جب دین مشتبہ ہوجائے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ شیاطین نے مشرکوں کی نگاہ میں اس بات کو مزین کر دیا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کریں۔ اس طرح شیاطین ان کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں اور ان کے دین کو ان کے اوپر مشتبہ کر رہے ہیں (وکذٰلک زین لکثیر من المشرکین قتل اولادھم شرکاؤھم لیردوھم ولیلبسوا علیھم دینھم ، انعام ۱۳۸)

عرب کے مشرک قبائل میں یہ رواج تھا کہ وہ مختلف نام سے اپنی اولاد کو قتل کر دیتے تھے۔ مثلاً کچھ لوگ سسر بننے کو اپنے لئے شرم کی چیز سمجھتے اور اپنی بیٹیوں کو قتل کر دیتے۔ کچھ لوگ افلاس کا شکار ہوتے اور اس اندیشہ کی بنا پر اپنی اولاد کو قتل کر دیتے کہ کیسے کھلائیں گے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ منت مانتے کہ اگر اتنے بیٹے ہوجائیں یا فلاں مراد پوری ہوجائے تو ایک بیٹا فلاں بت کے نام پر ذبح کر دیں گے وغیرہ۔ یہ سراسر ظلم اور گمراہی کا فعل تھا۔ مگر وہ اس کو بڑی عبادت اور قربت کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔

قتل اولاد کی یہ رسم پہلے یہود کے یہاں بھی پائی جاتی تھی۔ پھر وہ عرب قبائل میں رائج ہوئی۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ تمام تر مذہبی تھی۔ دونوں حضرت ابراہیم کو اپنا سب سے بڑا بزرگ مانتے تھے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ شیطان نے ان کو یہ رسم سنتِ ابراہیم کے طور پر سکھائی۔ انھوں نے حضرت اسماعیل کی قربانی کے واقعہ کی غلط تعبیر کر کے یہ سمجھا کہ اولاد کو قتل کرنا کوئی بڑا مقدس عمل ہے۔ یہ وہ عمل ہے جس کو خدا کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے انجام دیا۔ اس کے نتیجہ میں آپ کے اوپر خدا کے غیر معمولی انعامات ہوئے، وہ بھول گئے کہ حضرت ابراہیم کا فعل براہ راست خدا کے خصوصی حکم کے تحت تھا۔ نیز آنجناب کو بھی وہ صرف خواب میں تمثیلی طور پر دکھایا گیا۔ عملاً اللہ نے ان سے جو چیز قبول کی وہ جانور کا ذبیحہ تھا۔ اور اولاد کا "ذبح" آپ کے لئے یہ قرار پایا کہ اپنے بیٹے کو کعبہ (خدا کے دین کی خدمت) کے لئے وقف کر دیں۔

حضرت ابراہیم کے واقعہ میں اصل نمونہ یہ تھا کہ اپنے بیٹے کو صرف دنیا کمانے کا ذریعہ نہ بناؤ۔ بلکہ اس کو خدا کے دین کی خدمت میں لگاؤ۔ یہ آخرت کی طلب میں دنیا کی طلب کو قربان کرنا تھا۔ یہ اپنے ذاتی مستقبل کی تعمیر کے بجائے دین کی تعمیر سے خوشی حاصل کرنے کا پیغام تھا۔ مگر شیطان نے سنت ابراہیمی کے نام پر لوگوں کو ایک لایعنی رسم میں الجھا دیا۔ لوگ خدا کا نام لیتے ہوئے شیطان کے راستہ پر چل پڑے۔ یہی دین کو لوگوں کے اوپر مشتبہ کرنا ہے۔

یہ شیطان کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے کہ وہ اصل دین کے بارے میں لوگوں کے اندر اشتباہ پیدا کر دیتا ہے۔ وہ ایک دینی چیز کو لے کر اس کی غلط تصویر لوگوں کے ذہن میں بٹھاتا ہے۔ وہ لوگوں کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ دین کے نام پر بے دینی کا فعل شروع کر دیں۔ وہ حقیقۃً دین سے دور ہوں مگر ایک بیہودہ عمل کر کے یہ سمجھیں

کہ وہ عین دین خداوندی کی تکمیل کر رہے ہیں۔

عرب کے مشرکین نے حضرت ابراہیم کے ایک واقعہ سے غلط طور پر ذبح اولاد کی رسم نکالی۔ یہود نے حضرت سلیمان کی زندگی کے ایک پہلو کو جادو اور عملیات کا کاروبار کرنے کے حق میں استعمال کیا۔ عیسائیوں نے حضرت مسیح کی غیر شادی شدہ زندگی سے ترک نکاح کا مقدس طریقہ اخذ کر لیا۔ یہ سب سراسر گمراہی کے فعل ہیں۔ وہ بظاہر نبی کے ایک فعل سے مشابہ ہونے کے باوجود نبی کی تعلیمات کے بالکل خلاف ہیں۔ تاہم جن لوگوں نے ان کو اختیار کیا وہ لوگوں کو یہی باور کراتے رہے کہ وہ پیغمبر کے اسوہ پر عمل کر رہے ہیں۔

اس طرح شیطان لوگوں کو ایک دینی عمل کے نام پر کسی لایعنی کام میں الجھا دیتا ہے۔ وہ دین کے معاملہ میں لوگوں کو مشتبہ کر کے ان کو دین سے دور کر دیتا ہے۔ وہ ایک بے دینی کے کام میں مشغول ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ عین دینی کام کر رہے ہیں۔

یہ معاملہ صرف پچھلی قوموں کے ساتھ مخصوص نہیں۔ امت مسلمہ کے افراد بھی مختلف طریقوں سے اس بے راہی میں پڑ سکتے ہیں۔ وہ پیغمبر اسلام کی زندگی یا آپ کی تعلیمات کے کسی پہلو کی غلط تعبیر کر کے دین میں ایسی بدعت داخل کر سکتے ہیں جس پر بظاہر دین کا لیبل لگا ہوا ہو مگر اس کا دین خداوندی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ اپنی خواہشات پر چلیں اور اس کو دین کی اصطلاحوں میں بیان کریں۔ وہ دنیا پرستانہ سیاست چلائیں اور اس کو آخرت کا راستہ قرار دیں۔ وہ اپنے قومی جذبات کے تحت اٹھیں اور یہ ظاہر کریں کہ وہ عین اسلام کی خاطر ایسا کر رہے ہیں۔

ایسے لوگوں کو عام طور پر بہت جلد مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ خدا کے دین کو اس سطح پر اتار لاتے ہیں جہاں لوگ عملاً جی رہے ہیں۔ وہ لوگوں کی خواہش پرستی کے لئے دینی جواز فراہم کر دیتے ہیں۔ لوگ اس غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ اپنی جگہ سے کھسکے بغیر وہ دین کو اس کی کامل صورت میں پا گئے ہیں۔ دین کو کچھ دئے بغیر انھوں نے اس کا سب کچھ حاصل کر لیا ہے۔

دین کی ایک حقیقت ہے اور اس کے کچھ خارجی مظاہر۔ مظاہر کو اگر حقیقت کی روشنی میں سمجھا جائے تو ہر چیز اپنے صحیح مقام پر رہتی ہے۔ اس کے برعکس اگر حقیقت کو مظاہر کی روشنی میں دیکھا جانے لگے تو عجیب عجیب تعبیرات ظہور میں آتی ہیں۔ اب خدا کا پیغمبر کسی کو اشتراکی لیڈر دکھائی دینے لگتا ہے۔ قرآن کسی کے لئے دنیوی معاملات کی کنجی بن جاتا ہے۔ کوئی جماعت کی نماز کو فوجی ٹریننگ سمجھ لیتا ہے۔ کسی کو پورا دین سیاست کے روپ میں نظر آتا ہے۔ اس طرح ہر آدمی دین کی الگ الگ تصویر بنا لیتا ہے جو اس کے اپنے ذہن کے پوری طرح مطابق ہوتی ہے مگر اصل حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

انبیاء اور ان کے ساتھی "گھر" سے محروم کیوں رکھے گئے۔ اس کا جواب ہم کو ایک حدیث میں ملتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ نے فرشتہ کے ذریعہ میرے پاس یہ پیغام بھیجا کہ مکہ کی وادی کو تمھارے لئے سونا بنا دیا جائے۔ میں نے کہا اے میرے رب نہیں۔ بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک روز کھاؤں اور ایک روز بھوکا رہوں۔ تاکہ جب مجھے بھوک ستائے تو میں تجھ سے عاجزی کروں اور جب مجھے سیری حاصل ہو تو میں تیرا شکر کروں اور تیری تعریف کروں"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حالات کے بغیر کیفیات پیدا نہیں ہوسکتیں۔ انبیاء دنیا کی زندگی میں "گھر والے" نہیں بنائے گئے۔ انھوں نے دنیا کے سرد و گرم کے درمیان بے گھر ہونے کا مزہ چکھا تاکہ آخرت کے گھر کی تڑپ ان کے اندر کمال درجہ میں پیدا ہو، آخرت میں بے جگہ ہوجانے کی حقیقت ان کے اوپر پوری طرح کھل جائے۔ جنت کے مکانات سے محرومی کے بعد انسان کا کیا حال ہوگا، اس کا احساس ان کے اندر شدت سے ابھر آئے۔ پیغمبروں کا مشن یہ تھا کہ وہ دنیا والوں کو آخرت کے معاملہ کی سنگینی سے پوری طرح باخبر کردیں۔ وہ لوگوں کو بتا دیں کہ جو شخص آخرت میں بے گھر ہوگیا، اس کے لئے ابدی عذاب کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس قسم کی ایک دعوت وہی شخص دے سکتا ہے جو موت سے پہلے موت کے بعد کے احوال کو دیکھنے لگا ہو۔ جو شخص اس مقام پر نہ ہو اس کے کلام میں آخرت کی ٹیسیں شامل نہیں ہوسکتیں اور جس کے کلام میں آخرت کی ٹیسیں شامل نہ ہوں اس کا آخرت کی پیغام رسانی کے لئے اٹھنا ایک قسم کی شاعری ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں دعوت۔ ایسا داعی اس شخص کی مانند نہیں ہوسکتا جو ایک منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور پھر دوسروں کو اسے دکھاتا ہے۔

اگرچہ آدمی کے عجز کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے رب سے عافیت مانگے۔ وہ ہمیشہ یہ التجا کرے کہ اللہ اس کو کسی مشکل میں نہ ڈالے۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ آدمی کی خدا پرستی جب تک اس کو اپنی طرف اس طرح نہ کھینچ لے کہ دوسری تمام مصلحتوں کے سرے اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائیں، وہ حقیقی معنوں میں خدا والا نہیں بن سکتا۔ جب تک اس کا یہ حال نہ ہو کہ آخرت کے شوق میں اس کی دنیا برباد ہوجائے، اس وقت تک وہ اگلی دنیا کی تجلیات کا مشاہدہ نہیں کرسکتا۔ جب تک اس کی جنت کی طلب اس درجہ کو نہ پہنچ جائے کہ دنیا میں گھر بنانا اس کو یاد نہ رہے، اس وقت تک وہ جنت کی حقیقت سے آشنا نہیں ہوسکتا۔ دنیا میں خانہ بربادی کا تجربہ کرنے کے بعد ہی آدمی آخرت میں خانہ آبادی کی اہمیت اور معنویت کو سمجھتا ہے۔ اس کے بعد ہی اس کے اندر وہ داعیانہ سنجیدگی پیدا ہوتی ہے جو اس کو آخرت کا منذر اور مبشر بنا سکے۔ داعی کا کلام آخرت میں بسا ہوا کلام ہوتا ہے اور کوئی شخص جب تک آخرت کی طلب میں اس انتہا تک نہ جائے کہ اس کی خاطر اس کی زندگی برباد ہوجائے، وہ آخرت میں بسے ہوئے الفاظ میں کلام نہیں کرسکتا۔

گھر کا لفظ ابتدائی طور پر اس در و دیوار کے لئے بولا جاتا ہے جہاں آدمی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روز و شب گزارتا ہے۔ مگر اس کے آگے آدمی کا ایک اور گھر ہے۔ یہ اعوان و انصار کا وہ حلقہ ہے جو کسی کے لئے دوستوں اور رشتہ داروں کے ذریعہ بنتا ہے اور کسی کے لئے اس کے معتقدین اور متاثرین کے ذریعہ کسی کے لئے گاہکوں (Clients) اور چندہ دہندگان کے ذریعہ بنتا ہے اور کسی کے لئے تالیاں بجانے والے اور استقبال کرنے والے عوام کے ذریعہ۔ یہ حلقہ یا دائرہ

خواص کے لئے اتنا ہی اہم ہوتا ہے جتنا ایک عام آدمی کے لئے ایک اچھا گھر۔ کوئی قائد ایسے ایک حلقہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے جب کسی خوش قسمت انسان کے گرد ایسا حلقہ بن جائے تو ہر قیمت پر وہ اس کو باقی رکھنا ضروری خیال کرتا ہے۔ حالاں کہ یہ "حلقہ" ہی وہ چیز ہے جو خواص کے لئے سب سے زیادہ قاتل ثابت ہوتا ہے۔

ایک آدمی جب آخرت کے لئے فکر مند ہوتا ہے تو وہ دنیا میں اپنے گھر کو برباد کر لیتا ہے۔ یہی معاملہ خواص کے ساتھ پیش آتا ہے۔ جو شخص حقیقی معنوں میں آخرت کو اپنا مسئلہ بنائے گا اس کے ساتھ لازماً یہ ہوگا کہ دنیا میں اس کا حلقہ ٹوٹنے لگے گا۔ اخروی مصلحتوں کی طرف جھکاؤ کی وجہ سے وہ دنیوی مصلحتوں کی رعایت نہ کر سکے گا۔ خدا کو خوش کرنے کی کوشش میں وہ بندوں کو ناراض کرے گا۔ اس کی مقبولیت نامقبولیت میں تبدیل ہو جائے گی۔ استقبالیہ دینے والے اس کو نظر انداز کریں گے۔ شان دار خطابات کے بجائے اس کو برے الفاظ کا تحفہ پیش کیا جائے گا۔ لوگوں کی نظر میں باعزت بننے کے بجائے لوگوں کی نظر میں وہ حقیر ہو جائے گا۔ ادارے اور کانفرنسیں اس کو دعوت نامے روانہ کرنا بھول جائیں گی۔ کسی زندہ انسان کے لئے بلاشبہ یہ بڑا سخت امتحان ہے۔ مگر جب تک آدمی اس امتحان کی بھٹی پر نہ پہنچے وہ اعلیٰ ایمانی کیفیات کا تجربہ نہیں کرتا، وہ خدا کی طرف سے بولنے کے قابل نہیں ہوتا۔

آخرت کا داعی وہی بن سکتا ہے جو آخرت کے مسئلہ میں شدت احساس سے پگھل رہا ہو۔ یہ شدت ایک ایسے شخص میں پیدا نہیں ہو سکتی جو دنیا کی زندگی میں "گھر والا" بنا ہوا ہو۔ اس قسم کی آتشیں کیفیت کا مالک تو وہی شخص ہو سکتا ہے جو دنیا میں بے گھر اور بے یار و مدد گار ہو جائے۔ ایسے ہی ایک انسان کے اندر وہ احساس محرومی جاگتا ہے جو اس کو پانے کے لئے بے تاب کر دے۔ اپنی نفسیاتی کیفیت کے اعتبار سے یہی وہ شخص ہوتا ہے جو لوگوں کو آخرت سے اس طرح ہوشیار کرے جیسے کہ لوگ آگ کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں۔ جس کو آگ کی لپٹیں لگ رہی ہوں وہی جانتا ہے کہ آگ کیا ہے اور وہی اس قابل ہے کہ آتشیں الفاظ میں لوگوں کو آنے والے خطرہ سے آگاہ کرے۔ جو محرومی کی زمین پر کھڑا ہو وہی یافت کا پیغام بر بن سکتا ہے۔ جس نے محرومی کا تجربہ نہیں کیا، اس کے لئے یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ لوگوں کو آخرت کی محرومی کے مسئلہ سے ہوشیار کرنے والا بنے ——— لوگ جس چیز کو بچانے میں لگے ہوئے ہیں اسی کو کھونے میں ان کی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔

لوگ ایسے کاموں کی طرف دوڑتے ہیں جن میں کچھ کئے بغیر "مصلح ملت زندہ باد" کے استقبالئے ملتے ہوں۔ جس میں صرف کچھ الفاظ بول کر عمل اور جد و جہد کا خطاب عطا کیا جاتا ہو۔ جس میں ایک تقریری نمائش پر شہرت اور عزت کے خزانے لٹائے جاتے ہوں۔ جس میں نعروں اور جھنڈوں کی سیاست چلانے پر آسمانی نظام قائم کرنے کا کریڈٹ ملتا ہو۔ جس میں آدمی دوسروں سے چندہ لے کر لاکھ روپیہ کی تھیلی بنائے اور پھر ہوائی جہاز میں اڑ کر "مظلومین" کی امداد کے لئے سفر کرے ——— ہر آدمی جھوٹے الفاظ کی ایک ڈکشنری لئے ہوئے ہے، صرف اس لئے کہ جھوٹے الفاظ کی ڈکشنری دنیا کے بازار میں سب سے زیادہ دھوم کے ساتھ بکتی ہے۔ کاش لوگوں کو معلوم ہوتا کہ اس دنیا میں سب سے قیمتی سودا وہ ہے جو بکنے سے رہ گیا ہو۔ کیوں کہ خدا خود اس کا خریدار ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کسی کے نزدیک اسلام ایک عملیاتی نسخہ ہے ، اپنی زندگی کے ساتھ اسلام کے عملیاتی ضمیمہ کو جوڑ لو اور سیدھے جنت میں پہنچ جاؤ۔ کوئی سارے معاملہ کو بزرگوں کا معاملہ سمجھتا ہے ، کسی زندہ یا مردہ بزرگ کا دامن تھام لو اور ان کی برکت سے دونوں جہان کی نعمتیں سمیٹ لو۔ کچھ لوگ ہیں جن کو خوش قسمتی سے اور بھی زیادہ کامیاب طریقہ حاصل ہوگیا ہے ، شاندار تقریریں کرو اور اس کے بعد دنیا میں لیڈری ہے اور آخرت میں جنت الفردوس ۔

یاد رکھئے ۔ جنت اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے کہ اس قسم کے سستے سکوں سے حاصل ہو جائے ۔

کوئی شخص ایسا نہیں کرے گا کہ اپنے لڑکے کو "کامیاب ڈاکٹر" بنانے کے لئے اس کو عملیاتی وزشیں کرانے لگے ۔ یا لڑکے کو کسی پہنچے ہوئے درویش سے بیعت کرائے اور ان کی برکت کے بھروسے پر بیٹھ جائے ۔ یا "ڈاکٹر کانفرنس" کے پنڈال پر لڑکے کو ہار پہنا کر سمجھ لے کہ اس نے بیٹے کا کلینک کھولنے کا یقینی انتظام کر لیا ہے ۔ مگر عجیب بات ہے کہ اسلام کے بارے میں لوگوں نے اسی قسم کے سستے نسخوں پر امیدوں کے عالی شان محل بنا رکھے ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ آخرت اسی طرح سرگرمیوں کی ایک زیادہ اعلیٰ جگہ ہے جس کا ایک اسفل نمونہ ہم موجودہ دنیا میں دیکھ رہے ہیں ۔ آج کی دنیا میں کوئی مقام اسی کو ملتا ہے جو اس کی قابلیت پیدا کرے ۔ اسی طرح آخرت کے مناصب اور مقامات پر وہی لوگ فائز کئے جائیں گے جنھوں نے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کیا ہو :

قد افلح من زکّٰھا و قد خاب من دسّٰھا (شمس) — مراد کو پہنچا جس نے اپنے جی کو سنوارا اور نامراد ہوا جس نے اس کو خاک میں ملایا (ترجمہ شاہ عبدالقادرؒ)

قوم ثمود کے سامنے ایک اونٹنی ظاہر ہوئی ۔ انھوں نے چاہا کہ اس کو ہلاک کر دیں ۔ ان کے رسول نے ان کو متنبہ کیا کہ اس کو تم "اونٹنی" کا معاملہ نہ سمجھو ۔ یہ ایک خدائی معاملہ ہے ۔ مگر ان کی سمجھ میں بات نہ آئی ۔ انھوں نے خدا کی نشانیوں کو دیکھنے کے لئے اپنی آنکھوں کو اندھا بنا رکھا تھا ۔ ان کو "اونٹنی" دکھائی دی ۔ مگر خدا نظر نہ آیا ۔ انھوں نے بڑھ کر اونٹنی کو مار ڈالا ۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ برتری اور بہادری کا ٹائٹل لے رہے ہیں ۔ حالاں کہ ایسا کر کے وہ اپنے اندھے پن کا ثبوت فراہم کر رہے تھے ۔ وہ بھول گئے کہ آخرت کی دنیا ان لوگوں کے لئے ہے جو اس بات کا ثبوت دیں کہ وہ "اونٹنی" سے گزر کر خدا کو دیکھنے کی استعداد رکھتے ہیں ۔ جن کو اونٹنی نظر آئے مگر خدا نظر نہ آئے ، وہ خدا کے نزدیک صرف اندھے ہیں اور اسی حال میں وہ اگلی دنیا میں اٹھائے جائیں گے :

> "جس نے میری نصیحت سے منھ پھیرا ، اس کے لئے تنگ گزران ہے ۔ قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے ۔ وہ کہے گا اے میرے رب ! کیوں تو نے مجھ کو اندھا اٹھایا ، دنیا میں تو میں آنکھ والا تھا ۔ جواب ملے گا کہ اسی طرح پہنچی تھیں تمھارے پاس ہماری نشانیاں پس تم نے ان کا کچھ خیال نہ کیا ۔ اسی طرح آج تمھارا کچھ خیال نہ کیا جائے گا ۔ (طٰہٰ)

دنیا میں جن لوگوں نے "اندھے پن" کا ثبوت دیا ہو وہ آخرت میں "بینائی" کے مناصب پر کیسے فائز کئے جا سکتے ہیں ۔

بیہقی نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قریش کے سردار ایک روز مکہ میں جمع ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ اپنے اندر سے ایک ایسے شخص کا انتخاب کرو جو سحر اور کہانت اور شاعری کا بہترین جاننے والا ہو اور اس کو محمدؐ کے پاس بھیجو۔ اس شخص نے ہماری جماعت میں تفریق ڈال دی ہے۔ ہمارے معاملہ کو منتشر کر دیا ہے اور ہمارے دین کو عیب لگایا ہے۔ وہ محمدؐ سے جاکر بات کرے اور دیکھے کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ اس کام کے لئے ہم عتبہ بن ربیعہ سے بہتر کسی شخص کو نہیں جانتے۔

اس کے بعد عتبہ بن ربیعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کہا اے محمدؐ، تم بہتر ہو یا تمھارے باپ عبداللہ بہتر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چپ رہے، عتبہ نے دوبارہ کہا، تم بہتر ہو یا تمھارے دادا عبدالمطلب بہتر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب بھی چپ رہے۔ عتبہ نے کہا، اگر تمھارا یہ خیال ہو کہ یہ لوگ تم سے بہتر تھے تو انھوں نے انھیں معبودوں کی پرستش کی ہے جن کو تم عیب لگاتے ہو۔ اور اگر تمھارا خیال یہ ہو کہ تم ان سے بہتر ہو تو تم اپنی بات کہو تاکہ ہم سنیں۔ عتبہ جب اپنی بات سے فارغ ہو چکا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر سورہ حٰم سجدہ کی ابتدائی تیرہ آیتیں پڑھیں۔

یہاں تک کہ آپ پڑھتے ہوئے اس آیت پر پہنچے کہ ——— پس اگر وہ اعراض کریں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم کو اسی طرح کے صاعقہ (کڑکے) سے ڈراتا ہوں جیسا کڑکا عاد اور ثمود پر نازل ہوا (۱۳) عتبہ نے اس کو سن کر کہا: بس، کیا اس کے سوا کچھ اور تمھارے پاس نہیں۔ آپ نے کہا نہیں۔ عتبہ قریش کے پاس واپس آیا۔ اس کے بعد عتبہ اور قریش کے درمیان گفتگو کی جو روداد نقل ہوئی ہے اس کے چند الفاظ یہ ہیں:

مافہمتُ شیئا مما قال غیر انہ انذرکم صاعقۃً مثل صاعقۃ عاد وثمود۔ قالوا ویلک یکلمک الرجل بالعربیۃ لا تدری ماقال۔ قال لا واللہ مافہمت شیئا مما قال غیر ذکر الصاعقۃ	انھوں نے جو کہا میں اس کو کچھ نہیں سمجھا، سوا اس کے کہ انھوں نے تم کو عاد و ثمود جیسے کڑکے سے ڈرایا۔ قریش نے کہا، تمھارا برا ہو، آدمی تم سے عربی زبان میں کلام کرتا ہے اور تم سمجھے نہیں کہ اس نے کیا کہا۔ عتبہ نے کہا۔ خدا کی قسم میں کڑکے کے ذکر کے سوا اور کچھ نہیں سمجھا۔

قرآن کی اکتالیسویں سورہ کی یہ آیتیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عتبہ بن ربیعہ کو سنائیں ان کو پڑھئے اور پھر غور کیجئے کہ ان آیتوں میں جو بات کہی گئی ہے وہ عتبہ کی سمجھ میں کیوں نہ آسکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآنی الفاظ کے عربی مفہوم کو تو وہ جانتا تھا مگر ان کے اندر چھپے ہوئے معانی سے وہ ناآشنا تھا۔

ان آیتوں میں آخرت کی اہمیت کا ذکر ہے جب کہ عتبہ صرف دنیا کی اہمیت سے باخبر تھا۔ ان میں خدا کی بڑائی کا چرچا ہے جب کہ عتبہ صرف انسانوں کی بڑائی سے آشنا تھا۔ ان میں کائنات کو خدائی نشانی کی حیثیت

سے پیش کیا گیا ہے جب کہ عتبہ کائنات کو صرف ایک مادی نشانی کی حیثیت سے جانتا تھا۔ عتبہ کے جینے کی سطح وہ نہ تھی جو قرآن کی سطح ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ قرآن کے ان قیمتی الفاظ میں چھپی ہوئی معنویت کو سمجھنے سے عاجز رہا۔

حقیقت اتنی لطیف چیز ہے کہ وہ لفظوں کی پکڑ میں نہیں آتی۔ الفاظ محدود ہوتے ہیں اور حقیقت غیر محدود۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ حقیقت کو لفظوں میں ڈھالا جا سکے۔ آپ کسی کے کان میں الفاظ داخل کر سکتے ہیں مگر کسی کے کان میں معانی کو داخل نہیں کیا جا سکتا۔ جو آدمی ٹیلی وژن کے بارے میں کچھ نہ جانتا ہو اس کو محض "ٹیلی وژن" کا لفظ بول کر آپ ٹیلی وژن سے باخبر نہیں کر سکتے۔ کوئی بات ہمیشہ لفظوں کے ذریعہ کہی جاتی ہے مگر الفاظ اصل بات کی علامت ہیں نہ کہ اصل بات کا بدل۔ وہ کون سا لفظ ہے جس میں آپ پھول کی خوشبو بھر سکیں۔ وہ کون سا لفظ ہے جس میں آپ سورج کی گرمی داخل کر سکیں۔ وہ کون سا لفظ ہے جو کہکشاں کی وسعتوں کی نمائندگی کر سکے۔

جو شخص پھول اور سورج اور کہکشاں سے واقف ہو اسی کے لئے پھول اور سورج اور کہکشاں کے الفاظ کوئی معنی رکھتے ہیں۔ مگر جو شخص پھول اور سورج اور کہکشاں کے بارے میں کوئی ذاتی واقفیت نہ رکھتا ہو اس کو محض یہ الفاظ بول کر آپ قدرت کے ان حیرت ناک واقعات سے متعارف نہیں کر سکتے جن کو پھول اور سورج اور کہکشاں کہا جاتا ہے۔ آپ پھول کا لفظ بول کر کسی کو اس کی خوشبو نہیں سنگھا سکتے۔ آپ سورج کا لفظ بول کر کسی کو اس کی روشنی اور حرارت کا تجربہ نہیں کرا سکتے۔ آپ کہکشاں کا لفظ بول کر کسی کو کہکشاں کی وسعتوں کا مشاہدہ نہیں کرا سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو جانے اسی کو بتایا جا سکتا ہے۔ جو نہ جانے اس کو کوئی بات بتانا ممکن نہیں۔ جہاں لوگ صرف الفاظ کی زبان سمجھتے ہوں وہاں معانی کی زبان میں کوئی نغمہ کس کے لئے چھیڑا جائے۔ جہاں لوگ صرف ظاہری حقیقتوں کو جانتے ہوں وہاں چھپے ہوئے حقائق سے پردہ کس کے لئے اٹھایا جائے۔ جہاں لوگ صرف اپنی ذات کی سطح پر جیتے ہوں وہاں اپنی ذات سے بلند سطح کی باتوں کا اظہار کس کے لئے کیا جائے۔ جہاں لوگ صرف شور وغل کو کام سمجھتے ہوں وہاں خاموش منصوبہ کا راز کھولا جائے تو کون ہوگا جو اس کو سنے اور کون ہوگا جو اس کو سمجھے۔ جب لوگوں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہو تو کیسے لوگوں کو بتایا جائے کہ یہاں ایک روشن سورج چمک رہا ہے۔ جب لوگوں نے اپنے کانوں میں ڈاٹ لگا رکھے ہوں تو کیسے ان کو باخبر کیا جائے کہ یہاں ہرے بھرے درخت حمد الٰہی کے نغمے سنا رہے ہیں ——— خدا منتظر ہے کہ کوئی اس کا نغمہ چھیڑے، کوئی اس کی حمد کا ترانہ سنائے۔ مگر انسانوں کے بھرے ہوئے سمندر میں کوئی نہیں جو خدا کا نغمہ گائے، جو آخرت کی بانسری بجائے۔ جو فرشتوں کے چھیڑے ہوئے تاروں سے ہم آواز ہو کر حقیقتِ اعلیٰ کے گیت گائے۔

حکومت کا تصور

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کا حکومت پانا اور کسی کا حکومت سے محروم ہو جانا تمام تر اللہ کے اختیار کی چیز ہے "کہو، خدایا ملک کے مالک، تو جس کو چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے حکومت چھین لے۔ جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے (آل عمران ۲۶) اس کے بعد دوسری چیز جو قرآن سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ حکومت مسلمانوں کے لئے ایک امر موعود ہے، وہ ان کو اللہ کے انعام کے طور پر ملتی ہے "اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو زمین میں اقتدار دے گا جس طرح پچھلوں کو اقتدار دیا تھا، اور ان کے لئے ان کے دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جس کو اللہ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری بندگی کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔ اور جو اس کے بعد انکار کرے تو وہی لوگ فاسق ہیں (نور ۵۵) پھر حکومت ملنے کے بعد مسلمان کیا کرتے ہیں، اس کا جواب قرآن کے ان لفظوں میں ملتا ہے "وہ لوگ جن کو ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ ادا کریں گے۔ بھلائیوں کا حکم دیں گے اور برائیوں سے روکیں گے اور تمام معاملات کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے (حج ۴۱)

اوپر کی آیات سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ حکومت کا تعلق اللہ کی ان مصلحتوں سے ہے جن کے تحت وہ دنیا کا انتظام کر رہا ہے، اپنی انتظامی مصالح کے تحت اللہ کسی سے اقتدار چھینتا ہے اور اس کو کسی کے حوالے کرتا ہے۔ کسی کے پاس حکومت آگئی ہو تو اس کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ حکومت ہمیشہ کے لئے اس کی موروثی چیز بن گئی۔ اسی طرح یہ بھی درست نہیں کہ حکومت کو نشانہ بنا کر کوئی جدوجہد چلائی جائے۔ کیوں کہ حکومت کسی کو اپنی جدوجہد کی بنا پر نہیں ملتی۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو خدا کی طرف سے کسی کو دی جاتی ہے اور کسی کو نہیں دی جاتی۔

حکومت کی تقسیم میں اللہ کے یہاں سب سے پہلے جو گروہ قابل ترجیح ہے وہ اہل ایمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے وفادار بندوں کو حکومت و اقتدار عطا کرے گا مگر اس وعدہ کا تعلق کسی نسلی گروہ سے نہیں ہے بلکہ ان اہل ایمان سے ہے جو حقیقی معنوں میں اللہ کے مومن ہوں اور حقیقی معنوں میں عمل صالح کا ثبوت دیں۔ یہ وہ نیک بندے ہیں جو اپنے پورے وجود کے ساتھ اللہ کو اپنا مرکز توجہ بنا لیتے ہیں وہ اپنی محبتوں اور عقیدتوں میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے۔ وہ صرف اللہ سے ڈرتے ہیں اور اپنی زندگی کو اسی کی مرضی کے مطابق ڈھالتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کے نزدیک اس کے مستحق قرار پاتے ہیں کہ وہ ان کو حکومت و اقتدار عطا کرے۔ یہ حکومت مسلمانوں کے لئے کوئی "عہدہ" کی چیز نہیں ہوتی بلکہ "ذمہ داری" کی چیز ہوتی ہے۔ وہ اقتدار پاکر اور زیادہ جھک جاتے ہیں۔ وہ لوگوں کا استحصال کرنے کے بجائے لوگوں کے لئے نافع بنتے ہیں۔ وہ حکومت کی طاقت کو ذاتی مفادات کی تکمیل میں نہیں لگاتے بلکہ ان اصولوں کے قائم کرنے میں لگاتے ہیں جو اللہ نے تعلیم فرمایا ہے۔ ان کے سامنے جب کوئی معاملہ آتا ہے تو وہ خواہشوں اور مصلحتوں کے تحت اس کا فیصلہ نہیں کرتے۔ بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ انصاف کا تقاضا کیا ہے اور جو انصاف کا تقاضا ہو اس کے مطابق اپنا فیصلہ دے دیتے ہیں۔

اسلام میں یہ مطلوب ہے کہ ماحول کے اندر اس کا غلبہ قائم رہے۔ عمومی طور پر ایسی ذہنی فضا بن جائے کہ دین اور خدا کی بات ہلکی بات نہ رہے بلکہ وہ لوگوں کو بھاری بھرکم بات نظر آئے۔

ذہنی غلبہ کی یہ فضا اسلام دو طریقوں سے حاصل کرتا ہے۔ ایک سیاسی قوت۔ دوسرے، عقلی استدلال۔ اگر کسی علاقے میں اسلام کا سیاسی اقتدار قائم ہو جائے تو خواہ حکومت مذہبی معاملات میں غیر جانب داری کیوں نہ ہو، اسلام کے حق میں ذہنی غلبہ کی ایک فضا خود بخود قائم ہو جاتی ہے۔ ہندستان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آٹھ نو سو برس کی حکومت کے باوجود یہاں کے مسلم حکمرانوں نے کبھی اشاعت دین کی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ اس غلطی کے لئے میں انھیں معذور قرار دینے کا وکیل نہیں بن سکتا۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ مسلم اقتدار نے عمومی غلبہ کی جو فضا پیدا کی، وہ تبلیغ دین کی غیر سرکاری کوششوں میں مددگار ثابت ہوئی۔ جب اس علاقے کو خراسان اور ماوراء النہر کے سیاسی حوصلہ مندوں نے فتح کیا تو اسی کے ساتھ بخارا، بلخ، سمرقند خوارزم، عراق اور ایران کے علماء قطار در قطار یہاں آنا شروع ہوئے۔ ابتداءً ملتان اور لاہور کے علاقے ان کا مرکز بنے۔ اس کے بعد جب ۶۰۷ھ میں سلطان شمس الدین التمش نے دہلی کو دارالسلطنت بنایا تو ہر طرف سے علماء سمٹ سمٹ کر دہلی میں جمع ہونے لگے۔ اس طرح حکومت کے براہ راست تعاون کے بغیر، مگر اسلام کے سیاسی غلبہ کی عمومی فضا میں، تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کے وہ سارے کارنامے انجام پائے جن کا نتیجہ آج ہم اس برصغیر میں ۲۰ کروڑ مسلمانوں کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔

ذہنی غلبہ کی اس فضا کے لئے سیاسی غلبہ ناگزیر نہیں، وہ عقلی استدلال کے ذریعہ بھی پیدا ہوتی ہے حتیٰ کہ عقلی بنیادوں پر بنی ذہنی فضا اتنی وسیع اور قوی شکل اختیار کر سکتی ہے کہ سیاسی غلبہ سے پیدا ہونے والی فضا پر بھی بھاری ثابت ہو۔ یہاں مثال کے طور پر مغربی قوموں کی موجودہ سائنس کا نام لیا جا سکتا ہے مغربی قوموں کا سیاسی اقتدار آج ایشیا اور افریقہ سے تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ مگر مغربی قوموں نے دماغی علوم میں جو برتری حاصل کی ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ آج بھی آزاد شدہ ممالک پر ان کا مکمل ذہنی غلبہ قائم ہے۔ کسی چیز یا کسی نظریے کا "فارن" ہونا اس کی بہتری کا ایسا ثبوت ہے جو بلا بحث تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ بن گیا ہے کہ جو چیز مغرب سے آئے وہ ضرور معیاری ہوگی۔ حالاں کہ صرف چند سو برس پہلے مغربی سائنس کی یہ حیثیت نہیں تھی۔ کیمسٹری، قدیم طرز کے کیمیا دانوں کے ہاتھ میں تانبے پیتل کو سونا بنانے کا ایک خبط تھا اور فلکیات پرانے نجومیوں کے ہاں لوگوں کو مستقبل کی بات بتا کر ان کو لوٹنے کی ایک بدنام تدبیر تھی۔

ذہنی مرعوبیت اور تصوراتی غلبہ کی یہ فضا جب کسی تحریک کے حق میں پیدا ہو جائے تو بہت سی مصنوعی اور غیر ضروری رکاوٹیں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں اور تحریک کی توسیع و ترقی کا کام ایک موافق فضا میں ہونے لگتا ہے۔ ذہنی غلبہ کی فضا کی مثال پختہ سڑک کی ہے۔ اگر آپ اپنی گاڑی ناہموار بیابان میں چلا رہے ہوں تو طرح طرح کی زحمتیں پیش آتی ہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ کو ایک بنی بنائی پختہ سڑک مل جائے تو سفر نہایت تیزی

اور آسانی سے ہونے لگے گا۔

علم کلام کا ایک کام اسی قسم کی ذہنی فضا پیدا کرنا ہے ـــــ علوم کا ایسا مطالعہ کہ وہ اسلامی عقائد کے مؤید نظر آنے لگیں۔ تاریخ کی ایسی نقشہ کشی جس میں اسلام اپنی واقعی جگہ پالے۔ حقائق کائنات کی ایسی تعبیر جس سے اسلام کی تصدیق و تصویب ہو۔ اسلامی صداقتوں کا ایسے انداز اور ایسے دلائل کے ساتھ اظہار جو وقت کے ذہن پر عظیم سوالیہ نشان بن کر مسلط ہو جائے۔ غرض برتر علمی تدوین اور اعلیٰ استدلال کے ذریعہ لوگوں کے طرز فکر پر اس طرح چھا جانا کہ ان کی عقل کو نظر آنے لگے کہ اسلام کے سوا کوئی چیز حقیقت کے خانے میں بیٹھ ہی نہیں رہی ہے۔ جہاں اسلام کا احترام دلوں میں جگہ پا چکا ہو وہاں دعوت اسلام کا کام بہت آسان ہو جاتا ہے اور یہ ایک طاقتور علم کلام کا نہایت اہم فائدہ ہے۔

واضح ہو کہ "اقامت دین" اور "غلبۂ دین" دونوں ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ اقامت دین کا تعلق تمام تر فرد سے ہے۔ دین کو قائم کرو (شوریٰ) کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایک شخص کو جس دین کا حامل بننا ہے اس کا وہ حامل بنے۔ ہر آدمی اپنی زندگی کو دینی زندگی بنائے۔ اللہ سے ڈرنا، اللہ سے محبت کرنا، اللہ کا پرستار بن جانا، روز و شب کی زندگی میں اللہ کو یاد کرتے ہوئے معاملہ کرنا۔ اپنے تمام معاملات کو آخرت کی بنیادوں پر قائم کرنا۔ یہی ہر فرد کا دین ہے اور اس دین پر اپنی انفرادی زندگی میں پوری طرح قائم ہو جانے کا نام اقامت دین ہے۔

غلبہ دین سے مراد ہے کسی ماحول میں اسلام کی سیاسی یا غیر سیاسی بالاتری قائم ہو جانا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں مصر میں اہل اسلام کی سیاسی برتری قائم ہو گئی تھی۔ مگر ملک کا قانون اس کے باوجود وہی تھا جو مشرک بادشاہ کے زمانہ سے چلا آرہا تھا۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حبش میں نہ سیاسی اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اور نہ وہاں کا قانون اسلام کا قانون تھا۔ مگر مسلمانوں کی نظریاتی اور اخلاقی برتری نے مسلمانوں کو وہاں یہ مقام دے دیا تھا کہ وہ عزت کے ساتھ وہاں رہیں اور آزادی کے ساتھ اپنے دین کی تبلیغ کریں۔ یہ چیز اتنی کافی سمجھی گئی کہ مسلمانوں نے حبش کے علاقہ میں کبھی فوج کشی نہ کی۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں مسلمانوں کے زیر اقتدار علاقہ میں یہ غلبہ مسلمانوں کو اپنی کامل صورت میں حاصل رہا۔

اقامت دین اور غلبہ دین کو اگر ہم معنی قرار دیا جائے تو اس سے زبردست خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک طرف یہ کہ اقیموا الدین کے حکم سے اصلاح خویش کا جو جذبہ بھڑکنا چاہیے وہ نہیں بھڑکتا۔ کیونکہ اب اس حکم کا رخ اپنے بجائے دوسروں کی طرف ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف یہ کہ مسلم ملکوں میں جہاں اسلام کے حق میں غلبہ کی فضا موجود ہے اس کو استعمال کرکے اسلام کے لئے تعمیری اور دعوتی کام کرنے کا شوق نہیں ابھرتا بلکہ سارا زور اس پر صرف ہونے لگتا ہے کہ مسلم حکمرانوں کو تخت سے بے دخل کر دو کیونکہ وہ اسلام کے اجتماعی قانون کے نفاذ کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بڑی بڑی کوششیں اس طرح ضائع ہو جاتی ہیں کہ ان سے نہ اقامت دین کا فائدہ حاصل ہوتا ہے اور نہ غلبۂ دین کا۔

دعوتی عمل

" اس جزیرہ میں تو صرف مگر مچھ اور سانپ اور کھنکھجورے ہیں " مسیحی سیاح نے اپنی سیاحت سے واپس آکر مسیحی مشنری کو رپورٹ دی۔

" خیر انھیں ہونے دو، یہ بتاؤ کہ کیا وہاں کچھ انسان بھی ہیں "

" ہاں، ہیں کیوں نہیں۔ مگر ایسے وحشی اور خونخوار ہیں کہ ان کے درمیان قدم رکھنے کا تو خیال بھی نہ کیجئے "

" بس معلوم ہوگیا۔ اتنی اطلاع کافی ہے۔ انسان جہاں کہیں بھی آباد ہیں، مشنری کا وہاں پہونچنا ضروری ہے "

یہ خلاصہ ہے اس گفتگو کا جو ایک مسیحی سیاح اور لندن مشنری سوسائٹی کے ایک ذمہ دار کے درمیان ۱۸۷۱ میں جزیرہ نیوگنی کے جنوبی ساحل پر ہوئی۔ اس کے بعد جزیرہ میں مشنری کا کام شروع ہوگیا۔ اور اب اس گفتگو کے سو برس بعد جزیرہ نہ صرف مہذب ہوچکا ہے بلکہ اس کی بیشتر آبادی عیسائی ہے۔ دو ہزار برس پہلے مسیحؑ اس دنیا سے گئے تو ان کے پیچھے صرف ایک درجن عیسائی تھے۔ مگر مسلسل تبلیغ کے نتیجہ میں آج عیسائیوں کی تعداد تمام مذاہب میں سب سے زیادہ ہے۔ عیسائیوں کے تبلیغی ادارے اتنے منظم ہیں اور اتنے وسیع پیمانہ پر کام کر رہے ہیں جس کی کوئی دوسری مثال ساری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اس کے برعکس مسلمانوں پر ان کے پیغمبر نے یہ ذمہ داری ڈالی تھی کہ وہ قیامت تک ساری قوموں تک اسلام کا پیغام پہونچاتے رہیں۔ مگر پیغمبر اسلام کے ابتدائی پیرووں کے بعد یہ کام تقریباً بند ہوگیا۔ بلاشبہ اسلام بعد کی صدیوں میں بھی پھیلتا رہا ہے۔ مگر وہ زیادہ تر خود اپنے زور پر پھیلا ہے۔ ورنہ مسلمانوں کا محبوب ترین مشغلہ جس میں وہ موجودہ سائنٹفک دور میں بھی انتہائی انہماک کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، وہ جنگ و جدل اور سیاسی معرکہ آرائی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور چیز انھیں کام ہی نظر نہیں آتی جس میں وہ اپنے آپ کو مشغول کریں۔ اس عموم میں بعض استثناء ضرور ہے۔ مگر وہ استثناء اصاغر کا ہے نہ کہ اکابر کا۔

دعوتی عمل کی اہمیت صرف اس اعتبار سے نہیں ہے کہ وہ اسلام کی توسیع اور اشاعت کا ذریعہ ہے۔ اس کی اہمیت خود موجودہ مسلمانوں کے اعتبار سے بھی بہت زیادہ ہے۔

گڑھے کے پانی میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے مگر دریا کے پانی میں کبھی بدبو پیدا نہیں ہوتی۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ گڑھے کا پانی ٹھہرا ہوا ہوتا ہے۔ گڑھے کا پانی ہمیشہ وہی پانی رہتا ہے۔ اس میں نیا پانی داخل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس دریا کا پانی جاری پانی ہے اس میں ہر وقت نیا پانی آتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گڑھے کے پانی میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے اور دریا کے پانی میں بدبو پیدا نہیں ہوتی۔ ایسا ہی کچھ معاملہ قوموں کا بھی ہے۔ قومیں اسی وقت تک زندہ رہتی ہیں جب تک ان میں نیا خون داخل ہوتا رہے۔ جس قوم میں نیا خون داخل ہونا بند ہو جائے وہ بند گڑھے کی طرح بے جان ہو کر رہ جائے گی۔

اسلام کی تاریخ اس اصول کی تصدیق کرتی ہے۔ اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر بنو امیہ کے زمانہ تک اس کو زبردست عروج حاصل رہا۔ اس کے بعد بنو عباس کے دور کے نصف آخر میں زوال شروع ہو گیا۔ عروج کی تاریخ پستی کی تاریخ میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے بعد اسلام کو دوبارہ عروج اس وقت ہوا جب کہ ترک اقوام بڑی تعداد میں اسلام میں داخل ہو گئیں۔ ترکوں کے ذریعہ اسلام کو دوبارہ عروج حاصل ہوا جو کئی سو سال تک جاری رہا۔ اسلام کے جسم میں نئے خون نے داخل ہو کر اسلام کو نئی زندگی دیدی۔

انیسویں صدی میں مغربی طاقتیں ابھریں۔ انھوں نے مغلوں اور ترکوں کو مغلوب کر کے تقریباً ساری دنیا میں اپنا غلبہ قائم کر لیا۔ اسلام کی تاریخ دوبارہ تنزل کا شکار ہو گئی جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اسلام کے جسم کو دوبارہ نئے خون کا انتظار ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر سے لے کر بیسویں صدی کے نصف اول تک کا زمانہ اسلامی تحریکوں کا زمانہ ہے۔ اس سو سالہ مدت میں بے شمار تحریکیں اٹھیں۔ ان تحریکوں کے سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ انھیں غیر معمولی پھیلاؤ حاصل ہوا۔ وہ مجموعی طور پر تقریباً تمام مسلمانوں کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کرنے میں کامیاب ہو گیے۔ مگر عظیم الشان ہنگاموں کے

باوجود ان کے لیے یہ ممکن نہ ہوا کہ وہ اسلام کی تاریخ کو دوبارہ عروج کی طرف لے جانے میں کامیاب ہوسکیں۔

ان تحریکوں کی عظیم الشان کامیابیوں کے درمیان عظیم الشان ناکامی کا سبب صرف ایک تھا۔ وہ یہ کہ تمام کی تمام تحریکیں صرف مسلمانوں میں کام کرتی رہیں۔ ان میں کوئی بھی قابلِ ذکر تحریک نہیں ہے جس کی جدوجہد کا نشانہ غیر مسلموں میں اسلام کا پیغام پہونچانا ہو۔ سب کے سب "پرانے خون" پر محنت کرتے رہے۔ "نئے خون" کے لیے ان میں سے کوئی متحرک نہ ہوسکا۔

یہی ان تحریکوں کی ناکامی کا اصل سبب ہے۔ اسلام کی تاریخ کو دوبارہ عروج کی طرف لے جانے کے لیے "نئے خون" کی ضرورت تھی۔ مگر موجودہ دور میں ہماری تمام تحریکیں صرف "پرانے خون" پر اپنی طاقت صرف کرتی رہیں۔ اس کا نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوا۔ ایک سو سال سے بھی زیادہ عرصہ کی بے شمار کوششیں ضائع ہوکر رہ گئیں۔ اور اسلام کی تاریخ دوبارہ نہ بنائی جاسکی۔ بے جان افراد کے ذریعہ جاندار قوم کی تعمیر ممکن نہیں۔

بنوامیہ کے بعد اسلامی تاریخ پر جو زوال آیا اس کو دوبارہ عروج نئے خون کے ذریعہ ملا۔ اب موجودہ زمانہ میں اسلام کی تاریخ جس زوال سے دوچار ہے اس کو دوبارہ عروج کی طرف لے جانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ اسلام کی صفوں میں نئے خون کو داخل کیا جائے۔ یہی پہلے بھی اس مسئلہ کا حل تھا اور یہی آج بھی اس مسئلہ کا حل ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا طریقہ نہیں جس کے ذریعہ سے دورِ جدید میں دوبارہ اسلام کی نئی تاریخ بنائی جاسکے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:

وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لایکونوا امثالکم (محمد۔ آخر)	اور اگر تم پھر جاؤ تو اللہ تمہاری جگہ دوسروں کو لائے گا، پھر وہ تمہاری طرح نہ ہوں گے۔

دین ایک ابدی حقیقت ہے۔ البتہ دین کے حاملین بدلتے رہتے ہیں اور تبدیلی کا یہ عمل ہی سب سے بڑی ضمانت ہے کہ حاملین دین کے اندر مطلوبہ کردار باقی رہے۔

موجودہ مسلمان

امریکہ میں یہودی ظاہری سطح پر نہایت کامیاب ہیں۔ مگر اندرونی سطح پر وہاں کے باشندوں میں ان کے خلاف بیزاری پائی جاتی ہے۔ حتی کہ کچھ لوگوں کا اندازہ ہے کہ آئندہ امریکہ میں یہودیوں کے ساتھ وہی مخالفانہ صورت حال پیش آسکتی ہے جو دوسری عالمی جنگ سے پہلے جرمنی میں ان کے ساتھ پیش آئی تھی۔

ایک یہودی سے کہا گیا کہ کیا آپ لوگ اس کو پسند کریں گے کہ آپ کی آبادی کے تناسب سے امریکہ میں آپ کو ایک الگ خطہ دیدیا جائے جہاں آپ "یہودی لینڈ" بناسکیں۔ اس نے فوراً جواب دیا: ہرگز نہیں۔ اس طرح تو ہم ایک خول میں بند ہو جائیں گے۔ ہمارا کام تجارت کرنا ہے۔ آج ہم پورے امریکہ میں آزادانہ تجارت کر رہے ہیں۔ ہم کیسے پسند کرسکتے ہیں کہ ایک وسیع براعظم کو چھوڑ کر صرف ایک چھوٹی سی شہری ریاست میں سمٹ جائیں۔ تاجر کا کوئی ملک نہیں ہوتا:

The merchant has no country. (Thomas Jefferson)

یہ یہودیوں کی سوچ ہے۔ اس کے مقابلہ میں موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھئے۔ ساری دنیا میں جہاں کہیں بھی ان کی کچھ تعداد ہے، ہر جگہ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے لیے ایک الگ جزیرہ بناسکیں۔ ہر جگہ وہ "آزادی" کی تحریک چلا رہے ہیں تاکہ وہ اپنے لیے ایک ہوم لینڈ حاصل کرلیں۔ یہودی توسیع کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے ہیں اور مسلمان محدودیت کو۔

علامہ اقبال (۱۹۳۸ - ۱۸۷۷) نے اپنے اشعار کے ذریعہ مسلمانوں کے درمیان بہت زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ انھوں نے پُرفخر طور پر یہ شعر کہا:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اقبال کے اس شعر پر (اور اسی طرح کے دوسرے اشعار پر) ان کے لیے ہر طرف واہ وا، کیا خوب، کی صدائیں گونج اٹھیں۔ اکبر الٰہ آبادی (۱۹۲۱-۱۸۴۶) نے ان کو داد دیتے ہوئے کہا:

رقبہ کو کم سمجھ کر اقبال بول اٹھے ہندوستان کیا سارا جہاں ہمارا

تاہم یہ سب لفظی خیال آرائی کی باتیں تھیں۔ حقیقی عملی سطح پر معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ ۱۹۳۰ میں الٰہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ اقبال کو اس کا صدر بنایا گیا۔ اقبال لاہور سے آکر اس جلسہ میں شریک ہوئے۔ انھوں نے اس موقع پر ایک انگریزی خطبہ صدارت پڑھا۔ اس خطبہ میں ہندستان کے مسلمانوں کے مسئلہ کا حل یہ پیش کیا گیا تھا کہ ملک کے مغربی حصہ میں زمین کے ایک ٹکڑے کو الگ کرکے وہاں علحدہ مسلم اسٹیٹ بنا دیا جائے۔ یہی تخیل ہے جس نے ۱۹۴۷ میں پاکستان کی صورت اختیار کی۔

شاعرانہ لفاظی میں اقبال ساری دنیا کو اپنا وطن بتا رہے تھے اور عمل کی سطح پر وہ اس پر راضی ہو گئے کہ انھیں ایک ملک کے کنارے ایک چھوٹا سا رقبہ بانٹ کر دیدیا جائے۔

"تقسیم" یا سمٹاؤ کا یہ ذہن موجودہ زمانہ میں تمام دنیا کے مسلمانوں پر چھایا ہوا ہے۔ جہاں بھی مسلمانوں کی کچھ تعداد ہے، وہاں وہ اس بات کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں کہ بقیہ ملک سے کاٹ کر انھیں ایک "آزاد مسلم لینڈ" دیدیا جائے ——— برما، فلپائن، اریٹیریا، لبنان، لنکا، بلغاریہ، کشمیر، آذربیجان وغیرہ۔

یہودیوں اور مسلمانوں میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودیوں کے سامنے ایک مقصد ہے۔ جب کہ مسلمانوں کے سامنے کوئی مقصد نہیں۔ یہودیوں نے تجارت کو اپنا مقصد بنا رکھا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جتنا بڑا ملک ہوگا، اتنی ہی زیادہ بڑی تجارت کے مواقع انھیں حاصل رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ سمٹاؤ کے بجائے پھیلاؤ کے ذہن سے سوچتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے سامنے کوئی بڑا مقصد نہیں۔ یہودیوں کی طرح تجارت کو وہ اپنا قومی مقصد نہ بنا سکے۔ اور خدا اور رسول نے ان کو جس مقصد کی طرف رہنمائی کی تھی، اس کو بھی انھوں نے کھو دیا۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کا مقصد صرف ایک تھا، اور وہ دعوت الی اللہ ہے۔ مگر دعوت الی اللہ کا مسلمانوں میں کوئی وجود نہیں۔ نہ صرف ان کے اصاغر بلکہ ان کے تمام اکابر بھی اس کو مکمل طور پر بھولے ہوئے ہیں۔ اس معاملہ میں ان کی غفلت یہاں تک پہونچی ہے کہ وہ دوسرے دوسرے کام کرتے ہیں اور بالکل غلط طور پر اس کو "دعوت" کا نام دیدیتے ہیں۔

گویا دعوتی کام کرنا تو درکنار، وہ شعوری طور پر جانتے بھی نہیں کہ وہ کیا چیز ہے جس کو دعوت کہا جاتا ہے۔

دعوت ایک عظیم ترین عالمی مقصد ہے۔ اگر مسلمانوں میں دعوت کا ذہن بیدار ہوتا تو وہ ہمیشہ پھیلاؤ کی بات سوچتے۔ وہ چاہتے کہ زمین کی تمام حد بندیاں ٹوٹ جائیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ دعوت الی اللہ کا کام کرسکیں۔ مگر جب انھوں نے دعوت کو بھلا دیا تو وہ ہر جگہ پناہ گاہیں تلاش کرنے لگے جہاں سمٹ کر وہ اپنے آپ کو بچا سکیں۔

بے مقصد انسان تقسیم چاہتا ہے، بامقصد انسان انضمام کا طالب ہوتا ہے۔ بے مقصد انسان تحفظ کی طرف دوڑتا ہے، بامقصد انسان توسیع اور اقدام کو اپنا نشانہ بناتا ہے۔ بے مقصد انسان سمٹاؤ میں پناہ لیتا ہے، بامقصد انسان پھیلاؤ میں اپنے حوصلوں کی تکمیل ڈھونڈتا ہے۔

آہ وہ مسلمان، جنھوں نے خدا اور رسول کو کھو کر اپنی دنیا بھی کھو دی اور اپنا دین بھی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان آج ہر جگہ مقامی اقتدار کے طالب ہیں، عالمی اشاعتِ اسلام کا ان کے اندر حوصلہ نہیں۔ وہ مادی مواقع کے طالب ہیں، دعوتی مواقع کے لیے ان کے اندر کوئی تڑپ نہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ان کی تمام سرگرمیوں کو بے فائدہ بنا دیا ہے۔

قومی اقتدار اور مادی مفاد کی جدوجہد مسلمانوں کو دوسری قوموں کا حریف بنا دیتی ہے۔ اس کے برعکس مواقع دعوت کی طلب مسلمانوں کے اندر دوسری قوموں کے لیے خیر خواہی کا مزاج پیدا کرتی ہے۔ قومی انداز فکر محدودیت کی طرف لے جاتا ہے اور دعوتی انداز فکر آدمی کی نظر کو لامحدود بنا تا ہے۔

انھیں دو باتوں میں مسلمانوں کے حال اور مستقبل کی پوری کہانی چھپی ہوئی ہے۔

اصل مسئلہ

فلسطینی تحریک انتفاضہ (uprising) کے بارہ میں بہت سی کتابیں چھپی ہیں۔ ان میں سے ایک ۱۲۵ صفحہ کی وہ عربی کتاب ہے جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے:

على طريق الانتفاضة المباركة، بقلم منير محمد سعيد، دار النفائس، الكويت، ١٤١٠ھ

اس کتاب کے ایک باب میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک مسلم عورت مدینہ کے ایک یہودی بازار میں تھی۔ ایک یہودی نے اس کی عزت پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ عورت نے فریاد کرتے ہوئے کہا: وا اسلاماه (ہائے اسلام) قریب کے ایک مسلمان نے اس کو سنا اور فوراً ہی تلوار لے کر یہودی کی گردن ماردی۔

اسی طرح عموریہ میں ایک مسلم عورت کو رومیوں نے گرفتار کر لیا۔ اس نے فریاد کرتے ہوئے کہا: وامعتصماه (ہائے معتصم) ایک مسلمان نے اس پکار کو سنا اور اس کو بغداد کے خلیفہ معتصم تک پہونچایا۔ خلیفہ معتصم فوراً فوج لے کر روانہ ہوا اور عموریہ پہونچ کر مسلم خاتون کو رہائی دلائی۔ تاریخ اسلامی کے ان دو واقعات کو نقل کرنے کے بعد صاحب کتاب لکھتے ہیں:

كم انطلقت صيحات الاستغاثة والاستنجاد من افواه الثكالى واليتامى والشيوخ والاطفال في فلسطين وفي مخيمات لبنان وفي شتى بلاد المسلمين دون ان تلقى من المسلمين استجابة۔ لم يتحرك في الامة قائد ولا زعيم ولا فريق ولا عميد لنجدة هؤلاء المستغيثين وكأن المسلمين في ارجاء الارض لا يعنيهم امر اخوانهم (صفحہ ٦٠ - ٦١)

کتنی ہی بار فلسطین میں اور لبنان کے خیمہ گاہوں میں اور مختلف ملکوں میں بیواؤں اور یتیموں اور بوڑھوں اور بچوں کے منھ سے فریاد اور اعانت طلبی کی پکار بلند ہوئی۔ مگر مسلمانوں کی طرف سے انھیں کوئی جواب نہیں ملا۔ امت میں کوئی رہنما اور کوئی لیڈر اور کوئی جماعت اور کوئی حاکم ان کی مدد کے لیے حرکت میں نہیں آیا۔ گویا کہ روئے زمین کے مسلمانوں کے لیے ان کے بھائیوں کا معاملہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

صاحب کتاب کے یہ آخری الفاظ بالکل خلاف واقعہ ہیں۔ حقیقت عین اس کے برعکس

ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ فلسطین میں اور دوسرے ملکوں میں مظلوم مسلمانوں (عورتوں اور مردوں) کی پکار پر بے شمار لوگ اٹھے۔ ۱۹۴۸ میں حسن البنا مسلمانوں کی بہت بڑی جمعیت کے ساتھ اٹھے اور لبیک یا فلسطین کا نعرہ لگاتے ہوئے یہودیوں کے خلاف جہاد کیا۔ ۱۹۶۵ میں جمال عبدالناصر نے حکومت کی پوری طاقت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔ مگر یہ ساری کوششیں غیر موثر ثابت ہوئیں۔ اسی طرح ساری دنیا میں لاکھوں مسلمانوں نے اپنے مظلوم بھائیوں کی حمایت میں جہاد کیا اور اسی راہ میں اپنی جانیں دیدیں۔

مدینہ میں یا عموریہ میں مظلوم خاتون کی مدد کے لیے جو قربانی دی گئی، وہ مقدار کے اعتبار سے اس سے بہت کم ہے جو موجودہ زمانہ میں اس قسم کے مظلوم عورتوں اور مردوں کے لیے دی گئی ہے۔ مگر نتیجہ بالکل مختلف ہے۔ مدینہ میں اور عموریہ میں نسبتاً کم قربانی سے جو مقصد حاصل کر لیا گیا تھا، وہ موجودہ زمانہ میں زیادہ قربانی کے باوجود حاصل نہ کیا جا سکا۔

اس کی وجہ نہایت سادہ ہے ——— مدینہ اور عموریہ کا اقدام ضروری تیاری کے بعد کیا گیا تھا، جب کہ موجودہ زمانہ کے اقدامات ضروری تیاری کے بغیر کیے جاتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ دور اول کے مسلمانوں کو اپنے اقدام میں مکمل کامیابی ہوئی، اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو اپنے اقدام میں مطلق کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

صاحب کتاب اور اس قسم کے دوسرے مسلمانوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ اپنی سوچ کا آغاز "مدینہ" اور "عموریہ" سے کر رہے ہیں۔ حالاں کہ یہ صحیح نہیں۔ انھیں اپنی سوچ کا آغاز "مکہ" سے کرنا چاہیے۔ "مدینہ" اور "عموریہ" تو تاریخ کا اختتام تھا، وہ تاریخ کا آغاز نہ تھا۔ تاریخ کا آغاز تو مکہ سے ہوا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے زوال کی بنا پر تاریخ دوبارہ پیچھے طرف لوٹ گئی ہے۔ آج ہم اپنی تاریخ کے آغاز میں ہیں، ہم اپنی تاریخ کے اختتام میں نہیں ہیں۔ موجودہ مسلم رہنما اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ اس لیے وہ ایسے اقدامات کرتے رہے جس کا نتیجہ ناکامی کے سوا کسی اور صورت میں نکلنے والا نہ تھا۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ہمیں پیچھے لوٹ کر مکہ کے ابتدائی دور میں جانا ہوگا۔ اس اعتبار سے جب ہم مکہ کے حالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہاں ہم کو "مدینہ" اور "عمورہ" سے بالکل

مختلف تصویر نظر آتی ہے ۔ مثلاً ابن اسحاق کہتے ہیں کہ بنو مخزوم کے قبیلہ کے لوگ عمار بن یاسرؓ کو اور ان کے باپ اور ماں کو لے کر مکہ کے باہر نکلتے ۔ اور وہ سب کے سب اسلام قبول کر چکے تھے ۔ دوپہر کے وقت جب گرمی خوب تیز ہو جاتی تو وہ ان مسلمانوں کو مکہ کی گرم زمین پر لٹا کر تکلیف دیتے ۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرتے اور وہ لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے فریاد کرتے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان سے کہتے :

صبراً آلَ یاسر فانِ موعدکم الجنۃ   آلِ یاسر صبر کرو ، تمہاری وعدہ گاہ جنت ہے ۔
یاسرؓ کی ماں کو اسی طرح عذاب دے کر انھوں نے مار ڈالا ۔ مگر وہ کسی حال میں اسلام کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوئیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ مدینہ اور عمورہ کے واقعہ کو اس وقت تک سمجھا نہیں جا سکتا جب تک مکہ کے مذکورہ واقعہ کو اس سے ملا کر نہ دیکھا جائے ۔ کیا وجہ ہے کہ مدینہ میں جس قسم کے واقعہ پر اقدام کیا گیا ۔ مکہ میں اسی قسم کے شدید تر واقعہ پر کوئی اقدام نہیں کیا گیا ۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مکہ کا زمانہ تیاری اور استحکام کا زمانہ تھا ۔ تیاری اور استحکام کے زمانہ میں اقدام غیر موثر ہوتا ۔ اس لیے مکہ میں صبر کیا گیا ۔ صبر دراصل تیاری اور استحکام کی قیمت ہے ۔ جو لوگ ابتدائی مرحلہ میں صبر نہ کریں وہ بعد کے مرحلہ میں تیاری اور استحکام کے درجہ کو بھی نہیں پہونچ سکتے ۔

"مکہ" میں ناقابل برداشت کو برداشت کیا جاتا ہے ، اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ "مدینہ" میں ناقابل برداشت کو برداشت کرنے کی حاجت نہ رہے ۔ جو لوگ مرحلۂ تیاری والی قربانی نہ دے سکیں وہ مرحلۂ استحکام والی منزل کو بھی نہیں پہونچ سکتے ۔

یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہے ۔ صدیوں کے عمل کے نتیجہ میں مسلمان دوبارہ اپنی تاریخ کے آغاز میں پہونچ گیے تھے ۔ اب ضرورت تھی کہ دوبارہ ان کے درمیان تیاری کا وہی عمل جاری کیا جائے جو مکہ میں جاری کیا گیا تھا ۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما اس راز کو سمجھ نہ سکے ۔ انھوں نے اپنے آپ کو تاریخ کے اختتام والے مرحلہ میں فرض کر کے عملی اقدامات شروع کر دیے ۔ ایسے ناکافی اقدامات پیغمبر اور اصحاب پیغمبر کے لیے بھی مفید نہ ہو سکتے تھے ، پھر وہ موجودہ مسلمانوں کے لیے کیوں کر مفید ہوتے ۔ یہی وجہ ہے جس نے ان کے عملی اقدامات کو بے فائدہ اور غیر موثر بنا دیا ۔

ایک جائزہ

ظہیرالدین محمد بابر (۱۵۳۰-۱۴۸۳) نے ہندستان میں مغل سلطنت کی بنیاد رکھی۔ وہ ۱۵۱۹ میں برصغیر ہند میں داخل ہوا۔ مختلف لڑائیوں کے بعد آخرکار ۱۵۲۶ میں اس نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کرکے مغل سلطنت کا آغاز کیا۔ بابر کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں تخت پر بیٹھا۔

جلال الدین محمد اکبر (۱۶۰۵-۱۵۴۲) ہمایوں کا بیٹا تھا۔ ہمایوں کی وفات کے بعد ۱۵۵۶ میں وہ مغل تخت پر بیٹھا۔ اس وقت مغل سلطنت ایک غیر مستحکم سلطنت کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مغلوں کی حیثیت ایک بیرونی حملہ آور کی تھی اور اس بنا پر یہاں کے قدیم باشندوں میں ان کے خلاف ناراضگی پائی جاتی تھی۔ اس ناراضگی کو ختم کرنے کے لیے اکبر نے وہ تدبیر کی جو عام طور پر دین الٰہی کے نام سے مشہور ہے۔ دین الٰہی حقیقۃً کوئی دین نہ تھا، وہ ملک میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت کو ختم کرنے کی ایک تدبیر تھی۔ اپنے ظاہری بھونڈے پن کے باوجود یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ اکبر اس میں کامیاب ہوگیا کہ وہ اپنے سیاسی استحکام کے لیے ملک کی اکثریت کا تعاون حاصل کرسکے۔

اکبر نے یہ کام اگرچہ اپنے سیاسی مفاد کے لیے کیا تھا۔ مگر جب ملک میں ہندو مسلم نفرت ختم ہوئی تو اس کا فائدہ اسلام کو بھی پہونچنے لگا۔ لوگ کثیر تعداد میں اسلام قبول کرنے لگے۔ اکبر سے لے کر شاہجہاں تک لاکھوں کی تعداد میں مقامی باشندے اسلام میں داخل ہوئے۔ اس میں سب سے بڑا دخل اسی معتدل فضا کا تھا جو اکبر کی پالیسی کے ذریعہ پیدا ہوئی۔

اکبر کی نیت کے بارہ میں ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ تاہم اگر بالفرض وہ اتنا ہی برا ہو جتنا کہ کچھ لوگ اس کو سمجھتے ہیں، تب بھی ہمارے مذکورہ تجزیہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ اکبر کی میل ملاپ کی پالیسی کے نتیجہ میں ہندستان میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ نتیجہ کی حد تک یہ واقعہ بدستور مسلّم ہے۔ البتہ اگر وہ بالفرض ایک غلط آدمی رہا ہو تو اس کا معاملہ اس حدیث کے تحت شمار کیا جائے گا جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ:

ان اللّٰہ لیؤید ھذا الدین برجلٍ بے شک اللہ اس دین کی مدد فاجر آدمی کے ذریعہ

ناجب — بھی کرے گا۔

آخری مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر (۱۷۰۷ - ۱۶۱۸) کے زمانہ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات دوبارہ خراب ہو گئے۔ اورنگ زیب نے اپنی ناعاقبت اندیشانہ پالیسیوں سے راجپوت، مراٹھا اور سکھ، ہر اک کو اپنا مخالف بنالیا۔ حتیٰ کہ عام ہندو بھی اس کو ناپسند کرنے لگے۔ اس کے نتیجہ میں ازسرنو کشیدگی کا ماحول قائم ہو گیا۔ اسلام کے پھیلنے کا جو عمل اکبر کے بعد اپنے آپ جاری ہوا تھا، وہ رک گیا۔ ہندو مسلم منافرت کی بنا پر وہ معتدل ماحول ختم ہو گیا جو اسلام کی اشاعت کے لیے ضروری ہے۔

اورنگ زیب کے بعد مغل سلطنت زوال کا شکار ہو گئی۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد صوفیاء کو کھڑا کیا۔ سارے ملک میں صوفیاء اپنی خانقاہیں بنا کر بیٹھ گئے۔ ان کا خاص مقصد لوگوں کو محبت کا پیغام دینا تھا۔ صوفیاء کو اپنے اس مشن میں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ ہندو اور مسلمان دونوں بہت بڑی تعداد میں ان کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔ یہاں تک کہ صوفیاء ہی سماج کا وہ عنصر بن گئے جو سماج کے اوپر سب سے زیادہ اثر رکھتا تھا اور لوگوں کے مزاج کی تشکیل کرتا تھا۔

بابر کی پیدا کی ہوئی نفرت کو اکبر نے ختم کیا تھا، اورنگ زیب کی پیدا کی ہوئی نفرت کو صوفیاء نے ختم کیا۔ اس کے بعد دوبارہ وہ معتدل فضا قائم ہو گئی جو اسلام کی اشاعت کے لیے ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اورنگ زیب کے بعد اگرچہ مغل سلطنت پر زوال آگیا، مگر اسلام کی اشاعت تیزی سے جاری ہو گئی۔ اس دور میں دوبارہ لاکھوں لوگ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو گئے۔

اسلام کی اشاعت کا یہ عمل بیسویں صدی کے آغاز تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ مسٹر محمد علی جناح (۱۹۴۸ - ۱۸۷۶) کا ظہور ہوا۔ انھوں نے دو قومی نظریہ ایجاد کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندو مسلمانوں سے الگ ہیں اور مسلمان ہندوؤں سے الگ۔ یہ علحدگی اگر صرف اعتقادی معنوں میں ہوتی تو اس سے کوئی خاص خرابی نہ ہوتی۔ مگر انھوں نے اس علحدگی کو جغرافی مفہوم دیا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ دونوں گروہوں کے درمیان نفرت اور مقابلہ آرائی ایک مستقل سیاسی اصول بن گیا۔

دو قومی نظریہ حقیقتہً دو قوموں کے درمیان نفرت کے ہم معنی تھا۔ مخصوص اسباب کے تحت اس نظریہ کو مسلمانوں کے درمیان زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ پورے ملک میں دو قومی نفرت کی

ایک نئی فصل اُگ آئی۔ ہندو مسلم نفرت ہی دونوں فرقوں کا سب سے بڑا مذہب بن گیا۔ اس زہریلی سیاست کی تکمیل ۱۹۴۷ میں ہوئی جب کہ پاکستان کی صورت میں دونوں فرقوں کے درمیان نفرت کی ایک ایسی دیوار کھڑی ہوگئی جو دیوار برلن سے بھی زیادہ مضبوط تھی۔

بیسویں صدی کے وسط سے دوبارہ اس ملک میں اسلام کی اشاعت کا کام رک گیا ہے، اور اس کی سب سے بڑی وجہ مسٹر جناح کی وہ سیاست ہے جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور تلخی کی فضا پیدا کر دی۔ اب دوبارہ زمین و آسمان کو کسی ایسے دن کا انتظار ہے جب کہ داعی اور مدعو کے درمیان نفرت کا یہ ماحول ختم ہو اور اسلام کی اشاعت کا دروازہ دوبارہ کھل جائے جس طرح وہ اس سے پہلے کھلا ہوا تھا۔

اسلام دین فطرت ہے۔ وہ تحریف سے پاک ہے۔ لمبی تاریخ کے نتیجہ میں وہ ایک قائم شدہ دین بن چکا ہے۔ اسلام کی ان خصوصیات نے اب اس کے اندر یہ طاقت پیدا کر دی ہے کہ وہ اپنے آپ پھیلے۔ وہ خود اپنے زور پر انسانوں کے دلوں میں داخل ہو۔ خود بخود اشاعت کے اس عمل میں واحد رکاوٹ یہ ہے کہ اسلام اور اس کی مدعو قوموں کے درمیان نفرت اور تلخی کی فضا پیدا ہو جائے۔ اسلام کی اشاعت کے لیے اب مسلمانوں کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے کسی عمل سے ایسی غیر موافق فضا پیدا نہ ہونے دیں۔ اگر مسلمان صرف اتنا کر سکیں تو اسلام اپنے آپ لوگوں کے اندر نفوذ کرنے لگے گا۔ اس کے بعد اسلام کی توسیع واشاعت کے لیے کسی براہ راست جدوجہد کی ضرورت نہیں۔

تبلیغی جماعت کا اصل نشانہ اگرچہ مسلمانوں کی دینی اصلاح ہے۔ مگر اس کے ذریعہ سے منافرت کو ختم کرنے کا وہ کام بالواسطہ طور پر انجام پا رہا ہے جو اس سے پہلے صوفیار کے ذریعہ زیادہ بڑے پیمانہ پر انجام پایا تھا، اگر یہ عمل قابل لحاظ حد تک بڑھ جائے تو انشاءاللہ اشاعت اسلام کا رکا ہوا کام دوبارہ ملک میں جاری ہو جائے گا۔

ایک حقیقت

ایک "مولوی صاحب" بستی میں آئے اور لوگوں کے سامنے تقریر کی۔ انھوں نے پہلے یہ کیا کہ لوگوں کو نماز روزہ کی فرضیت کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے بعد اپنے مدرسہ کے لیے چندہ کی اپیل شروع کر دی۔ تقریر ختم ہوئی تو لوگ خاموشی سے اٹھ اٹھ کر چلے گیے۔ غالباً کوئی شخص بھی نہ تھا جس کے اندر یہ ارادہ جاگا ہو کہ آئندہ وہ نماز روزہ کی پابندی کرے گا اور رسول اللہ کی سنت کے مطابق زندگی گزارے گا۔

سامعین میں سے ایک شخص کسی قدر بے باک تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر کہا: مولوی صاحب، جب آپ کو مدرسہ کا چندہ ہی مانگنا تھا تو سیدھے سیدھے مانگا ہوتا۔ پھر آپ کو وعظ و تبلیغ کا ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی۔ مولوی صاحب نے اگرچہ قرآن وحدیث سنایا تھا اور نماز روزہ کے بارہ میں شریعت کا حکم بتایا تھا۔ مگر جب انھوں نے اسی کے ساتھ اس میں چندہ کا مطالبہ بھی شامل کر دیا تو سننے والے کی نظر میں ان کی تقریر صرف چندہ کا مطالبہ بن کر رہ گئی۔ نماز روزہ کی تبلیغ کی حیثیت سے ان کی تقریر کی اہمیت ختم ہو گئی۔ اپنے نزدیک انھوں نے نماز روزہ کی اپیل کی، مگر سننے والوں کے نزدیک وہ صرف چندہ کی اپیل تھی اور بس۔

آج اس طرح کے بے شمار سفیر ہمارے مدرسوں اور دار العلوموں کی طرف سے مقرر ہیں۔ وہ روزانہ بستیوں بستیوں میں جاتے ہیں اور وہاں لوگوں کے سامنے تقریریں کرتے ہیں۔ مگر ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ ان سفیر صاحبان کی تقریروں سے کسی شخص کے اندر بھی دینی انقلاب نہیں آیا۔ کسی کے اندر بھی نماز روزہ کی زندگی پیدا نہیں ہوئی۔

اس کے برعکس مثال تبلیغی جماعت کی ہے۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ تبلیغی جماعت کی کوششوں سے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لوگ نمازی بن گیے۔ اور بے دینی کو چھوڑ کر دینی زندگی گزارنے لگے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ مدرسوں کے سفیر ایک طرف دینی تقریر کرتے ہیں اور دوسری طرف چندہ کی اپیل کرتے ہیں۔ وہ دینے والے

بھی ہیں اور "مانگنے والے" بھی۔ جب کہ تبلیغی جماعت چندہ کی کوئی بات نہیں کرتی۔ وہ صرف دیتی ہے، وہ مانگتی نہیں۔

یہی فرق ہے جس کی بنا پر مدرسوں کے سفیر ناکام ہیں اور تبلیغ کے لوگ کامیاب۔ جب آپ کسی کے سامنے دینے والے اور مانگنے والے دونوں بن کر جائیں تو اس کو آپ صرف مانگنے والے نظر آئیں گے، دینے والے کی حیثیت سے آپ کی تصویر اس کی نظر میں اوجھل ہو جائے گی۔

تبلیغی جماعت نے جو طریقہ مسلمانوں کے سلسلہ میں اختیار کیا وہی طریقہ غیر مسلموں کے سلسلہ میں بھی لازمی طور پر ضروری ہے۔ اگر ہمیں غیر مسلموں کو "قرآن" دینا ہے تو اس سے پہلے ہمیں اپنی تمام مانگوں کو چھوڑنا ہوگا۔ آج ہمارے تمام لیڈر غیر مسلموں کے مقابلہ میں احتجاج اور حقوق طلبی کی مہم چلا رہے ہیں۔ خدا کے پیغمبر اپنی مخاطب قوموں سے کہتے تھے کہ لا اسئلکم علیہ من اجر (میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا) اس کے برعکس مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اسئلکم علیہ من اجر (میں اس پر تم سے اجر کا طالب ہوں) کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر کوئی مسلم رہنما یہ کرے کہ وہ ایک ہاتھ سے وزیر اعظم کو شکایات اور مطالبات کا میمورنڈم دے اور دوسرے ہاتھ سے قرآن کا ایک نسخہ بھی انھیں پیش کر دے تو یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک مذاق ہوگا نہ کہ خدا کی کتاب کو غیر مسلم حکمراں تک پہونچانا۔

اگر ہم واقعۃً دعوت کے معاملہ میں سنجیدہ ہوں تو ہم کو اول مرحلہ میں یہ جان لینا چاہیے کہ دوسری قوموں تک خدا کے دین کا پیغام پہونچانے کے لیے ہمیں خدائی اخلاقیات کی سطح پر آنا پڑے گا۔ یعنی یک طرفہ عمل کے ذریعہ انھیں خدا کے دین رحمت کا مخاطب بنانا، بغیر اس کے کہ کسی بھی معاملہ میں ہم ان کے خلاف احتجاج کر رہے ہوں، یا ان کے ساتھ حقوق طلبی کی مہم میں مشغول ہوں۔

یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ اس لیے یہ قدرتی بات ہے کہ اس دنیا میں ہمارے کچھ مادی اور تہذیبی مسائل ہوں۔ لیکن اگر ہمیں خدا کے یہاں داعی کا کریڈٹ لینا ہے تو ہمیں اپنے

مسائل کا ذمہ دار خود اپنے آپ کو قرار دینا ہوگا۔ ہمیں اپنے مسائل کو اپنی داخلی کوششوں کے ذریعہ حل کرنا ہوگا نہ یہ کہ ایک یا دوسری وجہ بتا کر ہم اپنی مدعو اقوام کے خلاف مطالباتی مہم شروع کر دیں۔

غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہونچانے کے لیے ہمیں ان کے مقابلہ میں وہی کرنا ہوگا جو مسلمانوں کے سلسلہ میں تبلیغی جماعت کر رہی ہے۔ یعنی یک طرفہ قربانی کے ذریعہ ان کے سامنے بالکل بے غرض بن جانا۔ اگر ہم اس ملک میں "مانگنے والے" بنے ہوئے ہوں تو عین اسی وقت ہم انھیں "دینے والے" نہیں بن سکتے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو غیر مسلموں کے لیے بھی اتنا ہی صحیح ہے جتنا مسلمانوں کے لیے۔

اصل یہ ہے کہ ہر چیز کی ایک قیمت ہے، اسی طرح داعی بننے کی بھی ایک قیمت ہے۔ مسلمان ابھی تک اس ملک میں داعی نہیں بنے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ابھی تک اس کی قیمت ادا نہیں کی۔ داعی بننے کی قیمت کیا ہے۔ وہ قیمت یہ ہے کہ آدمی مدعو کی نظر میں آخری حد تک بے غرض بن جائے، خواہ اس کے لیے اسے کتنی ہی بڑی قربانی دینی ہو اور اسے کچھ بھی برداشت کرنا پڑے۔ مدعو کی نظر میں اس کی ایک ہی تصویر ہو۔ اور وہ داعی کی تصویر ہو۔ مدعو کی نظر میں داعی کا مقام حاصل کرنے کے لیے وہ یک طرفہ طور پر مدعو سے اپنے تمام قومی اور مادی جھگڑے ختم کر دے۔

مدعو سے قومی نزاع کھڑی کرنا، مدعو سے مادی مطالبات کرنا، حتی کہ تہذیبی تشخص حاصل کرنے کے نام پر مدعو کے مقابلہ میں احتجاج کی مہم چلانا، یہ سب دعوتی مصالح کے سراسر خلاف ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو داعی اپنے داخلی عمل کے زور پر حاصل کر سکتا ہے۔ اور جس چیز کا حصول خود اپنے عمل کے ذریعہ ممکن ہو اس کے لیے مدعو سے احتجاج و مطالبہ کی مہم چلانا دعوتی شریعت میں جائز نہیں۔ ایسا ہر فعل دعوت کے امکانات کو ذبح کرنے کے ہم معنی ہے۔ جو لوگ ایسی سرگرمیوں میں مشغول ہوں وہ نہ اللہ کی نگاہ میں داعی قرار پا سکتے ہیں اور نہ بندوں کی نگاہ میں۔ خواہ اس کام کو وہ اسلام کے نام پر کر رہے ہوں۔ خواہ اس کام کے لیے انھوں نے خوب صورت دینی الفاظ تلاش کر لیے ہوں۔